

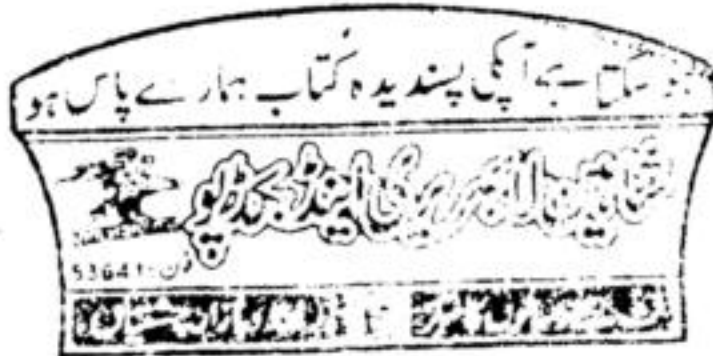
ناقابل تسخیر قوتوں کے مالک راجہ نواز اصغر کی تہلکہ خیز عبرتناک جدوجہد

خدا کی دیکھا سی

www.urdufanz.com

ایک اے راحت

10



Hassan Call Bind
Mills Road CHISHTIAN
Ph. 57155
NASIR

میکلارنس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی اور وہ دلچسپ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ساتھ ایڈلک خاموش کھڑا تھا۔

”در اصل میرے دوست! ان دنوں مجھے مل کی شدید ضرورت ہے۔ میری مالی حالت کسی قدر ہو گئی ہے۔ نہ جانے کیوں تقدیر میرا ساتھ نہیں دے رہی، مل بھی پکڑا گیا ہے۔ ایسے نازک وقت میں میری مدد کرنی ہی چاہیے۔“

”میں نے“ میں بتایا ہے میکلارنس کہ غلام سیٹھ کا کوئی ذخیرہ میری تحویل میں نہیں تھا۔ رہی بات کی بات تو وہ خود میرے پاس اتنی ہے کہ میری دس ہششیں عیش کر سکتی ہیں لیکن یقین کرو مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں نے اسے خیر یاد کیا ہے اور ایک آوارہ منش کی زندگی اختیار کر لی ہے۔“

”آہ کیا وہ دولت ہمارے کام نہیں آسکتی؟ اس وقت مجھے اس کی شدید ضرورت ہے۔“

میکلارنس نے مکاری سے کہا۔

”اور اسے حاصل کرنے کے لیے تم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”یہ اپنی اپنی علوت اور طریقہ کار ہے۔ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے۔ کوئی کام آسانی سے نہیں ہوتا۔ تم کو دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ میرا تم سے کیا واسطہ ہے کہ تم میری مالی مدد کر سکتے؟“

”واسطہ نکل سکتا تھا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”وہ کس طرح؟“

”تمہاری بیٹی۔“ میں نے کہا اور پہلی بار میکلارنس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”کیا بکواس ہے؟“ وہ غرایا۔

2000ء
ناشر: مبین خٹک
گل قریش پبلی کیشنز انیڈلا بیری
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
نام کتاب: نروان کی تلاش
تعداد: 600/- عدد
قیمت: 75/- روپے
قیمت سیٹ: 750/- روپے

اسٹاکسٹ

- | | | |
|---|---------------------|---|
| ☆ | خزینہ ادب | الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور فون نمبر 7314169 |
| ☆ | مکتبہ القریش | سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور |
| ☆ | مکتبہ تعمیر انسانیت | سعد اللہ صدیق غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون نمبر 7310530 |
| ☆ | علم و عرفان پبلشرز | 7-C، قمر مارکیٹ سٹریٹ لورن مال روڈ لاہور
فون نمبر 7352332 |
| ☆ | گوہر بک سینٹر | ولی مارکیٹ 40 اے اردو بازار (عقب تھانہ لورن مال) لاہور |
| ☆ | آصف بک سینٹر | (صابر اکیڈمی) چوک میو ہسپتال نسبت روڈ لاہور |
| ☆ | فاضل مقبل اینڈ سنز | اردو بازار لاہور |
| ☆ | آصف بک سینٹر | غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون نمبر 7231078 |

”تم اسے شکار کی حیثیت سے مجھے پیش کر سکتے تھے۔ ممکن ہے میں تمہاری اس خدمت سے متاثر ہو جاؤ۔“ میں نے کہا۔

میکلارنس آپے سے باہر ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ جھپٹا اور اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی۔ اس وقت صورت حال..... ایسی نہیں تھی کہ میکلارنس کی اس حرکت سے میں کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا لیکن بہر حال تھپڑ تو نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر میکلارنس کی کلائی ہاتھ ڈال دیا اور اس کی کلائی میری گرفت میں آگئی۔ میکلارنس نے ایک جھٹکے سے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ اسے اپنے قد و قامت پر ناز معلوم ہوتا تھا لیکن میرے جڑے بچنے ہوئے تھے اور کلائی میری گرفت فولادی تھی۔ میکلارنس پوری کوشش کے باوجود کلائی نہ چھڑا سکا۔

”میرا نام نواز ہے میکلارنس اور تمہاری اس مذموم حرکت کے باوجود ابھی میرے دل میں تمہارے خلاف نفرت نہیں جاگی۔ اس لیے.....“ میں نے اسے زور سے جھٹکا دیا اور وہ گرتے گرتے پچلا۔

اشین گن والوں نے اشین گنیں میری طرف تن لیں۔

”اسے درخت سے باندھ دو۔ بھوکا پیاسا رکھو۔ دیکھوں گا یہ کب تک زبان بند رکھے گا۔ سمجھے مجھے دولت کی ضرورت ہے اور تمہیں دولت فراہم کرنا ہوگی۔ چلو۔ اسے درخت سے باندھ دو۔“ اس نے اشین گن والوں کو حکم دیا اور ان چار میں سے دو آگے بڑھ آئے۔ باقی دو اشین گنیں تن کر ہو شیار کھڑے ہو گئے۔

اور پھر تانکوں کی ایک مضبوط رسی سے مجھے باندھ دیا گیا۔ تب میکلارنس نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ”میں جا رہا ہوں نواز! اگر تمہاری دماغی حالت درست ہو جائے تو مجھے اپنی آمدگی کی اطلاع کراؤ تا اور تم..... تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تمہیں پوری ہو شیاری سے اس کی نگرانی کرنی ہے۔“

”اوکے پاس!“ وہ چاروں بولے۔

اور میکلارنس ایڈلک کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”آؤ ایڈلک! چلیں۔ بہر حال ہم ناکام نہیں رہیں گے۔“ پھر وہ دونوں واپس مڑ گئے۔

چاروں اشین گن بردار میرے نزدیک موجود تھے۔ کبوتروں نے خوب کس کر باندھا تھا، ساری رسیاں بدن میں چبھ رہی تھیں لیکن میں رعایت کی بھیک مانگنے کا قائل نہیں تھا۔ البتہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔

زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو، کوئی خاص وقعت تو میرے ذہن میں نہیں تھی۔ موت کسی بھی شکل میں آجائے، میں نے تو شاید آج سے پہلے بھی اس بات کی پرواہ نہیں کی تھی لیکن کم از کم میکلارنس جیسے بے حقیقت آدمی کے ہاتھوں مرنا تو مناسب نہیں تھا۔

میں موت بھی اپنی پسند ہی کی چاہتا تھا۔ حالانکہ مرنے کی آرزو ابھی باقاعدگی سے میرے ذہن میں

میں ابھری تھی یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بس اب زندگی کا اختتام ہی ہو جائے۔ حالانکہ بارہا ایسے مواقع آئے تھے کہ دل اور ذہن اس دنیا سے بری طرح بیزار ہو گئے تھے۔ زندگی میں کوئی چارم نہ رہا تھا، اس کے باوجود موت کی خواہش کبھی دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اب جن حالات میں جکڑا گیا تھا وہ کچھ اور تھے اور اب اگر موت کہیں سے دبے پاؤں نزدیک آ جاتی تو میں اسے دیکھ کر صرف مسکرا کر رہ جاتا، حالانکہ سنا ہے بڑے بڑے موت کی صورت دیکھ کر خوف سے اودھ مرے ہو جاتے ہیں لیکن اپنی ذات پر بہت سے یقین تھے مجھے۔ اور انہی یقینوں میں ایک یقین یہ تھا کہ اگر موت میرے سامنے آجائے تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراسکوں گا اور بہت سب پر وہائی سے اسے سینے سے لگا لوں گا۔

اور جب آدمی موت کی جانب سے اس قدر بے پرواہ ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی تکلیف اس کے لیے تکلیف نہیں رہتی اور کوئی عمل ایسا نہیں ہوتا جسے وہ انجام نہ دے سکے۔

میرا بدن رسیوں سے جکڑا ہوا تھا اور وہ چاروں میرے نزدیک موجود تھے لیکن اس کے باوجود میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے میں اگر چاہتا تو کوئی اندھا قدم اٹھا سکتا تھا۔ ان لوگوں کو کسی طرح قبضے میں لے کر کوشش کرنا کہ اگر اس کوشش میں مارا جاتا تو یہ انسوس ضرور ہوتا کہ میکلارنس سینہ ٹھونک کر میرے گالہ وہ راجہ نواز اصغر..... جس نے ہو ریٹھو جیسے خطرناک شخص کو کتے کی موت مار دیا، اس کے قتل ہو گیا اور یہ بات مجھے پسند نہیں تھی۔

بہت دیر تک میں مختلف خیالات میں الجھا رہا اور یہ خیالات..... یہ تو میرے ذہن کی چولیس ہلا دیتے۔ کاش انسان کے پاس خیالات سے چھٹکارہ پانے کا کوئی ذریعہ ہوتا، کوئی ایسی قوت اس کی ذات میں پنہاں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے سوچ سکے۔

لیکن انسوس..... سوچ کبھی انسان کی تلخ نہیں ہو سکتی، میں ان اشین گن برداروں کو دیکھتا رہا۔ ان اور میرے درمیان کوئی گتھگو نہیں ہوئی۔ وہ لوگ ویسے بھی خشک طبیعت نظر آتے تھے، انہوں نے میں بھی ابھی تک کوئی خاص بات چیت نہیں کی تھی۔ البتہ ان میں سے کئی آدمیوں نے سگریٹ وغیرہ

جب یہ خاموشی کچھ ناگوار گزرنے لگی تو میں نے ان میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

”کیا تم مجھے سگریٹ پلاؤ گے؟“

”کیوں کیا سگریٹ کے بغیر مر جاؤ گے تم۔“

”میں طلب محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”یہ تو اچھی بات ہے،“ مسٹر میکلارنس یکی تو چاہتے ہیں کہ تم بہت سی چیزوں کی طلب محسوس کرے ان کی طلب پوری کر دی جائے۔“

”اوہ۔ خاصے تربیت یافتہ معلوم ہوتے ہو۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا اور وہ سب مسکرائے گئے۔

اس کے بعد میں نے سر جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس قسم کی کوششیں بے سود تھیں، ظاہر ہے کہ ان سے ذہن کو جلانے کے سوا کچھ نہ حاصل ہوتا۔ چنانچہ اب ان لوگوں سے باتیں کرنا بے کار ہی تھا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ وہ لوگ بھی تھک کر بیٹھ گئے تھے اور اب میری طرف سے کسی قدر لاپرواہی بھی تھی۔

میں نے ان کی لاپرواہی کے انداز کو دیکھا اور اپنے ذہن کو دوڑانا شروع کر دیا۔ اگر یہ لوگ تھکن سے اتنے چور ہو جائیں کہ میرے اوپر نگاہ نہ رکھ سکیں تو مجھے کوئی کوشش آزادی دلا سکے گی۔ میں نے رسیوں کی بندش کو محسوس کیا۔

رسیوں کی بندش اتنی مضبوط تھی اور میرے ہاتھ اس طرح مفلوج کر دیے گئے تھے کہ میں رسیاں کھول بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ ایک کوشش میں نے شروع کر دی۔

میں نے غیر محسوس انداز میں اپنے بدن کو اس طرح ہلکی ہلکی جنبش دینا شروع کر دی کہ رسیوں کی گرفت ان پر سے ڈھیلی ہو جائیں، حالانکہ یہ آسان کام نہیں تھا لیکن رسیوں کے اندر یہ لچک ہوتی ہے چنانچہ معمولی معمولی سی جگہ بننے لگی۔

ان لوگوں کو میں نے یہ احساس ہونے نہ دیا تھا کہ میرے ذہن میں کوئی ترکیب آگئی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں مصروف رہا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بھوک یا پیاس سے چند گھنٹوں بلکہ چند دنوں تک نہیں مر سکوں گا۔ اگر پورا دن گزرنے کے بعد رات پوری مل جائے تو یقیناً کچھ نہ کچھ کارروائی عمل میں آسکتی ہے لیکن اس وقت جب یہ لوگ تھک کر سو جائیں۔

اور میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو اس طرح ساکت و جامد کر لیا کہ یہ لوگ یہ سوچ بھی ذہن میں سے نکل دیں کہ میں کوئی کارروائی کر سکتا ہوں یا آزادی کی کوشش کر سکتا ہوں۔

ہاں جب بھی مجھے انکی توجہ پٹی ہوئی ملتی تو میں اپنے بدن کو اسی انداز میں جنبش دینے لگتا اور اس سے کم از کم ایک بات ضرور ہوئی تھی، وہ یہ کہ میرے جسم کے گرد رسیوں کی گرفت کسی قدر..... نرم پڑ گئی تھی اور وہ تکلیف جو میرے جسم کو جگہ جگہ سے ہو رہی تھی اب تقریباً ختم ہو گئی تھی..... اس انداز میں اب میں کئی گھنٹے با آسانی گزار سکتا تھا۔ بلکہ یوں سمجھا جائے کہ مجھے اپنی اس کوشش سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوا تھا۔

میرا تجربہ ہے کہ بعض اوقات ہم کچھ مسائل یا مصائب میں گھر کر یہ سوچ بیٹھتے ہیں کہ شاید اب یہ مصائب ہماری زندگی کا اختتام ہی بن جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

آسان کی گردش حالات میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے اور یہ تبدیلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان ان کے

قلمی سوچ نہیں سکتا، وہ حالات پر قابو پانے میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے، اپنی تقدیر، اپنی کوشش بلاشبہ جیتی ہے اور بعض اوقات یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے اپنی تقدیر سے وہ چیز حاصل کر لی جس کا وہ لائق تھا لیکن یہ غلط ہے، تقدیر کے ساتھ ساتھ حالات کا عمل بھی ایک مسلم حقیقت رکھتا ہے۔ اس وقت ان چار آدمیوں کی موجودگی میں میرے ذہن میں کوئی ایسا منصوبہ نہیں آسکتا تھا جس سے کوئی نقصان پہنچا سکتا اور حالات کو اپنے مفاد میں موڑ سکتا لیکن میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وقت کی موجودہ بہت سے راستے متعین کر دیتی ہے۔

اس وقت شاید رات کے تقریباً آٹھ بجے تھے۔ جزیرے پر گہری تاریکی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابلت الارض کی آوازیں جگہ جگہ سے ابھر رہی تھیں۔ وہ چاروں بھی پریشان نظر آ رہے تھے، کچھ کی کچھ چیزیں شاید ان کے پاس موجود تھیں جنہیں وہ استعمال کر چکے تھے۔

میں ان کی گفتگو با آسانی سن سکتا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا فاصلہ مجھ سے زیادہ نہ تھا۔ ان میں میں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ درخت کے عقب میں ایک جگہ صاف کر کے وہاں لیٹ جائیں گے اور گے۔ باقی دو جاگتے رہیں گے اور آدھی رات کو دو جاگنے والے ان کو جگادیں گے اور خود سو جائیں، طرح پوری رات گزر جائے گی۔

لیکن وہ پریشان بھی تھے اور اس پریشانی میں انہوں نے ایک دوسرے سے جو گفتگو کی تھی وہ کچھ

کیا خیال ہے تمہارا، یہ کبخت کتنے عرصے میں مرجائے گا؟“ ایک نے دوسرے سے سوال کیا۔ نہیں کہا جاسکتا، خلا ساخت جان معلوم ہوتا ہے لیکن..... مسٹر میک لارنس تو کچھ اور چاہتے وہ کیا؟“

میرے خیال کے مطابق مسٹر میک لارنس اس شخص کی موت نہیں چاہتے۔“ دوسرے نے

کہا۔ لعنت بھیجو اس لمبے سؤر پر، ہمیں تو صرف پاس کا خیال ہے۔“ یہ بھی درست ہے۔“ پہلے شخص نے اس کی تائید میں جواب دیا۔

ویسے مسٹر ایڈلک نے بھی اس وقت ہمارے سپرد جو ذیونی کی ہے وہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں

ارے ارے۔ تم بد دل کیوں ہو گئے؟“

بد دل ہونے کی بات ہی ہے یار! بھلا اس جزیرے پر اس انداز میں بھی راتیں گزاری جاسکتی

”اس انداز سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنی محبوباؤں کو لے کر تو یہاں آسکتے ہیں اور اس وقت انہیں یہ تھلائی دیر لنی خاصی دلکش محسوس ہوتی ہے لیکن یہاں ہم چاروں میں سے کسی کی کوئی محبوبہ نہیں ہے اور اسٹین گھنیں اور سامنے درخت سے بندھا ہوا احمق بھلا اس ماحول میں بھی کوئی رومانیت ہے؟“

”اوہ۔“ دوسرا ہنس پڑا۔ ”تو تم رومان کی تلاش میں ہو۔“ لکس نے مسخرے پن سے کہا۔

”ارے یہ بات نہیں ہے یار! دنیا آرام سے بستروں میں سونے کے لیے لیٹ گئی ہوگی یا پھر تفریحات میں مصروف ہوگی اور ہم اس دیرانے میں ان جھاڑیوں کے درمیان احمقوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی تک کی بات ہے؟“

”بہر صورت گزارنا تو ہے ہی۔“

”لیکن میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ دوسرے نے سوال کیا۔

”کیوں نہ ہم چاروں اس پر اسٹین گھنوں سے گولیاں برسائیں اور اسے ہلاک کردیں۔ میکلا رنس اور ایڈلک کو یہ اطلاع دے دیں کہ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی چنانچہ ہم نے قتل کر دیا۔ اس طرح ہم سب کو بہت جلد چھٹکارہ مل سکتا ہے۔“

”ارے نہیں۔ کیوں احمقانہ بات کرتے ہو۔“

”کیوں اس میں حماقت کی کوئی بات ہے؟“ دوسرے نے برا منہ بنا کر پوچھا۔

”تمہیں اندازہ ہے کہ مسٹر میکلا رنس اسے قتل کرنا نہیں چاہتے وہ اپنی کوئی بات منوالہ خواہش مند ہیں؟“

”ٹھیک ہے لیکن اگر انہوں نے اس سے دولت حاصل کر لی اور اپنی کوئی بات منوالہ تو ہم سے کیا ملے گا اور یہ تکلیف دہ رات کس حساب میں جائے گی؟ یہ ضروری تو نہیں ہے اس رات پر ہو جائے ابھی تو کل کا دن بھی پڑا ہوا ہے اور یہ کبوت اتنی آسانی سے مرنے والوں میں سے معلوم ہوتا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ تمہیں نیند آرہی ہے اس لیے تم سو جاؤ۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”بعد خاموشی چھا گئی۔“

میں ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ تمک حرام قسم کے لوگ تھے اپنے مالک کرنا نہیں جانتے تھے۔

اس وقت تقریباً میرے اندازے کے مطابق آٹھ بجے تھے میرے ہاتھ پیچھے کی طرف ہوئے تھے اور کچھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ میں جھک کر بھی گھڑی نہیں دیکھ سکتا تھا جو میری

”اس لیے میں نے صرف اندازہ لگایا تھا۔“

میں نے ان چاروں کو دیکھا۔ ان میں سے دو سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ ان کے سونے کا اندازہ اس طرح لگایا کہ وہ دونوں جو کھنی دیر تک گفتگو کرتے رہے تھے نظر نہیں آرہے تھے جب کہ باقی دو۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنے پار میں آگ روشن کر لی تھی تاکہ ریگنے والے کیزوں سے محفوظ رہ سکیں۔

یوں بھی فضا میں کھنی خنکی پیدا ہو گئی تھی اور ماحول کمر میں ڈھک گیا تھا لیکن بہر حال کمراتی گرمی کہ بالکل قریب یعنی اتنی دور کی چیز بھی نظر نہ آسکے جتنی دور میں ان سے تھا۔

قدموں کی چاپ اور ایک ہلکی سی آہٹ میں نے بھی سنی تھی اور شاید ان دونوں نے بھی۔ وہ اچھلے ہو گئے۔

”کیسی آواز ہے؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”پتہ نہیں۔ دیے زیادہ نزدیک نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی جزیرے پر آیا ہو۔“ دوسرے نے جواب

”تو پھر کوئی بات نہیں یہاں تو ایسے جوڑے آتے ہی رہتے ہیں۔“

”آتے ہیں مگر ان گھنی جھاڑیوں کے نزدیک نہیں آتے۔ ان کے لیے جزیرے کا صاف ستھرا حصہ ہوتا ہے یا پھر کوئی اگر کسی سے چھپنا چاہے تو اس طرف آسکتا ہے۔“

”دیکھ میں؟“ دوسرے نے پوچھا۔

”آؤ لیکن زیادہ دور تک نہیں۔“

”لیا خیال ہے ان دونوں کو جگا دیا جائے؟“

”ارے نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تم خوف محسوس کر رہے ہو؟“

”ارے نہیں۔ لعنت ہے خوف کیسا؟“ دوسرا غرایا۔ اسے یہ الفاظ اپنی توہین محسوس ہوئے تھے۔

لیکن دوسرے لمحے جو کچھ ہوا تھا وہ بڑا ہی تعجب خیز تھا۔ اچانک ہی میں انتہائی تیز روشنی میں نما گیا۔

تیز تھی کہ میری آنکھیں بند ہو گئیں، نہ جانے کونسی لائٹ ڈالی گئی تھی۔

اسٹین گھن والے چونک کر پلٹے اور اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے جھنبلا کر فائر کر دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے دو فائر ہوئے اور وہ دونوں زمین پر گر پڑے۔ اسٹین گھنیں ہاتھوں سے نکل گئیں اور وہ ترپنے لگے۔ گولیاں ان کے جسم کے ان نازک حصوں پر لگی تھیں

کہ زندگی مشکل ہوتی ہے۔

خاتون کی آواز سن کر اور ان دونوں کی چیخیں سن کر وہ دونوں بھی اٹھ بیٹھے جو سو رہے تھے اور جو نبی آئے دو فائر اور ہوئے اور گولیوں نے انہیں بھی چاٹ لیا۔

کہا۔

”سب کچھ ٹھیک۔۔۔۔۔“ اور چانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔
”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، چلو واپس چلو۔“ جوڈین نے کہا اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔

میرے خون کی روانی اب کافی حد تک بحال ہو چکی تھی چنانچہ میں اپنے قدموں سے چلنا ہوا لائیج تک آیا اور لائیج ساحل کی جانب واپس چل پڑی۔ جوڈین میرے نزدیک ہی بیٹھا ہوا تھا اور لائیج پر موجود لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

”تم سے دوبارہ مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔“ وہ بولا۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں جوڈین!“

”اوہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جوڈین تو یاروں کا یار ہے اور ایک نگاہ میں فیصلہ کرتا ہے۔“

جوڈین مسکرایا۔

”فیصلہ؟“

”ہاں فیصلہ۔ اگر ایک نگاہ میں کوئی بھاگیا تو پھر وہ کچھ بھی ہو، کیسا بھی ہو جوڈین اسے دوست ہی رکھتا

ہے اور پھر دوستوں کے دوست بھی تو اپنے ہی دوست ہوتے ہیں۔“

”یقیناً“

”مسٹر میک لارنس بھی تم سے کافی بے تکلف تھے۔“

”ہاں۔ وہ عمدہ انسان ہیں۔“

”وہ دوست کا یار ہے اور دشمنوں کا سخت دشمن۔ میں نے بھی اس کے سامنے گردن نہیں اٹھائی۔

وہ میرا ایسا ہی دوست ہے۔“

”تمہارے جیسے دوست ملنا مشکل ہیں جوڈین!“

”ارے نہیں۔“ جوڈین بھدے انداز میں ہنس پڑا۔ ”میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہاں، تمہیں اس

دن کا شکار پسند آیا تھا؟“

”بے حد لیکن تمہارا طریق کار حیرت انگیز ہے۔“

”انفرا ویت ہے اس میں۔ کیمپنگ میں بے شمار بیسی آئے تھیں۔ لڑکے اور لڑکیاں، نشے کے

علاوی، بے قیمت۔ ان میں لڑکیاں تمہیں اتنی آسانی سے دستیاب ہو جائیں گی کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ بعض

اوقات ایک سگریٹ کے عوض۔“

”اوہ۔“ میں نے پلکیں جھپکا کر اس طرح اظہار حیرت کیا جیسے اس سے قبل کسی بیسی گروہ کو دیکھا

بھی نہ ہو۔

”بالکل سچ کہہ رہا ہوں لیکن مجھے اس غلاطت سے نفرت ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”دیکھو دوست! شیر کبھی مردہ شکار پسند نہیں کرتا۔ جو آسانی سے ہاتھ آجائے اسے شکار کب کہا

جاتا ہے۔“

”یہ تو درست ہے۔“

”میں خود ہی شکار کرتا ہوں۔ اپنے لیے بھی اور دوستوں کے لیے بھی۔ کسی کی مجاہد ہے کہ کوئی

بلج کر جائے۔ دو ایک بار لوگوں کو پتہ بھی چل گیا کہ شکاری کون ہے۔“

”پھر؟“ میں اسے زیادہ سے زیادہ باتوں میں لگانا چاہتا تھا۔

”میں نے سمجھایا کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے اور جوڈین اس کی کمپنگ کا شہنشاہ ہے۔ نہ مانے

میں۔۔۔۔۔“ اس نے گردن پر ہاتھ پھیرا۔

بہر حال جوڈین کی اس فطرت سے میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جس طرح ان چاروں آدمیوں

کو بل کر دیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انسانی زندگی کی اس کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس نے ان

کو دیکھا بھی نہیں تھا کہ وہ کون تھے۔

”تم اس وقت گر اس میز جانے کے بجائے میرے ساتھ کیمپنگ ہی چلو۔“ اس نے پیش کش

کی۔ اگر جوڈین یہ پیشکش خود نہ کرتا تو میں خود اس سے فرمائش کرتا۔ کیونکہ ظاہر ہے اب گر اس میز

..... طرف جانا تو حماقت تھی۔ میک لارنس اور ایڈلک کو بہر حال جلد یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ میں

ہو گیا ہوں۔ کس طرح؟ یہ تو بعد میں ہی معلوم ہو گا۔ ویسے لطف آجائے گا ان دونوں کو بھی۔ میں دل ہی

میں مسکرا دیا۔

لیکن جوڈین کے ساتھ بھی جس قدر کم وقت گزرے بہتر ہے۔ نہ جانے کب وہ میک لارنس

مل بیٹھے۔ اگر اس نے تذکرہ بھی کر دیا تو گزربڑ ہو جائے گی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ لائیج ساحل

میں گئی۔ جوڈین جزیرے پر کسی نیک مقصد سے تو نہیں آیا ہو گا۔ نہ جانے وہ کیا کرتا ہے۔ بہر حال یہ سب

جاننے کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔ میں اس کے ساتھ اتر آیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم کیمپنگ میں

ن کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

”شکار کا بندوبست کیا جائے؟“ جوڈین نے پوچھا۔

”ضرور۔“ میں بھی اوباشوں کے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”کیا تم نے کھانا کھالیا۔“ اس نے پوچھا اور خود ہی اپنی حماقت پر ہنسنے لگا۔ ”واہ۔ کیا سوال کیا ہے میں

..... بعض اوقات احمق ہو کر رہ جاتا ہوں۔“

”ظاہر ہے مسٹر جوڈین! ان لوگوں نے میرے لیے دعوت کا بندوبست نہیں کیا تھا۔“ میں نے بھی

ہنس کر کہا۔

”تب پھر پہلے میں کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کسی کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بزن دبا دیا۔ ایک آدمی آیا تو اس نے کھانا لگانے کی ہدایت کی اور وہ شخص گردن جھکا کر چلا گیا۔ ”ہاں یہ تو بتاؤ کہ وہ گدھے کون تھے اور تم سے کیا چاہتے تھے؟“ جوڈین پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

”گر اس میئر میں مسٹر میک لارنس تو اپنے دوست ایڈلک کے ساتھ مصروف ہو گئے۔ میں نے ان سے اجازت طلب کر کے قصبہ گھومنے کا پروگرام بنایا اور ایک جگہ یہ چاروں میرے اوپر آپڑے۔ انہوں نے عقب سے حملہ کر کے مجھے بے ہوش کر دیا اور پھر اس جزیرے پر ہوش آیا تھا اور میں درخت سے بندہ ہوا تھا۔“

”خوب، خوب۔ لیکن انہوں نے اس حرکت کا مقصد تو بتایا ہو گا؟“

”ہاں۔ کہنے لگے کہ ہر ہنس ٹائی اسمگلر کے منشیات کے ذخیرے کا پتہ مجھے معلوم ہے۔ وہ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”ہر ہنس کا ذخیرہ؟“ جوڈین حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ یہ ہر ہنس کیا بلا ہے اور منشیات کا ذخیرہ کیسا ہے۔“

”مگر اس کا کوئی ذخیرہ نہیں تھا۔“

”اب مجھے کیا معلوم۔“

”تعب ہے۔ کہیں انہوں نے تمہیں میک لارنس کے ساتھ دیکھ کر تو یہ سوال نہیں کیا؟“

”کیوں۔ میک لارنس سے اس بات کا کیا واسطہ؟“

”ایک زمانے میں میک لارنس ‘ہر ہنس’ کا ایجنٹ رہ چکا ہے۔“

”بہر حال ان باتوں سے میرا تو کوئی تعلق نہیں۔“

”ٹھیک ہے، جنم میں جائیں۔ اب وہ ہر ہنس کے پاس پہنچ چکے ہیں خود ہی اس سے اس کا ذخیرہ معلوم کر لیں گے۔“ جوڈین ہنس کر بولا اور میں بھی ہنسنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد کھانا لگ گیا اور جوڈین خود بھی میرے ساتھ شریک ہو گیا۔ ”میں نے بھی کھا نہیں کھایا تھا۔ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا ہے تو اس وقت کھانا نہیں کھاتا جب تک اسے انجام نہ دے لوں۔“

”خوب۔“ میں نے مختصراً کہا۔

”کھانے کے بعد جوڈین اٹھ گیا۔“ تو اب میں تمہارے لیے شکار کا بندوبست کروں۔“

”تمہیں میرے لیے کافی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے جوڈین!“

”ارے نہیں۔ میک لارنس کے تو کتے کے لیے بھی یہاں پر بہت کچھ ہے۔ وہ میرا ایسا دوست ہے۔“ جوڈین نے کہا اور باہر نکل گیا۔

میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا تھا۔ اور میں تمہارے اس دوست کا دشمن بن گیا ہوں پیارے! اور وقت تم جو کچھ کر رہے ہو اپنے دشمن کے لئے کر رہے ہو۔ لیکن تمہارے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے بلکہ نہ جانے کب تم دونوں میری طرف سے مشکوک ہو جاؤ۔

اس رات جو شکار میرے لیے لایا گیا وہ پہلے کی مانند نہیں تھا۔ نشے میں بدست لڑکی جیسی نہیں بلکہ شوقین قسم کی نشے باز معلوم ہوتی تھی۔

”عیش کرو ڈیر! اب صبح کو ملاقات ہوگی۔“ جوڈین نے کہا اور میں غور سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ وہ مجھے مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”نینا۔“ لڑکی کو بہر حال اپنا نام یاد تھا۔

”سیاح ہو؟“

”نہیں۔ میں عیش کرنے گر اس میئر آجاتی ہوں۔ تم کون ہو؟ اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟“

”تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟“

”آج کی رات تم ہو ڈارلنگ! اب کسی اور کی کیا ضرورت ہے۔“ اس نے کہا اور میں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ لیے۔ اب بھلا مجھے رہبانیت کی کیا ضرورت تھی۔ پہلی لڑکی کی بات اور تھی۔

لڑکی تھوڑی دیر کے بعد ہی گہری نیند سو گئی لیکن میرے لیے یہ سونے کی رات نہیں تھی۔ میں خاموشی اور کھلم کھلا ہونے کا انتظار کر رہا تھا لیکن اس دوران میرا ذہن دوسری باتیں بھی سوچ رہا تھا۔ میں نے راجہ اصغر نواز کی دوسری زندگی ابھی قطعی طور پر ترک نہیں کی تھی۔ گو بہت کچھ چھوڑ دیا تھا لیکن ابھی فطرت کی پستیوں نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ انتقام کا جذبہ سرد نہیں ہوا تھا۔ میک لارنس نے مجھے مارنے کے باوجود میرے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ بڑا توہین آمیز تھا۔ اس کے لیے بہترین تھاکہ اگر وہ اپنی کسی شخص میں ناکام رہا تھا تو گولی مار دیتا لیکن اس نے مجھے نہ قتل کر کے بھی میری توہین کی تھی۔ گویا اس نے اپنے لیے خطرناک نہیں سمجھا تھا اور راجہ نواز اصغر اب اتنا بے جان بھی نہیں تھا۔

چنانچہ میک لارنس کو سزا ملنا چاہیے تھی۔ ایڈلک ایک بے مصرف انسان تھا، خود اس کا اس کے لیے کوئی اہم کردار نہیں تھا سوائے اس کے کہ اس نے میک لارنس کے احکامات کی تعمیل کی تھی۔ البتہ سیڈر قاتل معافی نہیں تھا۔ وہ مجھے دھوکے سے جزیرے پر لایا تھا۔ چنانچہ میری فہرست میں ان کے نام شامل ہو گئے۔ اور پھر میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کچھ فیصلے کیے۔

میں چاہتا تو انہیں نظر انداز بھی کر سکتا تھا لیکن شاید ابھی میرے اندر اتنا غم نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ ان لوگوں کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس عمارت سے نکل آیا۔ کیچپنگ میں بھی کہیں کہیں ہنگامے جاری تھے لیکن زیادہ تر خاموشی ہی چھائی ہوئی تھی۔

میں برق رفتاری سے چل پڑا۔ سرحال یہاں سے دور نکل جانا ہی بہتر تھا۔ میں سنسان سڑک پر آگیا اور پھر سڑک سے ہٹ کر پیدل چلنے لگا۔ اس وقت لفٹ وغیرہ ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بھلا کون اتنی رات گئے سفر کرنے کی کوشش کرتا۔ فاصلہ بے حد طویل تھا اور مجھے یقین تھا کہ صبح ہونے سے قبل میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ لیکن ہمت ہارنا بھی مناسب نہیں تھا۔ میں نے صرف یہ اندازہ لگایا تھا کہ میں نے غلط رخ تو نہیں اختیار کیا۔

پھر جب دور سے مجھے وہ چھانک نظر آیا جس کے دوسری طرف ایک تالاب اور پھر ایک عمارت تھی، تو میں نے طویل سانس لی۔ فی الوقت میرا سفر ختم ہو گیا تھا۔ کئی دن اس عمارت میں گزارے تھے اس لیے یہ اندازہ تھا کہ کہاں سے دوسروں کی نگاہوں سے بچ کر اندر داخل ہوا جاسکتا ہے اور اب میرے لیے ایسے کام مشکل بھی نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں عمارت کے عقبی حصے میں تھا۔ سیکارینا کے کمرے کا بھی مجھے اندازہ تھا اور نوین کی خواب گاہ سے بھی واقف تھا۔ بس مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت سیکا سے ملا جائے یا نہیں اور یہ کہ اسے کس حد تک راز دار بنایا جائے۔ سیکا جس قدر بدل گئی تھی اس کے تحت خطرہ بھی تھا لیکن سرحال اس سے محتاط گفتگو کر لینا چاہیے۔ میں اسے ہوا بھی نہیں لگنے دوں گا کہ میرے ذہن میں کیا ہے۔

کافی بحث کرنے کے بعد میں نے بالآخر..... سیکا کے دروازے پر دستک دی۔ دوسری اور پھر تیسری بار ہلکی سی دستک دینے پر دروازہ کھل گیا۔ سیکا شب خوانی کے لباس میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ کھولنے سے قبل اس نے لائٹ آن کر دی تھی۔ روشنی میں سیکا بہت دلکش نظر آرہی تھی۔ اس نے سوئی سوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر جیسے اس کا ذہن نیند سے آزاد ہو گیا۔ اس نے چونک کر میرے عقب میں دیکھا۔

”کئی کہاں ہے؟“

”میکلارنس؟“ میں نے سر دلچے میں پوچھا۔

”ہاں۔“

”وہ اپنے دوست ایڈلک کے پاس ہے۔“

”اوہ۔ تمہارے ساتھ نہیں آیا؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”کیا یہ سارے سوالات تم اسی جگہ کر لوگی سیکارینا! مجھے اندر آنے کی اجازت بھی نہیں ہے؟“ میں نے سر دلچے میں کہا۔

”اوہ۔ سوری نواز! نیند کے دباؤ میں ہوں آؤ۔“ وہ جھک کر پیچھے ہٹ گئی لیکن اس کے انداز سے

ابھمن محسوس ہو رہی تھی۔

”میرا نام نواز ہے سیکا! اور تم سے زیادہ اس بات کو کون بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے کہ میں شب خون لگانے کا علوی نہیں ہوں۔“

”ہاں نواز! لیکن مجھے معاف کرنا صداقت کے راستے اتنے مشکل ہوتے ہیں کہ ان پر چلتے ہوئے

انسان قدم قدم پر لولہاں ہو جاتا ہے میکلارنس ایک صاف ذہن کا انسان ہے۔ اس کا کاروبار کچھ بھی

لیکن شوہر کی حیثیت سے وہ برا انسان نہیں ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اب جب میں اپنا ماضی چھوڑ چکی

ہوں تو ماضی کی کوئی بات دوبارہ میرے سامنے نہ آئے۔“

”صاف الفاظ میں بتاؤ سیکا! تمہارے ذہن میں کیا ہے؟“

”تمہاری اس وقت آمد میرے لیے پریشان کن ہے نواز! اگر تمہیں میری خواب گاہ میں دیکھ لیا

میں تو میں کسی کو بھی یقین نہ دلا سکوں گی کہ.....“

”میں تم سے صرف گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”اسی وقت؟ کیا تم اس وقت آرام نہیں کر سکتے؟ کیوں نہ ہم صبح کو ناشتے کے بعد گفتگو کریں؟“

”نہیں۔ ابھی اسی وقت۔ ہاں اگر تم انکار کرو گی تو تاخیر سے ہونے والے نقصان کی خود ذمے دار

ہوں گی۔“

سیکا کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”تب ہم چھت پر چلتے ہیں نواز!“

”چلو لیکن میرے اندر مفاہمت کے تمام جذبے سرد ہو گئے ہیں۔ تمہارے رویے میں بے اعتمادی

ہے اور میں اس بے اعتمادی کو نہیں بھولوں گا۔“

”اوہ نواز! یہ بات نہیں..... دراصل میں.....“

”آؤ سیکا! چھت پر چلیں۔“ میں پھٹ پڑا۔ اور سیکا اپنے کمرے کی لائٹ آف کر کے میرے ساتھ

چھت پر آگئی۔ ہم دونوں آنے سے سامنے بیٹھ گئے۔

”کچھ ایسی اطلاعات تمہیں سیکارینا! جو تمہیں دینا ضروری تھیں۔“

”کیا نواز!“

”میکلارنس کے کاروبار کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟“

”جو جانتی ہوں تمہیں بتا چکی ہوں۔“

”اور خود میکلارنس کے بارے میں؟“

”صرف یہ کہ وہ میرا شوہر ہے اور میرے لیے برا انسان نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ وہ کبھی کسی گروہ سے منسلک رہ چکا ہے؟“

”میکلارنس؟“ سیکا نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں۔“

”نہیں نواز! یہ بات مجھے معلوم نہیں۔ لیکن کیا تم معلوم کر سکتے ہو؟“

”ہاں سیکا! اس کا تعلق ہر بنس اسمگلر کے گروہ سے رہا ہے اور غلام سینٹھ کے اشارے پر میں نے ہر بنس کو قتل کر کے اس کا گروہ تیس تیس کر دیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں۔ لیکن میکلا رنس؟“

”وہ ہر بنس کا مقامی ایجنٹ تھا۔“

”لیکن اب تو ہر بنس کا گروہ ٹوٹ گیا ہے؟“

”میں اب کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن بہر حال وہ ہر بنس کا وفادار بھی تھا اور اسے گروہ ٹوٹ جانے

یقیناً افسوس بھی ہو گا۔“

”تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی نواز؟“

”خود میکلا رنس کی زبانی۔“

”اوہ۔ اس نے تمہیں بتایا ہے؟“ سیکا تعجب سے بولی۔

”ہاں اور وہ مجھے بخوبی پہچانتا تھا۔ تمہیں یہ جان کر شاید حیرت ہوگی سیکا کہ وہ تمہیں بھی بخوبی جانتا

ہے۔“

”غلام سینٹھ کے گروہ کی نمائندہ کی حیثیت سے؟“ سیکا کی آنکھوں میں دہشت ابھر آئی۔

”ہاں سیکا!“

”اور یہ بات خود اس نے تمہیں بتائی۔ آخر کیوں نواز؟ چہاچہا کر بات مت کرو۔ براہ کرم مجھے بتاؤ کیا

ہوا۔ تم برہم کیوں ہو اور۔۔۔۔۔ اور یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟“

”بد قسمی سے تمہیں میرے اوپر اعتبار نہیں ہے سیکا! تم جس انداز میں مجھ سے پیش آئی ہو، میری زندگی میں اجنبی ہے، خاص طور سے ان لوگوں کے ساتھ جن کا مجھ سے کوئی نہ کوئی تعلق رہ چکا ہے، جبکہ میں وقت کے ساتھ ساتھ چلنے کا عادی ہوں اور میں تمہیں اس بات پر شرمندہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ دو نوک بات کر کے مسئلہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر بتاؤ نواز! کیا ہے یہ سب کچھ؟“

سیکا! میکلا رنس نے مجھے ہمیں پہچان لیا تھا، وہ انوار کے مجھے لیا گیا تھا۔ پھر اپنے دوست ایڈلک کے بیٹے کے ذریعے اس نے مجھے جھیل گر اس میسر کے درمیان موجود۔۔۔۔۔ جزیرے تک پہنچایا اور جزیرے پر لے جا کر مجھے ایک درخت سے باندھ دیا۔“

”تو کیا وہ اکیلا تھا؟“ سیکار نے سوال کیا۔

”نہیں۔ اس کے ساتھ چار آدمی اور تھے جن کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ میں نے تفصیل

نے ہوئے کہا کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ راجہ نواز اصغر کون ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ممکن ہے سی اور سیکا کی گٹھ جوڑ ہو اور میں یہاں کسی خاص مقصد کے تحت آیا ہوں۔ لیکن اسکے بعد اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ میں غلام سینٹھ کا منشیات کا ذخیرہ اس کے حوالے کر دوں کیونکہ میں اس کا دست راست تھا اور ہم سینٹھ کا کوئی ذخیرہ پکڑا نہیں گیا۔ میں نے اسے سمجھایا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا اور بالآخر اس نے مجھے کر دیا۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا ہوں اور یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس نے مجھ سے کہی بتایا کہ سیکار یقیناً غلام سینٹھ کی خصوصی نمائندہ تھی اور وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔“

”اوہ۔ اوہ۔۔۔۔۔ یہ سب کیا۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟ یہ اچانک کیا ہو گیا؟“ سیکا درد بھرے لہجے میں بولی۔

”کیوں۔ تمہیں اس بات سے اس قدر تکلیف کیوں پہنچی سیکا؟“

”اس لیے نواز کہ میں تو اس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اس تصور کے ساتھ کہ آئندہ بہتر زندگی کا آغاز ہو گا۔ میکلا رنس کے بارے میں مجھے اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ناجائز منشیات کا بوجھ ہے جب میں نے اس سے شادی کی تھی، اگر مجھے یہ بات معلوم ہو جاتی تو میں جس جہنم سے نکل کر آئی تھی اس جہنم میں دوبارہ جانا کبھی پسند نہیں کرتی لیکن بہر صورت یہ بھی تعجب خیز ہے کہ میکلا رنس نے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود مجھ سے شادی کر لی اور پھر آج تک اس نے اس بات کا اظہار نہیں کیا کہ وہ میری اصلیت کو سمجھتا ہے۔“

”میں نے بتایا تھا سیکا! وہ تم سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے اس لیے آج تک اس نے تمہیں تمہاری

اپنی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھا ہے۔“

”مگر اب میں کیا کروں؟“

”تمہارے لیے تو کوئی ایسی مشکل نہیں ہے سیکا!“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ اس نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ بہر صورت تم اس کی بیوی ہو۔ اگر اس سے انکار بھی کروگی تو وہ تمہیں مجبور نہیں

کرے گا لیکن میرے لیے اس نے جو ماحول پیدا کر دیا ہے مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”کیا تمہارے پاس غلام سینٹھ کا کوئی ذخیرہ موجود ہے؟“ سیکا نے پوچھا۔

”بے وقوف ہو تم، سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس قسم کا سوال کر رہی ہو۔“

”بگویا نہیں ہے۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اور دولت کی جو بات اس نے کہی وہ؟“

”دولت میرے پاس بے پناہ ہے سیکا! لیکن کیا تم سمجھتی ہو، کیا میں کسی کے دباؤ میں آ کر اپنی دولت

اس کے حوالے کر سکتا ہوں؟ تمہارے خیال میں سیکا! کیا میکلا رنس، راجہ نواز اصغر سے ٹکر لینے کے

قاتل ہے؟“ میرے لیے میں ایک عجیب سی غراہٹ ابھرائی اور سیکا چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سم گئی تھی پھر اس نے کہا۔

”وہ تمہاری شخصیت سے مکمل طور پر واقف معلوم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اس نے صرف تمہارا نام سنا ہو؟“

”تب اس کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے سیکا؟“

”نواز! میری مدد کرو“ میں اس وقت تمہاری مدد کی طالب ہوں نواز!“ سیکاریفانے کہا۔

اور میرے اندر ایک زہریلا تاثر ابھر آیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس عورت نے مجھے ایک بے اعتبار شخص سمجھا تھا، اب یہ مجھ سے مدد کی درخواست کر رہی ہے۔ آخر میں اس کی مدد کیوں کروں؟ لیکن جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے سیکاریفانے کو اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ سو میں نے دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔

”مجھے بتاؤ سیکا! میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟“

”نواز! میں ایک بار پھر خود کو بے سہارا سمجھنے لگی ہوں۔ اگر میکلا رنس کو میرے بارے میں معلوم تھا تو اس نے مجھ سے یہ بات آج تک کیوں چھپائی۔ اس کا مطلب ہے وہ مجھ سے مخلص نہیں ہے۔“

”مخلص تو تم بھی اس نہیں تھیں سیکا!“

”میری اور بات تھی۔۔۔۔۔“ وہ سسکیں لیتی ہوئی بولی۔

”کیوں تمہاری کیا بات تھی؟“

”میں تو اس سے اپنا ماضی اس لیے چھپانا چاہتی تھی کہ میری آئندہ زندگی سنور جائے۔ میں تو ساری زندگی کے لیے اس لعنت سے نکل جانا چاہتی تھی۔“

”میں تمہارے لیے غمگین ہوں سیکا!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”تم بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہو نواز! خدا کے واسطے کچھ سوچو۔ میں تو بہت پریشان ہو گئی ہوں۔“

”میکلا رنس کو دوسرے ذرائع سے سمجھانا پڑے گا۔“

”کون سے ذرائع؟“

”جب بات تم نے میرے اوپر چھوڑی ہے تو بس خاموش ہو جاؤ۔ ہاں یہ بتا دو کہ تم کیا چاہتی ہو؟“ میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسے بھی اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے نکالنا چاہتی ہوں۔ ہمارے پاس کافی دولت ہے، سکون سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔“

”اور خود تمہارے بارے میں جو اسے معلوم ہے؟“

”اس کو اس کا اظہار کرنے دو۔ میں خود ہی اس سے اس بات کی معذرت کر لوں گی لیکن تم میری

”میں تیار ہوں سیکا! اور اس کے لیے مجھے دو کام کرنا پڑیں گے۔“ میں پر خیال انداز میں بولا۔

”کیا؟“

”سب سے پہلے مجھے اسے اس کے دوست ایڈلک سے جدا کرنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے اسے ان علاقوں پر لانے والا ایڈلک ہے۔ میں ایڈلک کو کسی ایسے جھجھل میں پھنسا دوں کہ وہ خود ہی اپنے مسائل کا سوا حل ہو جائے اور پھر میکلا رنس۔ اس کے لیے بھی کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ہی ہو گا۔“

”تم یہ کام بخوبی کر سکتے ہو نواز!“

”ہاں میں پوری کوشش کروں گا لیکن میکلا رنس میری تلاش میں ہے۔ ظاہر ہے وہ مجھے پکڑنے پر نہیں پائے گا تو تلاش کرے گا۔“

”ایڈلک کا ان علاقوں پر بڑا اثر ہے۔ اگر اس کے آدمی تمہاری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تو ہمیں پناہ نہیں دے گا۔“

”کیا اس گھر میں بھی مجھے پناہ نہیں مل سکتی؟“ میں نے کہا۔

”یہی میں سوچ رہی تھی۔“

”کیا سوچ رہی تھیں؟“

”کیوں نہ تم یہاں رہو۔ میں تمہارے لیے بہتر انتظام کر سکتی ہوں۔ بولو نواز! کیا یہاں قیام کرو

”ہاں“ میرا خیال ہے اس کے لیے یہاں سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ میکلا رنس سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ جس کی تلاش میں ہے وہ خود اس کے گھر میں پوشیدہ ہو گا۔“

”اس مکان کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا کٹھن ہے۔ وہ ہمارے اسی احاطے میں ہے اور طویل سے بند پڑا ہے، میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔ بند خوراک کے ڈبے اور پانی ساتھ لے جاؤ۔ میں چاہتی

”نویں کو بھی تمہاری آمد کی اطلاع نہ ملے اور تم وہاں پوشیدہ رہ کر اپنی کارروائی کرتے رہو۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ کیا وہ کٹھن صاف ہے؟“

”قطعاً۔ وہاں فرنیچر بھی موجود ہے۔ بس ذرا صاف کرنا پڑے گا۔“

”یہ کام میں کر لوں گا تم مجھے وہاں پہنچا دو۔“

”اوہ“ اس طرف دیکھو۔ کٹھن نظر آ رہا ہے۔“ سیکا نے اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا اور میں

”نہیک ہے سیکا! اب تم چاہو تو میرے ساتھ وہاں تک چلو بھی نہیں۔ میں اپنا ٹھکانا بنالوں گا۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس وقت چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں ابھی بندوبست کرتی ہوں۔“ سیکا نے کہا۔

اور اس کے بعد سیکا سے کوئی گفتگو نہیں کرنا تھی۔ ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ سیکا نے کچن سے برساتے ڈبے اور پانی کے تھرماس نکالے اور پھر ایک ٹارچ لے کر ساتھ چل پڑی۔

کانچ کا دروازہ باہر سے لاک ہو جانے والا تھا۔ اندر سے وہ بغیر چابی کے کھل سکتا تھا۔ سیکا میرے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے ٹارچ روشن کر لی تھی۔ عمارت کافی کشادہ اور صاف تھی۔ اس سے قبل بھی میں نے اسے دیکھا تھا لیکن کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بہر حال آج یہ عمارت آہنی۔

”میں جاؤں اب؟“

”تمہاری مرضی ہے سیکا! بہر حال اس بات کا خیال رکھو گی کہ میکلا رنس کو کوئی شبہ نہ ہو۔“

”نہیں ہو گا۔“ سیکا نے کہا۔

”یوں بھی مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔“ میں نے کہا اور سیکا نے ٹارچ مجھے دے دی۔ ”یہ رکھو، کالم آئے گی۔“ اس نے کہا اور پھر خداحافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

پھر میں اس جگہ کی طرف بڑھ گیا جو آرام کے لیے تھی۔ اور پھر آرام سے لیٹ گیا۔ میکلا رنس سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جسے اس نے جزیرے پر اپنے لوگوں کی نگرانی میں چھوڑا ہے آرام سے اس کی رہائش گاہ کے ایک حصے میں سو رہا ہو گا۔

رات بے حد پرسکون تھی، کوئی ایسی وقت پیش نہ آئی۔ بلکہ دوسرے دن میں تقریباً گیارہ بجے تک سویا۔ آنکھ کھلی تو تھوڑی دیر تک ماحول کا اندازہ کرتا رہا اور پھر سب کچھ یاد آگیا۔ ہاتھ روم بھی تھا۔ یہ ایک باقاعدہ رہائش گاہ تھی جس کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا لیکن اب میں اسے استعمال کر رہا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے ناشتہ کیا اور پوری طرح چاق و چوبند ہو گیا۔ اس کے بعد میں عمارت کا جائزہ لیا۔ بڑی عمدہ جگہ تھی۔ یعنی ضرورت کے وقت اندر سے باہر بھی بہ آسانی نکلا جاسکتا تھا۔

کے لیے عقب میں ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی سوہو تھی۔ گویا میرے کام کے لیے بہترین جگہ تھی۔ کھڑکی کے راستے میں چھت پر بھی بہ آسانی پہنچ سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوشش نہیں کی کہ

رہائشی عمارت کی چھت سے کانچ کی چھت پر بھی بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی چھت پر چڑھ جاتا تو آسانی مجھے دیکھ لیتا چنانچہ یہ مناسب نہیں تھا۔ البتہ دروازے کے برابر ایک اور کھڑکی تھی جسے اگر تھوڑا کھول لیا جاتا تو شاید وہ دور سے کھلی ہوئی نظر نہ آتی اور وہیں سے باہر دیکھا جاسکتا تھا۔

مقصد میرا یہ تھا کہ میں صرف میکلا رنس کا اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ آیا یا نہیں۔ کیونکہ میکلا رنس کی واپسی کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔

سیکارینا کا رات کا رویہ ایسا نہیں تھا جسے میں بہت زیادہ مفاہمت کا رویہ کہہ سکتا۔ لیکن مجھے کسی بات کی ضرورت بھی نہیں تھی، یہاں میں صرف اس مقصد کے تحت آیا تھا کہ میں میکلا رنس کو اس بات کی حرکت کی سزا دوں، حالانکہ سیکارینا نے کہا تھا کہ اگر ایڈلک کے آدمی مجھے تلاش کرنے نکل آئے تو چلائے گا کوئی فرد مجھے پناہ نہ دے گا۔

میں نے سیکارینا کی اس بات کو اہمیت نہ دی تھی کیونکہ میں اس چیلنج سے نمٹ سکتا تھا لیکن میں ایسا نہیں کرتا؟ سب سے پہلے تو مجھے میکلا رنس کو دیکھنا تھا اس کے بعد سیڈر کو، باقی رہا ایڈلک تو مجھے اس کے لیے کوئی پرکاش نہیں تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیڈر کی وجہ سے وہ براہ راست میرا دشمن بن جاتا کیونکہ

میں بہر حال اس کا بیٹا تھا۔

سیکارینا سے میں نے ایک اور وعدہ کیا تھا۔ وہ یہ کہ میں اسے اس جہاں سے نجات دلا دوں گا۔ اور اس وعدے کے ایفا ہونے کا وقت آگیا تھا کیونکہ میکلا رنس جب کچھ کرنے کے قائل ہی نہیں رہے سیکا کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اور ایڈلک۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خوب سوچا تھا میں نے ان دونوں کے لیے اور صرف عمل باقی تھا۔

پورا دن میں نے کانچ میں ہی کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر گزارا ویسے بڑا صبر آزما کام تھا اس طرح بیٹھے کوئی مشغلہ بھی نہیں تھا۔ سوائے سوچ کے اور پھر شام ہو گئی۔

اس وقت شام کے تقریباً پونے چھ بجے تھے جب میں نے لینڈ روور کو لکڑی کے پھانک سے اندر لے لے کر ہوتے دیکھا اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

میکلا رنس واپس آگیا تھا۔

واہ۔ گویا کھیل شروع ہو گیا تھا جس کا آغاز میں نے جزیرے سے کیا تھا۔ یقینی طور پر میکلا رنس واپسی معنی خیز تھی۔ میرے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی ہونے لگی۔ سیکارینا پورے دن اس طرف

اور اب میکلا رنس واپس آگیا تھا اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ رات کو بھی نہیں آئے گی۔ وہ اس قدر باہمت نہیں رہی تھی جتنی کہ کبھی تھی۔

میں نے دیر تک کھڑکی کے نزدیک بیٹھ کر باہر کا جائزہ لیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو عین پر نظر پڑی جو چھوٹے چھوٹے مشاغل میں مصروف نظر آ رہی تھی۔ پھر ایک بار میکلا رنس بھی نکلا اور لکڑی کے پھانک کی طرف چلا گیا۔ اس کا رخ شاید چوکیدار کی طرف تھا اور شاید اس نے چوکیدار

کو کچھ ہدایات بھی دی تھیں۔

یہ میرا اندازہ تھا حالانکہ میں نے اسے چوکیدار سے گفتگو کرتے نہیں سنا تھا۔ لیکن ذہن یہی کہ رہا تھا کہ میکلا رنس صرف اور صرف چوکیدار کو ہدایات دینے کے لیے آیا تھا۔

ممکن تھا وہ مختلط رہنا چاہتا ہو کیونکہ..... نواز کا نام اس قدر بے حقیقت بھی نہیں تھا اور یوں بھی جزیرے پر جو چار آدمی قتل ہوئے تھے انہیں دیکھ کر بھی میکلا رنس کچھ سوچ سکتا تھا۔ ویسے ایک بات میرے ذہن میں بھی صاف نہیں تھی۔ وہ یہ کہ میکلا رنس کو کیا یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں جوڈین کے سارے باہر نکلا تھا۔ اگر اسے یہ بات معلوم ہو چکی ہے تو یقینی طور پر وہ بے حد جھٹلایا ہوا ہوگا۔

میں یہ چاہتا تھا اس علاقے میں ہونے والی کوئی بھی بات مجھ سے پوشیدہ نہ رہے۔ حالانکہ ابھی تو یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ صرف کوشش ہی کی جاسکتی تھی۔ ویسے یہ بھی ممکن تھا کہ میکلا رنس رات کے کسی حصے میں واپس چلا جاتا چنانچہ میں نے کھڑکی کے نزدیک ہی ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

کھانے پینے کی چیزیں میں کھڑکی کے نزدیک ہی لے آیا تھا اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تک وہاں بیٹھا رہا اور اس کے بعد جبکہ پوری عمارت تاریکی میں ڈوب گئی میں باہر نکل آیا۔ باہر نکلنے کے لیے میں نے عقبی کھڑکی کا راستہ استعمال کیا تھا۔ جب کوئی وقت نہیں تھی تو میں خواہ مخواہ کالج میں سامنے کا دروازہ کھولنے کی حثیت کیوں کرتا۔

چنانچہ ایک لمبا چکر کٹ کر میں اس رہائشی عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔ جہاں میکلا رنس سیکارٹا اور اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔

عمارت کا پورا محل وقوع مجھے اچھی طرح معلوم تھا چنانچہ میں بہ آسانی اندر داخل ہو گیا اور اب کسی گوشے میں پنہا لینا میرے لیے زیادہ مشکل نہ تھا۔ صرف کینوں کے بارے میں اندازہ لگانا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اس کے لیے میں نے جو گوشہ تلاش کیا وہ نہایت مناسب تھا۔ یہاں سے میں آمد و رفت کے راستوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

پھر تقریباً دس بجے نوین کو میں نے اپنی خواب گاہ میں جاتے دیکھا۔ سیکارٹا اور میکلا رنس بیرونی برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے اور تقریباً ساڑھے دس بجے میں نے سیکارٹا کو اس کی جگہ سے اٹھتے ہوئے دیکھا۔ میکلا رنس وہیں رہ گیا تھا۔ گویا میرا راستہ صاف ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا اور میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میکلا رنس بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ سیکارٹا اور میکلا رنس کی خواب گاہیں بھی شاید الگ الگ تھیں۔ نہ جانے کیوں۔ ویسے سیکارٹا نے اس بارے میں کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا کہ اس کے اور میکلا رنس کے دوسرے تعلقات کیسے ہیں لیکن اب میرے اسے کیا کرنا کہ سارے اتفاقات میرے حق میں تھے۔ بعض اوقات کچھ ایسی باتوں کے بارے میں کہتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ دوسرے اس پر یقین نہ کریں گے۔ لیکن..... حقیقت کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا

میکلا رنس اپنی جگہ اٹھ چکا تھا اب وہ ایک کمرے کی طرف جا رہا تھا جو یقیناً اس کی خواب گاہ

میکلا رنس اپنی خواب گاہ میں پہنچ گیا اور مجھے اس صبر آزما کام کے لیے مزید ایک گھنٹہ درکار

چنانچہ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ گویا اب میں اپنے کام کے لیے تیار تھا۔

میکلا رنس کے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا لیکن دروازے پر پہنچنے سے پہلے میں اپنے کام کرنا نہ

میں نے سیکارٹا کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور اس کے بعد نوین کے کمرے کا اس تصور کے ساتھ کہ کہیں یہ دونوں باہر نہ نکل آئیں اور بعد میں میں خود میکلا رنس کے دروازے پر پہنچ گیا۔

دروازہ اندر سے بند تھا ایک مخصوص انداز میں میں نے دروازے کو ہلکی سی دھتک دی اور اندر تیز روشنی روشن ہو گئی۔ غالباً میکلا رنس سویا نہیں تھا لیکن اس نے ٹائٹ بلب جلا دیا ہوا تھا اور شاید کسی صبح میں غرق تھا۔

”کون ہے؟“ اس نے آواز دی۔

لیکن میں نے اسے جواب نہ دیا۔ البتہ میں ایک دیوار کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ تب میکلا رنس نے دروازہ کھولا اور گردن نکال کر باہر جھانکا۔

اور یہی موقع تھا دوسرے لمحے میرا فولادی گھونہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے پڑا اور میکلا رنس کی آواز کے ساتھ الٹ کر کمرے میں جا گرا۔

میکلا رنس کی سمجھ میں شاید کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں یہاں تک بھی سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ فرش پر چپ پڑا عجیب و غریب انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

شاید اس کی بیٹائی بھی کام نہیں کر رہی تھی۔ وہ عجیب سے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا اور میں نے اس کے بے بسی سے فائدہ اٹھا کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اور پھر اس کی طرف گھوم گیا۔

”مجھے یقین ہے اب تمہاری بیٹائی واپس آگئی ہوگی میکلا رنس!“ میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

میکلا رنس جلدی سے اٹھ گیا۔

”تم..... تم.....!“ اس کے منہ سے ہٹکائی ہوئی آواز نکلی۔

”ہاں۔ کیا تمہیں حیرت ہوئی ہے؟“

”ہاں ہاں کو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میکلا رنس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اور یہ عمدہ ترکیب تھی۔ بظاہر یہی محسوس ہوا جیسے وہ اعصاب پر قابو پانا چاہتا ہو لیکن دوسرے لئے اس نے مجھ پر چھلانگ لگادی۔ بہترین کوشش تھی۔ اگر میں جھکاؤ دے کر بچنے کی کوشش کرتا تو وہ دروازے سے ٹکرا جاتا اور کافی زوردار آواز ہوتی۔ اس طرح دوسروں کو خبر ہو سکتی تھی یا پھر میکلاونس خود ہی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اسے میرے بارے میں واقعی معلومات نہیں تھی۔ ان چھوٹے موٹے داؤ بیچ..... کو گردانتا نہیں تھا۔

سے ٹکرا جاتا اور کافی زوردار آواز ہوتی۔ اس طرح دوسروں کو خبر ہو سکتی تھی یا پھر میکلاونس خود ہی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن اسے میرے بارے میں واقعی معلومات نہیں تھی۔ ان چھوٹے موٹے داؤ بیچ..... کو گردانتا نہیں تھا۔

اس کے اچھلنے کے ساتھ ہی میں بھی اچھلا اور میں نے فضا میں ہی دو لتیاں جھاڑ دیں۔ اور میکلاونس اس بری طرح دوسری طرف گرا کہ قلابازی کھا کر الٹ گیا۔ وہ دو قلابازیاں کھا کر دیوار سے جا لگا تھا۔

”تمہاری بد بختی ہے میکلاونس کہ تم نے نواز اصغر کو جانے بوجھے بغیر اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی سی غلطی ہو گئی نواز! درندہ..... تم اس طرح بڑھ بڑھ کر نہ بول رہے ہوتے۔“ میکلاونس سنبھل کر پھر کھڑا ہو گیا۔ اور میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کوئی غلطی ہو گئی میرے دوست!“

”فیصلہ اسی وقت ہونا چاہیے تھا۔ تم چال چل گئے لیکن کیا تم سمجھتے ہو اس دھوکہ دہی پر جوڑیں تمہیں چھوڑ دے گا؟ وہ دیوانے کتے کی مانند تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔“

”میرے دشمن ایسے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ میکلاونس اور بالاخر خود ہی اپنے فیصلوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میرے ایک چاہنے والے نے مجھے زمین میں دفن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن برہنہ اب یہ بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟“

”یہ عمارت اتنی کمزور نہیں ہے نواز کہ تم آسانی سے یہاں سے نکل جاؤ۔“

”جھوٹ بول رہے ہو میکلاونس! اگر تم اسے اس قاتل سمجھتے تو مجھے یہاں سے دور لے جانے کی کوشش نہ کرتے۔“ میں نے کہا۔

”نواز! تمہاری یہ نئی شکل بھی میرے لیے کافی دلچسپ ہے۔ تم اگر چاہو تو میں تم سے دوسری بات کر لیتا ہوں۔“

”وہ کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”غلام سیٹھ ختم ہو چکا ہے۔ ہر بنس مرچکا ہے۔ اب نئے لوگوں کو میدان میں آنا چاہیے۔ میں چھوٹے پیمانے پر کام کر رہا ہوں کیوں نہ تم بھی میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ میں یہ کام بڑھانوں گا۔“

”کیا تم خود کو ان کا ہم عصر سمجھتے ہو؟“

”ہم ان سے بھی آگے بڑھ جائیں گے نواز! ایڈلک کے پاس بے پناہ دولت ہے اور وہ اپنی ساری

لئے پر تیار ہے۔ اس کی دولت اپنا کام کھانے والے کے پاس کی طرف سے آ رہی ہے۔

”مگر مجھے ہو میکلاونس! اس سے زیادہ کیا کہوں۔“ میں نے نفرت سے کہا۔

اور میکلاونس واقعی گدھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ باتوں میں لگا کر وہ مجھے دھوکہ دے سکتا ہے اس جیسے لوگوں کی دنیا میں اجنبی تو نہیں تھا۔ جونہی اس نے بستر کی طرف چھلانگ لگائی، میں اڑتا ہوا جا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا تھا لیکن میرے جوتے کی ٹھوکرنے اس کا ہاتھ بے کار کر دیا۔

”ایک دھاڑ نکلی، پستول دور جا کر اور میں نے دوسری چھلانگ پستول کی طرف لگائی۔“

اس جیسے لوگوں کی دنیا میں اجنبی تو نہیں تھا۔ جونہی اس نے بستر کی طرف چھلانگ لگائی، میں اڑتا ہوا جا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا تھا لیکن میرے جوتے کی ٹھوکرنے اس کا ہاتھ بے کار کر دیا۔

”ایک دھاڑ نکلی، پستول دور جا کر اور میں نے دوسری چھلانگ پستول کی طرف لگائی۔“

میکلاونس ایک بار پھر بے بس ہو گیا تھا لیکن اس بار اس کے چوٹ بست سخت لگی تھی۔ وہ ہاتھ سے گرا رہا تھا۔ میں نے پستول اٹھالیا۔

”میں اسے تم پر خالی کر سکتا ہوں میکلاونس! لیکن ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تمہاری بیٹی نوین کے پیار سے تمہارا نام لیتی ہے۔ اور اس نے میرے ساتھ بھی بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اس سلوک کے

میں میں تمہاری جان بخشی کر رہا ہوں لیکن تمہارے لیے سزا بھی ضروری ہے اور میں نے اس کا تعین کر لیا ہے۔ اب تمہیں اپنے آپ کی کوشش کی تو گولی تمہارے حلق میں اتر جائے گی۔“

میکلاونس ہاتھ پکڑے بل کھا رہا تھا۔ ”چلو کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے کہا اور پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میکلاونس کی کراہیں بند ہو گئیں۔ برہنہ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ”اور

”تم..... تم شیطان کی طرح چلاک ہو۔“ میکلاونس کے منہ سے نکلا۔

”اور کچھ؟“

”میں اب واقعی تم سے سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری اس قدر اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں

”اور مجھے تمہارے اس قدر احمق ہونے کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ لیکن اب میرے پاس زیادہ وقت

”میں نے۔“ تمہارے پاس سے جانے کے بعد سیڈر سے بھی نمٹنا ہے۔ اب باپ ایڈلک سے میری کوئی دشمنی

”لیکن سیڈر نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کی تھی۔“

”اوہ۔ اس نے میرے ایماء پر سب کچھ کیا تھا۔“ میکلاونس بے اختیار بولا۔

”تمہاری ہی وجہ سے وہ سزا بھی بھگتے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ میں نوین کے لیے یہ چاہتا

”کہ کسی بھی طرح تم ایک اچھے باپ بن جاؤ۔ مجھے علم ہے کہ تمہارے پاس کافی دولت ہے۔ بہترین ہے

”کہ اب اچھی زندگی اختیار کر لو۔“

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میکلاونس کو میرے

”پر میرے خوفناک ارادے نظر آ گئے تھے۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔“ ”تم..... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہیں ایک اچھا باپ بنانا چاہتا ہوں میکلا رنس!“

”کیا کو اس ہے؟“ میکلا رنس کی آواز میں خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ میکلا رنس نے جھانک کر دیکھا۔ لیکن میں اس کے بس کی چیز..... نہیں تھا۔ گھونسا ایک بار پھر اس کی پیٹ سے جاگا اور میکلا رنس بری طرح دیوار سے ٹکرایا۔

لیکن میں نے اسے پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے ایک زوردار جھکایا اور وہ فرش پر آگرا۔ میکلا رنس اپنی جیسی سخت کوششیں کر رہا تھا۔ تن و توش میں بھی وہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا لیکن لڑائی بھڑائی میں ماہر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اس کے سینے پر ایک زوردار گھونسا جڑا اور پھر اسے زور سے رگڑتا ہوا دور تک لے گیا۔ میں نے میکلا رنس کو اونڈھا کر دیا تھا لیکن خوبی اس کی یہ تھی کہ اس نے چپخنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے دو تین گھونسے اس کے جمائے اور وہ بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ تب میں نے اس کے دونوں ہاتھ اس کی پٹنی ہوئی قمیص سے باندھ کر اس کی پشت پر جمادیے۔ اس دوران میکلا رنس اپنے ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا تھا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

دونوں ہاتھ کسنے کے بعد میں نے اسے سیدھا کر دیا۔ میکلا رنس بری طرح چل رہا تھا۔ تب میں نے ایک اور کپڑا اس کے بستر سے اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اور میکلا رنس کی آنکھوں کی طرف چل پڑا۔ خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اچھے خاصے تن و توش کا آدمی اس قدر چوہا ثابت ہو گا لیکن ہر صورت مجھے زیر کرنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی تھی۔

تب میں اس کے پیروں کے نزدیک پہنچ گیا اور میں نے اس کا ایک پاؤں اپنے ہاتھوں میں دبایا۔ اپنے پاؤں میں نے اس کے گھٹنے پر رکھ دیا اور اس کے بعد میں نے اس کے پاؤں کو اندر کی طرف ایک زوردار جھکایا دیا۔ میکلا رنس بری طرح تڑپنے اور پھلنے لگا تھا لیکن دوسرے جھکے سے اس کے پاؤں کی ہڈی نکل گئی اور پاؤں لٹک گیا۔ میکلا رنس مائی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

لیکن ایک بار پھر میں نے اسے قابو میں کیا اس کے ہاتھ کھلتے جا رہے تھے۔ دوسرے لمحے ایک بار پھر میں نے اسے دیوچ کیا اور میری اس حرکت نے اس کے دوسرے پاؤں کو بھی بے کار کر دیا۔ میکلا رنس کی آنکھیں پھٹ گئیں تھیں پھر وہ بے ہوش..... ہو گیا لیکن بے ہوشی کے عالم میں بھی وہ برح طرح تڑپ رہا تھا۔

”اب تم بلاشبہ ایک اچھے باپ بن جاؤ گے میکلا رنس! تمہارے یہ پاؤں آپریشن کے بعد بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے کیونکہ انکی دونوں ہڈیوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے۔“ میں نے بھاری آواز میں کہا اور اس کے بعد یہاں میرا کوئی کام نہیں تھا چنانچہ میں ست رفتاری سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اپنی دانست میں

میں نے میکلا رنس کو جو سزا دینا چاہی تھی دے دی تھی۔ اور اب میرا دوسرا شکار سیڈر تھا۔ سیڈر کو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس تھوڑی سی سزا اس کے لیے کافی تھی۔ میں عمارت سے باہر نکل آیا۔ اب میرے ہتھول بھی تھا۔ ویسے اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ جوڈین میری تلاش میں ہے۔ یہ شخص کافی خطرناک تھا۔ اس کے بارے میں مجھے علم تھا۔ چنانچہ فی الوقت میں اس سے بھی نہیں بھڑتا چاہتا تھا۔

میں اس جگہ پہنچا جہاں اصطبل تھا۔ اس وقت لینڈ روور پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ جانے اس کو کتنا پٹرول ہو۔ اس لیے میں نے اصطبل سے ایک گھوڑا کھولا۔ زین وغیرہ کا موقع نہیں تھا اس لیے میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گو سواری بڑی خطرناک تھی لیکن میں خود سے مطمئن تھا۔ گھوڑے نے جس وقت لکڑی کا پھانک پھلانا تو چوکیدار دیکھتا رہ گیا۔ میرے پیچھے اس نے شور مچانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اتنی دیر میں میں کافی دور نکل آیا۔ اور پھر میں نے گھوڑا قصبہ گراس میڑ کی طرف موڑ دیا۔

رات اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی۔ ستارے بے نور ہونے لگے تھے۔ جب میں گراس میڑ میں پہنچا تو سارا قصبہ گہری نیند سو رہا تھا کہیں کہیں آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔

بہر حال ایک مناسب مقام پر میں نے گھوڑا چھوڑ دیا اور اسے مار کر دور بھاگ دیا۔ پھر میں ایڈلک کے مکان کی طرف چل پڑا۔

مکان کی تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا جس وقت میں چوروں کے انداز میں مکان میں داخل ہوا، یعنی پھونٹنے لگی تھی۔ لیکن مکان کے ملازم وغیرہ ابھی نہیں جاگے تھے۔ ایک راہداری میں سوئے ہوئے ہم کو میں نے ٹھوکر مار کر جگایا اور اس کے چپخنے سے قبل ہی اس کا منہ دبا دیا۔

”آواز نکلی تو گردن دبا دوں گا۔ سیڈر کا کمرہ کونسا ہے؟“ میں نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ملازم کا پیشاب خطا ہوا جا رہا تھا۔ سوتے سے جاگا تھا۔ اس لیے اعصاب بے حال تھے۔ پہلے وہ پٹنی کی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ میرا سوال شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن جب دوسری بار میں نے اسے سیڈر کے کمرے کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے ہوتی جا رہی تھیں۔

لیکن میں نے اس کی مشکل حل کر دی۔ گردن کے مخصوص حصوں پر دباؤ ڈال کر میں نے اسے بے حس کر دیا تھا اور اس کے بعد آہستگی سے اسے زمین پر لٹا کر میں سیڈر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جس کمرے کی طرف ملازم نے اشارہ کیا تھا اس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔

کمرے کے دروازے کے اوپری حصے میں دو شفاف شیشے لگے ہوئے تھے جن سے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا لیکن اس وقت پردہ ایک طرف سرکا ہوا تھا جس کی وجہ سے شیشے کے دوسرے

جانب دیکھا جاسکتا تھا۔ گویا یہ آسانی بھی موجود تھی اور مجھے خود پر رشک آنے لگا۔

میں نے جھانک کر دیکھا اور خوش ہو گیا۔ سیڈر سامنے ہی مسری پر بے سدھ سو رہا تھا۔

دوسرے لمحے میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا، میرا خیال تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہوگا۔

صورت میں مجھے شیشہ توڑنا پڑے گا۔

لیکن بعض معاملات میں میری خوش قسمتی اور دوسرے کی بد قسمتی بڑا تعاون کرتی ہے۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا اور میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا، یہ ضروری

حالات تک یہ صورت حال خطرناک بھی تھی، اگر سیڈر چیخ پڑتا تو اس عمارت کی صورت حال مجھے معلوم

تھی اور نہ ہی میں نے ایسے وقت میں فرار ہونے کے لیے راستے کا تعین کیا تھا، چنانچہ اس بات کا خاص طور

خیال رکھنا تھا کہ وہ چیخنے نہ پائے۔

چند ساعت کے بعد میں اس کے سر پر تھا۔ سیڈر کو میرے آنے کی بالکل خبر نہ ہوئی تھی۔ میں

اوپر اُدھر دیکھا اور اپنے مطلب کی چند چیزوں کا انتخاب کر لیا اور پھر میں نے سیڈر کے سینے پر اپنے گھونے

ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

سیڈر نے ہلکی سی آواز نکالی اور کروٹ بدلنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے چپ کر دیا تھا۔

اس جارحانہ دباؤ پر سیڈر نے آنکھیں کھول دیں۔ چند ساعت وہ پلکیں جھپکاتا رہا، پھر اس نے

کی کوشش کی لیکن دوسرے لمحے میں نے اسفنج کا ایک چھوٹا سا ٹکڑیہ اس کے منہ پر رکھ کر دبا دیا جسے میں

بھی دوسرے ہاتھ میں پکڑ چکا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ سیڈر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ تب میں

غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سیڈر! مجھے پہچانو۔ اور یہ بات جان لو کہ اگر چیخنے کی کوشش کی تو یہ چیخ تمہاری آخری چیخ ہوگی۔“

سیڈر جس قدر نظر آ رہا تھا اتنا دلیر نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے آثار صاف دیکھے جاسکتے

تھے۔ پھر اس نے سسمی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں نے ایک بار پھر غرا کر کہا۔

”پہچان گئے مجھے؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے پوچھا اور اس نے گردن ہلا دی۔

”سوچ لو۔ اگر چیخنے کی کوشش کی تو گردن دبا کر ہلاک کر دوں گا۔“ میں نے ٹکیہ اس کے منہ پر

ہٹا لیا۔ سیڈر کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے تھے اس میں شاید ہلنے جلنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی۔ وہ بالکل

جان نظر آ رہا تھا۔

”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا سیڈر! تم نے مجھے دوست کی حیثیت سے جزیروں تک پہنچایا تھا۔

بولو کیا میں درست نہیں کہہ رہا اور اس کے بعد تمہارے باپ نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی لیکن سیڈر

تمہارا باپ میکلا رنس کے زیر اثر ہے اور اس نے عملی طور پر اس سلسلے میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اس

لیے میں نے اسے معاف کر دیا البتہ میں تمہیں معاف کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”مم۔۔۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے مشرمیکلا رنس نے اس کام کے لیے تیار کیا تھا۔

”کیوں اس بند کرو۔“ میکلا رنس کو اس کی اس حرکت کی سزا دی جا چکی ہے۔ اب وہ ہمیشہ

لیے معذور ہو چکا ہے اور تم یقین کرو میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔“

”مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ تم یقین کرو میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ

طرح خوفزدہ ہو گیا تھا جبکہ میکلا رنس نے کم از کم مقابلہ کرنے کی کوشش تو کی تھی۔“

”سیڈر میں اتنی مشکلات سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہوں تمہیں معاف کرنے کے لیے نہیں

سزا دینے کے لیے اور بہر حال سزا تو تمہیں بھگتنا ہی ہوگی۔“ میں نے کہا اور سیڈر کا بدن بری طرح کانپنے لگا

یہ صورت حال زیادہ خوشگوار نہیں تھی۔ اگر وہ مجھ سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو جیسے

میرے ذہن میں تھا تو شاید اسے تکلیف دینے میں زیادہ لطف آتا لیکن اب اگر اس بے بس انسان کو

نقصان پہنچا دوں تو یہ۔ بڑی عجیب بات ہوگی، مجھے اس میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ تب میں نے اس کا گریبان

کرا سے اٹھانے کی کوشش کی۔ ”مردوں کی طرح مقابلہ کرو سیڈر یہ کیا بزدلوں کی طرح کانپنے لگے۔“

نے حقارت سے کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں تم سے مقابلہ کر کے دیکھ چکا ہوں۔ میں ہر لحاظ سے تم سے کمزور ہوں۔“ سیڈر

کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اور اس کے باوجود تم نے مکاری سے کام لیا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تم سے بدلہ بھی

ہوں؟“

”مم۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ صرف ایک بار معاف کر دو۔“ سیڈر نے کہا اور میرا موڈ بالکل ہی

ہو گیا۔

بھلا اس چوہے کو مارنے سے کیا فائدہ۔ یہاں تک آنے کی تمام محنت اکارت ہو گئی تھی، کیونکہ

تو میرا موڈ ہی بدل گیا تھا۔ میں نے ایک زوردار ہاتھ اس کی کٹہی پر رسید کیا اور سیڈر بے ہوش ہو گیا

ہاتھ اس کے لیے کافی ثابت ہوا تھا۔

”لعنت ہے۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور وہاں سے۔۔۔۔۔ پلٹ پڑا۔ یہاں آنے کی تمام

بے کار ہو گئی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے۔۔۔۔۔ وقت ضائع کیا ہے۔

بہر صورت اب اگر اس میز میں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ پو پھٹ چکی تھی اور صبح کی

آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ میں اگر اس میز کے قصبے کے اس حصے میں آ گیا جو اس قصبے کا شاید آخر

تھا۔ میرا گھوڑا بھاگ چکا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ سوچا تو یہ تھا کہ یہ سیڈر

اس طرح اذیت دوں گا اور چھوڑ دوں گا لیکن سیڈر نے تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی کوشش نہ کی تھی

کسی آدمی کو مارنا میرے بس سے باہر تھا۔ اب وہ بات تو گزر چکی تھی۔ میں اپنے آئندہ اقدام کے بار

سوچ رہا تھا۔
میک ڈسٹرکٹ کا گراس میز اب میرے لیے کوئی دلکشی نہیں رکھتا تھا۔ یہاں میں کسی منصوبے کے تحت نہیں آیا تھا۔ بس اتفاقات نے ایک کہانی کو جنم دیا تھا اور اب وہ کہانی ختم ہو گئی تھی۔ یہاں میرے تین دشمن بن گئے تھے۔ میک لارنس، جوڈین اور ایڈلک یا سڈر۔ اس کے بعد یہاں رہنے کی کیا گنجائش تھی۔

اور یوں بھی اب مزید قیام میرے لیے ناممکن تھا۔ چنانچہ صبح کلاب میں نے گراس میز چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ بد نما گھاس اور سرکنڈوں کے جھنڈ کے درمیان پچھی ہوئی سڑک پر میں آوارہ زمانہ انسان کی حیثیت چل پڑا۔ سرکنڈوں کے جھنڈ میں مینڈکوں کی آوازیں میرے قدموں کی آواز سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔

نہ جانے کب تک میں چلتا رہا۔ سڑک کبھی نہ ختم ہوگی اور میں چلتا رہوں گا۔ پھر تھک جاؤں گا۔ کیوں نہ کہیں بیٹھ جاؤں مگر کہاں اور کون سے سائبان کے نیچے۔ میرے لیے تو چھت نہیں بنی تھی۔ کتنی بے مقصد زندگی ہے۔ میں ہارا ہوا انسان ہوں، کیوں نہ ماں کی طرف لوٹ جاؤں، اس کے قدموں سے لپٹ جاؤں، اس پر آنکھیں رگڑوں اور کہوں، ماں اب تو آغوش میں لے لے۔ کیا تو اپنے تھکے ہوئے بیٹے کو اب بھی قبول نہیں کرے گی۔ میں تھک گیا ہوں میری ماں۔

اور دل میں ایک گولا سا اٹھل۔ احساس بھی نہ ہو سکا کہ دل بہہ رہا ہے۔ آنکھوں میں دھندلاہٹیں آکر آئیں تو رخساروں کے بھیگنے کا پتہ چلا۔ تب آنکھوں کو خشک کیا اور کئی بار بند کر کے کھولا تو دور ایک دھبہ سا نظر آیا۔

نہ جانے آنکھوں کا قصور تھا یا واہمہ۔ دھبہ سڑک کے پچوں بچ تھا۔ غور سے دیکھا ہوا آگے بڑھتا رہا اور اب دودھ بے ہو گئے تھے۔ ایک ساکت، ایک متحرک۔ منظر کچھ اور واضح ہوا اور اب میں نے صاف طور سے دیکھا۔ ایک کار تھی اور ایک انسان۔ شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ کیونکہ کار سڑک پر الٹی پڑی تھی۔ میں نے رفتار تیز کر دی اور آہستہ آہستہ سڑک سکر نے لگی۔ الٹی ہوئی کار اب صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے پیہرے آسمان کی جانب تھے اور دیو قامت آدمی اس کے نزدیک کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے بال تقریباً ایک گز لمبے تھے، انتہائی خوبصورت اور گھنے چہرے پر اگر ڈاڑھی اور مونچھیں نہ ہوتیں تو ان بالوں سے کی وجہ سے اسے ایک نیم خیم عورت سمجھا جاسکتا تھا۔ خدوخل انتہائی جاذب نگاہ تھے لیکن ان پر ایک خشونت طاری تھی، آنکھیں بڑی لیکن انگاروں کی مانند سرخ تھیں۔

بہر حال اسے ایک عجیب الخلقت آدمی بلکہ دیو کہا جاسکتا تھا۔ اوپری بدن پر چڑے کی چست جیکٹ منڈھی ہوئی تھی جس کے..... گلے میں بٹن ضرور ہوں گے لیکن انہیں نکال کر ان میں تیسے باندھ دیے گئے تھے اور سامنے سے آدھا سینہ کھلا ہوا تھا جس سے لمبے لمبے بال جھانک رہے تھے۔ نچلے بدن پر بھی کسی اور کی

کون تھی۔ اگر انتہائی موٹے اور مضبوط زین کی نہ ہوتی تو اب تک پھٹ چکی ہوتی۔
وہ جیکسی لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ تب میں اس کے قریب پہنچ گیا لیکن مجھے کار کے الٹ جانے پر حیرت تھی۔ اس میں کوئی ٹوٹ پھوٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح الٹ جانے کا سبب نہیں پتہ چلتا تھا۔
”کیا ہوا..... کیا ہو گیا مسٹر؟“ میں نے کار میں جھانکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”آپ اس کار میں تھما تھے؟“ میں نے پھر پوچھا۔
”نہیں۔ میرے ساتھ ایک نوجوان حسینہ بھی تھی اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں اس کی آغوش میں سر رکھ کر سو گیا تھا۔ اس نے بڑی نرمی اور ملائمت سے کہا۔“

”اوہ، تو وہ کہاں ہے؟“
”گردن ٹوٹ گئی تھی اس کی۔ بالکل ہی بے کار ہو گئی تھی۔ میں اسے اٹھا کر سرکنڈوں کے جھنڈ میں پھینک آیا۔“ اس نے جواب دیا۔ لیکن اس کی آواز میں غم کا کوئی عنصر نہیں تھا۔ میں تعجب سے اس صورت دیکھنے لگا۔

یہ شخص نہ صرف شکل و صورت سے عجیب تھا بلکہ اپنی باتوں میں بھی عجیب تھا۔ اس انداز میں اس لڑکی کا تذکرہ کر رہا تھا جیسے کہ کوئی بڑا ہی عمدہ کام انجام دے آیا ہو اور اس سلسلے میں اسے ذرا بھی افسوس نہ ہو۔

وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا، اس کی آنکھوں سے کھا جانے والی کیفیت عیاں تھی، پھر اس نے حیرت لہجے میں کہا۔

”تم کون ہو؟“
”کوئی نہیں بھائی! بس ایک مسافر ہوں۔ سفر کر رہا تھا کہ دور سے تمہاری کار نظر آئی، مجھے حلوٹے کا افسوس ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”حلوٹہ.....!“ وہ دانت پیس کر بولا۔ اس کے انداز میں ہلکی سی غراہٹ نمایاں ہو گئی۔
”کیوں۔ کیا یہ حلوٹہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ وہ حلق پھاڑ کر چلایا اور میں تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔
لیکن بہر حال میں بھی راجہ نواز اصغر ہوں، کسی کے حلق پھاڑ دینے سے کبھی نہیں ڈرتا، چنانچہ نے اسی ساوہ لہجے میں سوال کیا۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر یہ کار الٹی کیسے، جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے سا حلوٹہ نہیں ہوا؟“

”اسے میں نے لٹا ہے، میں نے،“ سمجھے؟“ وہ خوفناک آواز میں غرایا۔ اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ یا تو وہ پاگل تھا یا پھر نشے میں بہکا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر تم میری موجودگی کو برا محسوس کر رہے ہو تو میں آگے بڑھ جاتا ہوں۔“

”نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر تم سوالات ہی اس قسم کے کر رہے ہو۔“

”میرا خیال ہے میں نے صرف اخلاقی سوالات کیے ہیں اس پر تمہیں کیوں..... اعتراض ہے؟“

میں نے پوچھا۔

”اعتراض..... یہ ساری چیزیں غلط ہیں، سب کچھ غلط ہے، کم بخت گدھے، الو کے پٹھے۔“ وہ خود بخود گالیاں بکنے لگا اور میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”خراب ہو گئی تھی۔ یہ خراب ہو گئی تھی۔ بھلا تم ہی بتاؤ، کل ہی خریدی ہے۔ جتنے پیسے تھے اتنے ہی کی تو خرید سکتا تھا زیادہ کہاں سے لانا لیکن بگڑ گئی، آج بگڑ گئی کم بخت کہیں کی۔“

”کیا بگڑ گئی؟“ میں نے پوچھا۔

”کار۔“ وہ زور سے چیخا۔

”اوہ۔ تو مگر خراب ہو کر یہ الٹ کیسے گئی؟“

”خود الٹی ہے میں نے۔“

”تم نے!“ میں نے متحیرانہ انداز میں آنکھیں پھاڑ دیں۔

”ہاں، ہاں میں نے۔“

”لہلہ..... لیکن تم نے.....“

”تو کیا شک ہے تمہیں؟“

”شک تو نہیں کر سکتا مگر.....“

”مگر..... تمہیں شک اس بات پر۔ لو یہ دیکھو۔“

وہ دوبارہ کار کی طرف بڑھا اس نے کار کے پچھلے حصے پر اپنے دونوں ہاتھ جمائے اور میں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔

الٹی ہوئی کار پھر سے سیدھی ہو گئی تھی، اس نے کئی مرتبہ زمین پر دھکے کھائے اور پھر رک گئی۔ میں متحیرانہ انداز میں اس دیو ہیکل شخص کی طاقت کے بارے میں سوچ رہا تھا اور بات کسی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ لڑکی وڑکی کا کوئی وجود نہیں تھا، کار خراب ہو گئی تھی اور اس نے جھلاہٹ میں اپنی بے پناہ قوت سے کام لے کر الٹ دیا تھا۔ کار کی چھت اٹنے سے چپک گئی تھی اور اب وہ کمرے پر دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھور رہا تھا۔

”اب کیا خیال ہے؟“

”بالکل ٹھیک لیکن اس میں خرابی کیا ہو گئی تھی؟“

”یہ مجھے معلوم ہوتا تو ٹھیک نہ کر لیتا اسے۔ میں تو اب اسے اٹھا کر سرکنڈوں میں پھینکنے جا رہا۔“

اس نے کہا اور میں نے دل ہی دل میں ایک گہری سانس لی۔ خیر تم اس کار کو اٹھاؤ نہ سکو گے، میں

لیکن یہ بات کیا کم تھی کہ اس نے کار کو الٹ دیا تھا اور یہ کسی معمولی طاقت کے آدمی کے بس کی تھی۔ ہر صورت میں اسے ٹھنڈا کرنے کے بارے میں غور کرنے لگا۔

یہ آدمی مجھے خاصا دلچسپ معلوم ہوا تھا، جھلاہٹ میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ لیکن خوبی اس کی یہ تھی کہ اس سے ممتاز اور طاقتور تھا، اتنا طاقتور تھا جتنا کہ اس مشینی دور میں عام طور پر تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اب بتاؤ کیا کروں؟ ساری زندگی کسی سے مدد نہیں لی، اس لیے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ بد بخت کو تم

لو۔“ اس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے کار کو اشارت کرنے کی کوشش کی۔ سلف پکڑ رہی تھی لیکن اشارت نہیں ہو رہی تھی۔

میری بیوڑ میں کوئی خرابی تھی۔ چنانچہ میں نیچے اتر آیا۔ بونٹ کھولا اور ڈسٹر بیوڑ کیپ اتارنے لگا۔ کیپ پوائنٹ کے تار بٹے ہوئے تھے۔ بڑی معمولی سی بات تھی۔ کار پر اسے ماڈل کی ضرورت تھی لیکن انجن

موت ہوتا تھا۔

چنانچہ میں نے اس سے کپڑا مانگا اور اس نے کار کی چھوٹی سی اسٹپنی سے ایک رومل نکال کر میرے

ہاتھ میں دیا۔ اس رومل سے میں نے پوائنٹ صاف کیا۔ تار جوڑے اور ڈسٹر بیوڑ کیپ بند کر دیا۔ اس

کار میں نے اسے اشارہ کیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اشارت کرو۔“

”مذاق اڑا رہے ہو؟“ اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

”نہیں میری جان! بالکل مذاق نہیں اڑا رہا۔ تم ذرا کوشش تو کرو۔“

”میں نہیں کروں گا۔ اب اگر یہ اشارت نہ ہوئی تو میں اس کا شیشہ ویشہ سب توڑ دوں گا۔“ اس

نہ ہلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ انداز بالکل بچوں کا تھا۔

میں نے ہنس کر گردن ہلائی اور..... خود ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس بار سیلف لگایا تو کار اشارت

میں نے اسے نمایاں طور پر چوکتے دیکھا تھا۔

”ارے..... ارے۔“ وہ میری جانب جھک آیا۔ ”اب اگر تم کو تو میں اسے لے کر اڑ جاؤں؟“

میں نے پوچھا۔

”اڑ جاؤ یا!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے اسے خرید کیوں لیا؟“

”میں نے بتایا نامحلت ہو گئی۔ بعض اوقات میں سک جاتا ہوں۔ تم یقین کرو ذرا بھی نشے میں نہیں تھا مگر بس چوٹ دے گئے۔“

”کون چوٹ دے گئے؟“

”وہ جن کی یہ کار تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”بس کہنے لگے کہ پریشان حل ہیں، اگر میں چاہوں تو ان کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے پوچھا کس طرح تو انہوں نے کہا کہ میں یہ کار خرید لوں اور پھر جو کچھ میری جیب میں تھا میں نے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ مجھے کار کا کیا کرنا ہے، ارے ڈوور تک ہی تو جانا تھا، اس کے بعد یہ میرے لیے بے مصرف ہو گئی۔“

”اوہو۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم ڈوور جا رہے ہو؟“

”ہاں۔ وہاں سے فرانس کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میرے دوسرے ساتھی فرانس میں ہی ہیں۔“ ڈوڈو نے جواب دیا۔

”اوہ تمہارے ساتھی فرانس میں ہیں؟“

”ہاں، پیرس میں۔“ وہ بولا۔ اب اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔ اور اگر واقعی اس کا لہجہ نرم ہوتا تو وہ برا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

چند ساعت خاموشی سے گزرے پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”ارے ہاں۔ تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں۔“

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ اسے اپنا صحیح نام بتا دوں مگر پھر میں نے سوچا۔ اس کی لائن دوسری ہے ممکن ہے نواز اصغر بھی اس کے لیے اجنبی نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اسے اپنا نام پکارتایا۔

”خوب مسٹر پیکر! آپ کہاں جا رہے تھے اور آپ کا جغرافیہ کیا ہے؟“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”میں بھی پیرس ہی جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”واقعی؟“ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”ارے بس یونہی سوچ رہا تھا کہ کوئی تو ساتھی ہو جس کے ساتھ پیرس جایا جائے۔ حالانکہ سفر زیادہ طویل نہیں ہے لیکن میں ساتھیوں کا شوقین ہوں۔ ہمیشہ کسی نہ کسی کو ساتھ رکھتا ہوں، اس وقت بھی اگر تنہا نہ ہوتا تو میرا سفر ضرورت سے زیادہ خوشگوار ثابت ہوتا۔“

میری طرح۔ مجھے بھی ساتھیوں کا بے پناہ شوق ہے، اس شوق میں مجھے کچھ بھی نہ ملے تو پرواہ کیونکر؟ یہ مسٹر پیکر! آپ کے مشاغل کیا ہیں؟“

”صاف ظاہر ہے ڈوڈو! میں سیاح ہوں۔“

”وہ بہت سارے ممالک کی سیر کی ہوگی؟“

”ہاں۔ بیشتر۔“

”سیاحت بہت اچھا مشغلہ ہے مسٹر پیکر! میں بھی کئمنڈو سے آرہا ہوں۔“

”اوہو کئمنڈو سے آرہے ہو؟“

”ہاں۔“

”پھر کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”جنوبی امریکہ۔ ظاہر ہے ہمارے سفر کی یہی ایک پگڈنڈی ہوتی ہے۔“

”تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“

”اپنی آدمی ہیں۔ تم ایک طرح سے پورا کردہ سمجھ لو۔ ہم سب کئمنڈو کی زیارت کر کے آرہے ہیں۔“

”جگہ ہے۔“ حشیش کی جنت۔ ”ڈوڈو نے مست انداز میں آنکھیں بھیچیں اور گاڑی سڑک پر لہرا لہرا کرتے ہوئے ایک دم سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا تھا لیکن نہ جانے کیوں گاڑی سے اچانک پھرچوں چوں کی آواز آئی۔“

”کیا ہوا؟“

”نہیں، کچھ نہیں چلتے رہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”کچھ دیر پریشان رہا، پھر اس کے بعد صحیح ہو گیا۔ لیکن اس کی بد قسمتی تھی کہ لٹک سڑتک پہنچنے کے لیے ایسی جگہ نہ ملی جہاں ہم کھانا کھا سکتے۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈوڈو مرجھاتا جا رہا ہے اور جب ہم اس نے میرا بازو پکڑ کر بڑے ہلچلی انداز میں کہا۔

”دوست! پہلے مجھے کھانا کھلا دو، ورنہ میں مرجاؤں گا۔“ اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا تھا۔

”ضرور ضرور۔ آؤ گاڑی یہیں روک دو۔“ میں نے کہا اور نگاہیں چاروں طرف گھمانے لگا۔

بھر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ہم داخل ہو گئے اور سب سے پہلے میں نے ڈوڈو کے پیٹ کا ڈوڈو نے کھانے کے بعد کئی بڑی بڑی ڈکاریں لیں۔ ویسے کھانا اس نے جس انداز میں کھایا تھا، صرف میں بلکہ ہوٹل میں موجود دوسرے لوگ بھی حیران تھے۔ بڑا ہی خوش خوراک آدمی تھا اور

کی جسامت بھی ویسی ہی تھی۔

”نے سے فارغ ہو کر وہ دیر تک کرسی سے ٹکا رہا، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور میں اس کے رہا تھا۔“

بڑی نرمی تھی اس کے چہرے پر۔ سیدھا سادا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ زیادہ فریبی نہیں، ورنہ اس کی حرکات کا شکار نہ ہوتا۔ ویسے کارا لٹنے پلٹنے کا واقعہ مجھے اب بھی یاد تھا اور اس سے اس کی بے پناہ قوت اندازہ ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ ہوٹل سے واپس آ گئے۔

”اب کیا پروگرام ہے دوست!“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”تم بتاؤ ڈوڈو! کیا انکاسٹر میں رکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ضروری تو نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”بس یہاں سے لندن چلتے ہیں۔“

”اسی کار کے ذریعے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”ڈوڈو میرا کچھ اور مشورہ ہے۔“

”کیا؟“

”یہ کار لندن تک ہمارا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ مجھے اس کے کل پر زوں میں گڑبڑ نظر آ

ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو دوست؟“

”ہاں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”بہتر یہی ہے کہ تم اسے یہیں کہیں فروخت کر دو۔ جو کچھ بھی مل جائے بہتر ہے۔“

”اوہ لیکن کیا اس کا فروخت ہونا آسان ہوگا؟“

”کوشش کرتے ہیں اور ہر صورت اس سے بچھا تو چھڑانا ہی ہے، ورنہ اگر اس سے سفر کر

ٹھانی تو ممکن ہے ہمیں لندن تک پہنچنے پہنچے ہفتوں لگ جائیں۔“

”بات تو ٹھیک ہے پیکر! اور اب تو میں خود بھی اس سے عاجز ہو گیا ہوں اور اب تو اس کی چھت

پچک گئی ہے۔ اسے تو اب کوئی کباڑی ہی خریدے گا۔“

اور پھر ہم نے انکاسٹر کی سڑکوں پر گھوم کر ایسے کباڑی کی تلاش شروع کر دی جو پرانی کاریں

ہو۔ یہاں اس قسم کا کاروبار کوئی ایسی حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن ہر صورت ڈوڈو کو ایک ایسا شخص مل

جس نے اس کار کی بہت تھوڑی سی قیمت لگائی تھی۔ ڈوڈو نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلا دیے۔

”نکالو۔ نکالو۔“ اور اس شخص نے کچھ رقم ڈوڈو کے حوالے کر دی۔ ڈوڈو نے کار کی چابی اس

حوالے کر دی۔

بڑی سستی فروخت کر دی تم نے ڈوڈو! میں نے سوال کیا۔

”میرے دوست پیکر! میں کبھی بھی کسی گزری ہوئی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا۔“

”خریدی کتنے کی تھی؟“

”اس سے چھ گناہ زیادہ رقم کی۔“

”اور اب.....“

”بس بس ٹھیک ہے اس سے جان چھڑانا تھی سو چھڑا لی۔ اور اب جیب میں اچھی خاصی رقم موجود

”وہ مست انداز میں بولا اور ہم آگے بڑھ گئے۔“

کار سے بچھا چھڑا لیا گیا تھا۔ پھر ہم اسٹیشن پہنچ گئے اور ایکسپریس گاڑی میں سوار ہو گئے۔

ڈوڈو واقعی ایک مست آدمی تھا۔ راستے بھر نہ جانے مجھ سے کہاں کہاں کی باتیں کرتا رہا۔ نشہ آور

کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں کے بارے میں بتاتا رہا۔

”تمہیں معلوم ہے میرا چیف کون ہے؟“ ڈوڈو نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”اس کا نام جینگو ہے۔ پیرس کی حسین لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن۔ ارے میں تمہیں کیا

پتہ ہے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ ایک دفعہ وہ پیرس کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ بے شمار

لڑکیاں سڑک پر لیٹ گئیں کہ وہ ان کے سینوں پر سے پاؤں رکھتا ہوا گزرے۔“

”واہ۔“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اچھا گپ باز معلوم ہوتا تھا۔ ”پھر جینگو نے کیا کیا؟“

”جینگو نے راستہ ہی بدل دیا۔ وہ اپنے پیروں کو بھی لڑکیوں کے جسموں سے نجس کرنا نہیں

”پر آخر وہ ہے کون؟“

”گویا۔ ایسا خوبصورت گویا جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ وہ گٹار بجاتا ہے تو زمین و

گردش رک جاتی ہے۔ بس تم بھی سنو گے تو ہمیشہ کے لیے اس کے غلام بن جاؤ گے۔“

”بہت خوب۔“ میں نے دلچسپی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”پیرس میں۔ وہیں تو میں جا رہا ہوں۔ اصل میں پہلے میں پیرس ہی میں تھا لیکن اس کے بعد جینگو

ایک کام سے یہاں بھیجا۔ یہاں آکر میں خاصے دن خوار پھرنا رہا اور پھر میں نے جینگو کا وہ کام کر دیا۔

واپس نہ پہنچ سکا۔ اور اس کے بعد یہ حماقت ہو گئی۔ بس میں یہی حماقتیں تو کرتا رہتا ہوں اور میرا

کہ میں جتنا لبا ترنگا ہوں اتنا ہی احمق بھی ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سی

تھکت سی

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ڈوڈو جینگو سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ ہر صورت پھر میں نے اسے خوش

کرنے کے لیے جینگو کے بارے میں بے شمار سوال کیے اور نوبت وہیں تک پہنچ گئی۔ یعنی جینگو بھی زخام تھا اور کسمٹھنڈو کا سفر کرنے کے بعد ترلوکا کے پاس واپس جا رہا تھا۔

ٹرین کا سفر جاری رہا۔ ڈوڈو بلاشبہ ایک اچھا ساتھی تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ اس کے کچھ وقت گزارا جائے۔ اس کے ساتھی جینگو کو بھی دیکھا جائے۔ کہ وہ کیسا گویا ہے۔

”پیرس میں کہاں قیام کرو گے؟“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”پہلی بار جا رہا ہوں، کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کر لوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر ہمارے ساتھ ہی قیام کرو۔ میں جینگو سے تمہاری سفارش کروں گا۔ اسے کوئی تکلیف

ہوگی۔۔۔۔۔ وہ لمبے ہاتھ والا ہے۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“ میں نے اس کی پیشکش قبول کر لی۔

”جینگو شمشادہ ہے۔ ایک بار جو اس سے گفتگو کر لیتا ہے پھر وہ جینگو کو نہیں بھولتا۔ پیرس کے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں اس پر جان چھڑکتی ہیں لیکن جینگو جسے چاہے اپنی قربت بخش دے۔“

”وہ لڑکیوں کو قرب بخشتا ہے؟“

”شکوہ نادر۔ اگر کوئی اسے پسند آجائے۔“

”ملی وسائل کیا ہیں اس کے؟“

”ارے اسے کیا ضرورت ہے۔ ایک اشارہ کر دے تو دولت کے ڈھیر لگ جائیں۔“

یہاں تک دولت لٹاتا پہنچا ہے۔ بے شمار سیاح اور نروان کے متلاشی اس کے مرید ہیں اور اس کے سر ہاتھ ملتے ہیں۔“

”خوب۔ گویا وہ ترلوکا کا ہم عصر ہے۔“

”ترلوکا؟“ ڈوڈو چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے آثار نظر آرہے تھے۔ ”تم نے ترلوکا

بڑی بے ادبی سے لیا ہے لیکن تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”میں اس شخص سے اچھی طرح واقف ہوں جس کا وہ پیروکار ہے۔“

”تب تمہیں یہ بھی جانا چاہیے کہ اس کے پیروکار اسے بہت مانتے ہیں اور اس کا نام بے ادبی

نہیں سن سکتے۔“

”تم بھی اس کے پیروکار ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”دل و جان سے۔ اسی کے اشارے پر ہم نے یہ سفر کیا تھا اور اب اسی کے پاس واپس جا

ہیں۔“

”اوہ۔ تم تو ترلوکا کے پاس جا رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اور جینگو بھی ترلوکا کا مرید ہے؟“

”ہاں، وہ ترلوکا کی تعلیمات کا پرچار کرتا ہے۔ ہم نے کسمٹھنڈو کے سفر کے دوران بے شمار مرید

سے۔“ ڈوڈو نے بڑی ہی عقیدت سے جواب دیا اور میں خاموش ہو گیا۔

میرے ذہن میں ترلوکا کے بارے میں بے شمار خیالات آرہے تھے۔ اس ہستی کا نام میں طویل

سے سن رہا تھا۔ کئی بار میرے ذہن میں اس کا خیال آیا تھا لیکن کوئی خاص بات نہیں سوچتی تھی میں

اس سے بھی ان لوگوں کی سنگ سمجھا تھا۔

”وہ عظیم ہے اور اس کی تعلیمات۔ واہ۔ جتنا سوچو ڈوبتے جاؤ۔ کبھی اس کے بارے میں جاننے کی

کرو۔“

”کروں گا۔“ میں نے کہا اور وہ خوش ہو گیا۔

”وعدہ کرتے ہو؟“

”ہاں۔ ضرور۔“

”تب تو کوئی مسئلہ ہی نہ رہا۔ اب میں خود تمہیں ترلوکا کے مہمانوں میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ جو

ترلوکا کی تعلیمات سے متاثر ہوتے ہیں، ہمارے مہمان ہوتے ہیں اور ہمارے لیے قاتل عزت۔“

میں خاموش ہی رہا۔ ڈوڈو حد سے زیادہ غلصہ ہو گیا تھا۔ بہر حال گاڑی و کٹوریہ اسٹیشن پہنچ گئی۔

میں دوسری گاڑی کے ذریعے ڈوڈو پر پہنچا تھا جہاں سے پیرس کے لیے اسٹیرل سکتا تھا۔

ڈوڈو نے خود ہی ٹکٹ وغیرہ خرید لیے اور پھر ڈوڈو کے لیے چل پڑے۔ اور بالآخر ایک دیو پیکل

میں لے کر پیرس کی بندرگاہ ڈنکرک کی جانب چل پڑا۔ اس پورے سفر میں رات ہو گئی تھی۔ انگلستان

چل پر ڈوڈو کی مشہور سفید چٹائیں صاف نظر آرہی تھیں۔ چٹانوں کے پہلو میں شہر کا قدیم قلعہ برقی

سے منور تھا۔

لندن کی کالی یادیں میرے ساتھ تھیں لیکن یادوں کا کیا یہ یادیں تو زندگی کے ہر لمحے کے ساتھ چٹی

س۔ گزری ہوئی داستانیں بے معنی ہوتی ہیں۔ بس آنے والا وقت ہی سب کچھ ہے۔

عرشہ سنسان پڑا تھا۔ مسافرات کی خنکی اور سمندر کی سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے اسٹیرل ٹپلی

س پہنچ گئے تھے۔ ڈوڈو بھی کچھ اداس نظر آ رہا تھا۔ بہت دیر سے اس نے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔

س کی جسامت قاتل دید تھی۔ بیٹھا ہوا تھا لیکن پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس نے جھانسی لی

ٹوک پڑا۔

”پکرا! اس نے مجھے آواز دی۔“

”ہوں۔“

”ان خنک ہواؤں میں بھی تمہیں خند آرہی ہے؟“

”نہیں۔ نہیں۔“

”او نگہ تو رہے ہو۔“

”تو پھر کیا کروں؟ تم بھی باتیں نہیں کر رہے۔“

”یار! میں کچھ سوچ رہا ہوں۔“ ڈوڈو نے پر خیال انداز میں کہا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا لیکن ڈوڈو نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور پھر جو کچھ

کہا۔

”کچھ پوچھ گئے؟“

”ہاں، اگر کافی مل جائے تو اس وقت عمدہ لگے گی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”لوہ۔“ ڈوڈو نے برا سامنہ بتایا۔ ”کافی بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔ اسٹیر کی فلی منزل میں شراب

کی۔ عمدہ شراب اور بہت سستی“ ڈوڈو فری۔ آہ۔ اس وقت سارے لوگ پی رہے ہوں گے۔“

”تم کیوں نہیں پی رہے؟“

”میں۔۔۔۔۔ میں دراصل یہی سوچ رہا تھا۔ میرے اندر ایک خرابی ہے ڈیئر پیکر!“ ڈوڈو نے افسردہ

میں کہا۔

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بمک جاتا ہوں۔“ وہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔

”پیتے بھی اپنی جسامت کے لحاظ سے ہو؟“

”لوہ نہیں، میرے دوست! یہی تو خرابی ہے۔ جس کے تمیں سگریٹ پلا دو ایک ساتھ۔ کوئی

نشہ ہو۔ اتنا کرا دو جتنا دس آدمی مل کر کرتے ہیں۔ لیکن شراب۔ نہ جانے کس کی بددعا ہے تھوڑی سی

لوں تو بمک جاتا ہوں۔“

”تمہیں تو سنبھالنا بھی مشکل ہو گا؟“

”مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے۔“ ڈوڈو نے کہا۔ ”ہاں، اگر تم ایک بات کا وعدہ کرو تو چلوں؟“

”جی، فرمائیے۔“

”جب میں چوتھا بیگ لوں تو بوتل اٹھا کر اوپر آ جانا اور مزید چند بیگ پلا کر میرے سر پر کوئی

دے مارنا مگر ضرب ایسی ہو کہ میں بے ہوش ہو جاؤں۔“ اس نے کہا اور مجھے ہنسی آ گئی۔

”سر پھٹ گیا تو؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”پھٹ جانے دو۔ اس موسم میں شراب نہ پینا بھی تو جرم ہے۔“ اس نے بدستور بھرائی ہوئی

میں کہا اور میں ہنستا رہا۔

تایاب چیز ملی تھی لیکن بہر حال ذہن سے جمود توڑنے کا باعث بنی تھی۔ میں دلچسپی محسوس کر رہا

س۔“ اس نے میرا بازو پکڑ کر اٹھا دیا اور میں اس کے ساتھ فلی منزل کی طرف جانے والی میڑھیوں کی

بل پڑا۔

میڑھیاں اتر کر ہم نیچے نیچے۔ درحقیقت قہوہ خانے کا ماحول برادھواں دھار تھا۔ انگریز اور فرانسیسی

مورتیں قہوہ خانے میں بھرے ہوئے تھے۔ دو کلاؤں پر تھے جن میں سے ایک میں شراب ملتی تھی اور

دوسری پر اسٹیک قسم کی چیزیں۔ لیکن قہوہ خانے کی ہر میز پر شراب نظر آ رہی تھی۔ جن لوگوں کو بیٹھنے کی

جگہ ملی تھی وہ کھڑے ہوئے ہی شغل کر رہے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ ہر شخص اپنے آپ

کو ایک دوسرے سے لاپرواہ اپنی ذات میں گم تھا۔

ڈوڈو مجھے لیے ہوئے شراب کے کلاؤں پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے اپنے اور میرے لیے شراب طلب

کی۔ میں نے بیگ لینے کے بجائے پوری بوتل خرید لی تھی۔ ایک بوتل اپنے لیے اور میری پسند کی میرے

پھر گلاس لیے ہوئے ہم وہاں سے ہٹ گئے۔ بیٹھنے کی کوئی جگہ تو تھی نہیں چنانچہ ایک اسٹینڈ کے

پہلوں پر کھڑے ہو کر ڈوڈو نے شراب کی بوتل کھولی۔ سروس کرنے والے ویٹرنے برف اور جگ لاکر رکھ دیا

میں ڈوڈو نے ان دونوں چیزوں کو ہوا میں ہلایا اور برف کو جگ میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنے

میں شراب انڈیلنے لگا۔ پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور کہنے لگا۔

”اور تم مسٹر پیکر! میرا خیال ہے شراب میں کسی قسم کی شمولیت مناسب نہیں ہوتی۔ یہ واحد ہے

جو اس کے علاوہ ہر شے سے بے اثر ہے۔“ اس نے کہا لیکن میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔

چنانچہ میں نے اپنے گلاس میں تھوڑی سی شراب ڈالی۔ اور جگ اٹھا کر گلاس میں برف بھر لیا تھا اور

ایک ہی سانس میں آدھا گلاس خالی کر گیا۔

اس جیسی جسامت کے آدمی کے لیے یہ بات بہت زیادہ مشکل نہیں تھی لیکن چونکہ اس نے خود

اپنی اصلیت بتادی تھی اس لیے اس کے اس طرح پینے کے انداز سے میں تھوڑا سا پریشان ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے گلاس کی چھوٹی چھوٹی چسکیاں لیں اور ڈوڈو آدمی بوتل خالی کر گیا۔

”ڈوڈو!“ میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

”لیس مسٹر پیکر!“ اس نے مودب انداز میں میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تم، میرا خیال ہے جلد بازی کر رہے ہو۔“

”جلد بازی۔“ وہ آہستہ سے بولا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔ میں اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن

کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ چند ساعت کے بعد اس نے گردن اٹھائی اور بولا۔

”میرا خیال ہے نہیں۔ اور پھر اگر اس کے لیے جلد بازی نہ کی جائے تو یہ اس کی توہین ہے، ناراض

ہی ہے۔“

”پھر بھی میرا خیال ہے تم اس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو، بجائے اس کے کہ اس بے

”مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

”فرمائیے۔“ سازندہ اسے نیچے سے اوپر تک گھور کر بولا۔

”آپ چاروں ذرا میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے کہا اور پلٹ پڑا۔ سازندوں نے ایک لمحے کے

سوچا اور پھر وہ چاروں اپنے ساز چھوڑ کر اس کے ساتھ آگے بڑھ آئے۔ ڈوڈو انہیں لیے ہوئے ایک میز

پر بیٹھا تھا۔ اس نے ہاتھ سے میز کا سلن سارا نیچے کر دیا اور میز کے گرد بیٹھے لوگ اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”تشریف رکھیے۔“ ڈوڈو نے بڑے خلوص سے میز کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ چاروں ایک دوسرے

شکلیں دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے کرسیوں پر بیٹھنے کی کوشش۔ ”وہاں نہیں۔۔۔۔۔ آں ہاں۔ یہاں۔“

وہ میز کے اوپر اشارہ کیا اور وہ بیٹھے بیٹھے پھر کھڑے ہو گئے۔

”بیٹھو۔“ ڈوڈو حلق پھاڑ کر چیخا۔ اور چاروں اچھل کر میز پر چڑھ گئے۔ دوسری میز کے لوگ چونک

کر اوجھڑ دیکھنے لگے تھے لیکن کسی نے اس معاملے میں دخل نہیں دیا۔ ”اترنے کی کوشش کی تو ٹانگیں توڑ

لیں گے۔“ وہ بولا۔ ”اور پھر اوجھڑا دیکھنے لگا۔“ اے اے پکرا کہاں گئے؟ اوجھڑا آؤ۔۔۔۔۔ اس نے

دیکھ لیکن میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا تھا۔ چنانچہ میں آڑ میں ہو گیا۔ ”دیکھو میں کیا ہوں۔ میں۔۔۔۔۔

میں ڈوڈو ہوں سمجھئے۔“ وہ بیٹھ گیا اور پھر اس نے میز کے دوپائے پکڑے اور اسے سر سے اونچا اٹھا کر کھڑا

کیا۔ چاروں سازندے میز کے اوپر تھے اور خوف سے چیخنے لگے تھے۔ ڈوڈو انہیں لیے ہوئے چل پڑا۔

اس سے وہ گزر رہا تھا لوگ میزوں سے اٹھ کر اوجھڑا بھاگ رہے تھے اور خاصی ہڑبونگ مچ رہی تھی۔

بے چارے سازندوں کی شامت خواہ خواہ آگنی تھی۔ وہ بمشکل تمام میز پر جے ہوئے تھے لیکن ان میں سے

ایک پھسل کر نیچے گر پڑا اور دوسروں نے خود ہی چھلانگیں لگا دیں۔

لیکن ڈوڈو میز اٹھائے اسی انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ اس کا رخ شراب کے کاؤنٹر کی طرف تھا۔ میں

اس سے کھٹک کر ایک طرف بڑھ آیا۔ ہنگامہ ہونے کا خطرہ تھا اس ہاتھی کو کون روکتا۔

ڈوڈو نے بڑے پیار سے میز کاؤنٹر کے سامنے رکھ دی اور منہ پھاڑے کھڑے ہوئے بارمین سے

بولا۔ ”ان چاروں کو میری طرف سے پلاؤ۔ چلو۔ ہاں تم کیا پیو گے دوستو!“ اس نے میز کی طرف دیکھا اور پھر

انھیں پھاڑنے لگا۔

”ارے کہاں گئے تم لوگ؟“ اس نے میز کی سطح پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور پھر میز کے نیچے جھک کر

دیکھنے لگا۔ ”ارے کہاں گئے یہ سب کے سب غائب۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ سب۔۔۔۔۔ ہو گئے۔ سب کے سب۔“ وہ

مغموم لہجے میں بولا۔

”رہنے دو“ بے چارے نہ جانے کہاں گئے۔۔۔۔۔ ارے پکرا تم کہاں گئے۔ پکرا پکرا پکرا۔۔۔۔۔“ وہ

ست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا دروازے کے نزدیک پہنچا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

لوگ اب دیواروں سے لگے ہوئے کھڑے تھے۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو سنبھالنے کی جرات کرتا۔

دروہی سے اسے سینے میں اتار رہے ہو۔“

”اچھا۔“ ڈوڈو نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور پھر دیر تک رکا رہا۔ اس دوران میں اپنے

دوسرا گلاس بٹا چکا تھا۔

میں اس گلاس کی چسکیاں لیتا رہا اور ڈوڈو ساکت و جامد ہال پر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ میں بھی اس کے

ساتھ شامل ہو گیا۔

اکثریت میز اور کرسیوں پر ٹانگیں لٹکائے سونے اور جاگنے کے مراحل میں تھی۔ دروازے کے

ساتھ چند لوگ ٹیک لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ سازندوں کا ایک طائفہ ایک جانب اپنے لیے لیے ساز

کھڑا تھا۔ نہ جانے یہ لوگ مسافر تھے یا ہمیں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہر صورت ایک عجیب و غریب ماحول

اور اس ماحول میں منشیات کی خوشبو بھی شامل تھی۔

ڈوڈو چند حیا کی ہوئی نگاہوں سے ماحول کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے چونک کر بوتل کی طرف دیکھا اور

شرمندہ نظر آنے لگا۔

”ارے ارے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم تو یونی خنجر بیٹھی ہو جان من! میں تو تمہیں بھول ہی گیا تھا۔“ اس

جلدی بوتل اٹھالی۔ اس بار شاید وہ گلاس ہی بھول گیا تھا، پھر اس نے دونوں ہونٹ اس طرح سکوڑے جیسے

کسی کو بوسہ دے رہا ہو۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ بوتل کو ہونٹوں تک لے گیا اور بڑے پیار سے اس کے

منہ سے منہ لگا دیا۔

”ڈوڈو!“ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

”ہو ہو۔“ وہ بوتل منہ سے لگائے لگائے بولا۔ اور پھر اس کا آخری قطرہ تک چوس گیا۔ ”محبوبہ

موجودگی میں کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی سمجھ لیکن۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔ ارے یہ تو ختم ہو گئی۔“

”تم نے کیا کہا تھا کہ چار بیگ کے بعد میں تمہیں اوپر لے جاؤں۔“

”کہا ہو گا۔“

”اور تم پوری بوتل خالی کر گئے۔“

”ایک منٹ۔“ ڈوڈو نے ہاتھ اٹھایا اور پھر اپنے چہرے کے کوٹ کے تسمے کھول دیے۔ ”یہ

دیکھ رہے ہو؟“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں ایسی پچاس بوتلیں دفن ہو سکتی ہیں۔

یقین کرتے ہو یا۔۔۔۔۔۔“

”نہیں، نہیں۔ تم عملی تجربہ مت کر بیٹھنا۔“

”ارے میں ڈوڈو ہوں۔ جس کا لوہا بڑے بڑوں نے مانا ہے۔ مجھے جانتا چاہتے ہو تو آؤ۔ وہ لڑکھاتا

آگے بڑھا۔ چڑھ گئی تھی۔ وہ دیوار سے لگے ہوئے سازندوں میں سے ایک کے پاس پہنچا اور بڑے اوب

اسے سلام کیا۔ سازندہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔“

لڑکیوں اور مرد بھی سہے ہوئے تھے۔ ڈوڈو نے اٹھنے کی کوشش کی اور دوبارہ زمین بوس ہو گیا۔
”پکرا“ ڈوڈو نے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا اٹھ گیا۔ وہ جھومتا ہوا آگے بڑھا اور زمینوں پر چڑھنے لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

سارے قہوہ خانے میں ہنگامہ ہو رہا تھا۔ وہ لوگ جو نشے میں تھے ان کا نشہ بھی اتر گیا تھا۔ ڈوڈو نے جو توڑ پھوڑ مچائی تھی اس کی وجہ سے لوگ خاصے پریشان ہو گئے تھے لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ کسی نے نہ تو احتجاج کیا اور نا اظہار ناراضگی وہ سب ڈوڈو کے اوپر چلے جانے کے بعد پھر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کے لیے یہ تعجب خیز بات نہ تھی۔ شراب پی کر کوئی بھی سانس اس قسم کی حرکتیں کر سکتا تھا۔

لیکن میں ڈوڈو کے لیے تھوڑا سا فکر مند ہو گیا۔ نہ جانے وہ اوپر جا کر کیا غل غپاڑہ مچاتا اور پھر میں نے اسی کی ترکیب پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ لیا۔ یعنی اس کے سر پر کوئی ایسی چوٹ مار دی جائے جس سے یہ بے ہوش ہو جائے۔ میں آہستہ آہستہ میزٹیوں کی جانب بڑھ گیا۔ لوگ اب بھی ڈوڈو کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ جب میں اوپر پہنچا تو میں نے دیکھا ڈوڈو لڑکھڑاتا ہوا ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک لکڑی کا ہتھوڑا نظر آیا جو جہاز کے لنگر کے نزدیک پڑا ہوا تھا۔ میں نے ہتھوڑا دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا۔ ہتھوڑا خاصا وزن تھا۔ تب میں آہستہ سے ڈوڈو کے پیچھے چل پڑا۔

ڈوڈو جھوم رہا تھا۔ میں نے پیچھے سے ہتھوڑا اس کی گردن پر رسید کر دیا۔ ڈوڈو کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ میری جانب پلٹا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب دیکھنے لگا۔ پھر اس کے بعد فرش پر اونڈھالٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میری ترکیب کار گر ثابت ہوئی تھی۔ ویسے اس بگڑے ہوئے سانس کی اس حرکت پر مجھے حیرت بھی تھی اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔ بلاشبہ اس نے سچ کہا تھا۔ شراب کی ایک بوتل اس جیسے آدمی کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی لیکن وہ اسے پینے کے بعد اتنا آؤٹ ہو گیا تھا کہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ خشک ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں اور اسٹیرڈ ٹکرک کی بندرگاہ کی جانب رواں دواں تھا۔ مجھے بھی اس کم بخت کی وجہ سے سردی کھانا پڑ رہی تھی۔ ورنہ قہوہ خانے میں شراب کی بجائے گرم گرم کافی مزہ دے جاتی۔ گو میں نے شراب کے چند پیگ لیے تھے۔ اور باقی بوتل یونہی چھوڑ آیا تھا لیکن شراب نے کوئی خاص لطف نہیں دیا تھا سوائے اسکے کہ کلن کی لوسیں گرم ہو گئی تھیں۔

رودبار انگلستان کی موجیں اسٹیر سے ٹکراتیں اور ٹھنڈے پانی کی پھواریں بلند ہو جاتیں۔ کسی اور موسم میں یہ پھواریں بڑی دلکش لگتیں لیکن اس وقت بھلی نہیں معلوم ہو رہی تھیں۔ گنجنت ڈوڈو دنیا و مافیہا سے بے خبر اونڈھال پڑا ہوا تھا اور اب اس کے حلق سے خراٹے بھی بلند ہونے لگے تھے۔

رودبار انگلستان کا سفر آہستہ آہستہ طے ہو رہا تھا۔ اسٹیر کی رفتار بھی ست تھی اور پھر بقیہ رات میں نے کسی ایسی بیوی کی مانند ڈوڈو کے نزدیک بیٹھ کر گزار دی جو اپنے شوہر کی لاش لے کر سفر کر رہی ہو۔ صبح کلاب کے آثار کے ساتھ ہی ڈکرک کا شہر دکھائی دینے لگا تھا۔ اکثر مسافر قہوہ خانے سے نکل کر

عرشے پر آچکے تھے اور پھر بندرگاہ میں داخلے کا بھونپو زور زور سے بجنے لگا۔ اس بھونپو کی آواز سے ہی ڈوڈو بھی جاگا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور چت ہو گیا۔ اب اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پھر پانی کی ایک تیز لہر نے زور سے پھوار اڑائی اور وہ بھیگ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ٹرک کراٹھ بیٹھا تھا اور پھر وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھاڑنے لگا۔ اور آخر میں اس کی نگاہ مجھ پر آئی۔

”آہ۔ پکیر میرے دوست!“ اس نے منہ چلاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”تمہارا نشہ اتر گیا یا اب بھی نشے میں ہو؟“ میں نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
وہ بڑے پر خلوص انداز میں مسکرانے لگا۔

”سر کی تکلیف بتاتی ہے کہ تم نے ہدایت پر عمل کیا ہے۔“ وہ اپنے سر کی پشت پر ہاتھ پھیرتا ہوا کہتا تھا۔ ”لیکن میرا علاج اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دس بوتلیں پینے کے بعد بھی اگر چند گھنٹے سونے کو مل میں تو پھر نشے کا شائبہ بھی نہیں رہتا۔ غالباً ہم ڈکرک میں داخل ہو چکے ہیں۔؟“

”ہاں۔“ میں نے بھاری لہجے میں جواب دیا۔
لیکن اس نے میرے لہجے پر توجہ نہیں دی اور اٹھ کھڑا ہوا اسٹیر بندگاہ میں لنگر انداز ہو گیا تھا اور سافروں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ پھر لوگ نیچے اترنے لگے۔ ڈوڈو اب پوری طرح فارم میں تھا۔ ہم لوگ بھی اتر آئے اور کشم ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

”ٹرین میں سوار ہونے سے قبل میں ناشتہ کروں گا۔ جب جیب میں پیسے ہوں تو آدمی بھوکا کیوں رہے۔ آؤ۔“ اس نے کہا اور ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔
ناشتے سے فارغ ہو کر ٹرین میں آ بیٹھے۔ ڈوڈو پر اب قنوطیت سی طاری ہو گئی تھی۔ عجیب و غریب کردار کا انسان تھا۔ کبھی کبھی کچھ ہر حال مجموعی حیثیت سے برا نہیں تھا۔

پیرس کی آب و ہوا مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ ٹرین نے ڈکرک کی بندرگاہ چھوڑ دی اور پیرس کے قواح میں دوڑنے لگی۔ میں اب ترلوکا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاید میری زندگی میں کسی نئے پہلو کا آغاز ہونے والا تھا۔

اور ایک نئے ہنگامی دور کا آغاز
ڈوڈو۔۔۔۔۔ جینگو۔۔۔۔۔ اور
۔۔۔۔۔ ترلوکا۔۔۔۔۔

☆ ☆ ☆

بالا خر ٹرین سینٹ لالہ زار کے اسٹیشن پر جا کھڑی ہوئی۔ بہت ہی خوبصورت اسٹیشن تھا۔ ڈوڈو اپنا مختصر سامان اٹھا کر ٹرین سے نیچے پلیٹ فارم پر اتر آیا اور مسکرا کر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں اس

کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔
پلیٹ فارم سے باہر نکل کر ڈوڈو نے میرا شانہ پکڑ لیا اور ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ لمبی سی کار ہمارے
نزدیک آ کر رک گئی اور ڈرائیور نیچے اتر آیا اور اس نے عقبی دروازہ کھول دیا۔
ڈوڈو نے اپنا مختصر سلمان کار میں پھینکا اور اندر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا تھا۔
”کہاں چلوں موسیو؟“ ٹیکسی ڈرائیور نے فریج میں پوچھا۔
”بوائے ڈی بولون“ ڈوڈو بھاری لہجے میں بولا اور ٹیکسی ڈرائیور نے گردن جھکا کر ٹیکسی آگے بڑھا
دی۔

میں اس علاقے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ سڑک کے ساتھ ساتھ
دریائے سین بہہ رہا تھا..... بوائے ڈی بولون پہنچ کر میں دنگ رہ گیا۔
”میرے خیال میں یہ علاقہ پیرس کے خوبصورت ترین علاقوں میں شمار ہوتا ہے“ میں نے ڈوڈو کی
جانب دیکھ کر اس سے سوال کیا۔

”ہاں پیکر! بوائے ڈی بولون کا شمار پیرس کے خوبصورت علاقوں میں ہوتا ہے اور میرا خیال ہے
دریائے سین نے اس کی خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا ہے“ ڈوڈو نے جواب دیا اور میں..... بوائے ڈی بولون
کے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

پیرس کی یہ نواحی بہتی دریائے سین کے خاموش پانی کے ساتھ میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ نیچے
دریا کے کنارے چھوٹے چھوٹے رہائشی مکان نظر آ رہے تھے جو انتہائی پرسکون اور حسین سبزہ زاروں میں
گھرے ہوئے تھے۔ چند جگہوں پر خوش نظر داغیچوں کے مقابل پانی میں ہاؤس بوٹ تیر رہے تھے۔
مکانوں اور ہاؤس بوٹوں کا سلسلہ ختم ہوا تو دریا کے کنارے ایک وسیع و سرسبز سیرگاہ دکھائی دی۔
یہ منظر نہایت خوبصورت تھا۔ شاہ بلوط اور بید کے درختوں کی چھاؤں میں چند بوڑھے مچھلی کے
شکار میں مصروف تھے۔

سیرگاہ ختم ہونے کے بعد انہی درختوں کے عقب میں ایک خوبصورت عمارت نظر آئی جو دوسری
عمارتوں سے الگ تھلگ تھی۔ ٹیکسی اس عمارت کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

ڈوڈو نے نیچے اتر کر ٹیکسی ڈرائیور کو ادائیگی کی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھنے لگا۔
سرخ بجری کی روش سے گزر کر ہم عمارت کے پھانک پر پہنچ گئے۔

وہ تمام علاقہ ہمارے دائیں ہاتھ پر تھا۔ بائیں بازو پر پیرس کے متمول لوگوں کے سفید براق مکانوں
کی قطاریں تھیں جو فرانسیسی طرز تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھیں۔ میں نے بوائے ڈی بولون کا گہری نگاہ سے
جائزہ لیا اور ڈوڈو کے ساتھ اس دلکش عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہونے کے بعد ہم عمارت کے بائیں سمت بنے ہوئے اس لمبے ہال کی جانب چل پڑے۔

میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان کھڑکیوں کے آگے بارش سے بچاؤ کے لیے ہلکے ہلکے
نظر آ رہے تھے۔ طرز تعمیر خالص فرانسیسی تھا۔ لیکن انداز کچھ ایسا تھا جیسے فوجی بیرکوں کا ہوتا ہے۔
ڈوڈو مجھے لے کر انہی بیرکوں کی طرف چل پڑا۔ کھڑکیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دروازے بھی
ڈوڈو ایک دروازے کے سامنے پہنچا اور اس کا تالا کھولنے لگا اور پھر ہم اندر داخل ہو گئے۔
نیس فرنیچر سے آراستہ خلاصہ وسیع کمرہ تھا جس میں ہاتھ روم اور کچن بھی شامل تھا۔ باہر سے دیکھنے
میں ہوتا تھا کہ عمارت اندر سے اتنی کشادہ نہیں ہوگی لیکن کمرے وسیع تھے اور اس میں ایک ہی بستر

”یہ اپنی عیش گاہ ہے“ ڈوڈو نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا۔

”تم یہاں رہتے ہو ڈوڈو؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ علاقہ کافی پسند آئے گا“ ڈوڈو نے کہا۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے ڈوڈو۔ پسند آئے گا نہیں بلکہ پسند آچکا ہے“ میں نے مسکراتے
جواب دیا۔

”تم جانتے ہو پیکر! یہ عمارت کتنے دن میں تعمیر ہوئی تھی؟“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”صرف چالیس دن میں۔ تقریباً“ دو ہزار مزدوروں نے جدید ترین مشینوں کے ذریعے یہ عمارت
کی تھی کیونکہ اس کی فوری تیاری کا آرڈر جینگو نے دیا تھا۔“

”لیکن اسے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”جینگو کچھ عرصے تک یہاں قیام کرنا چاہتا تھا“ ڈوڈو نے جواب دیا۔

”گویا وہ جس ملک میں یا جس شہر میں قیام کرتا ہے وہاں اپنی ذاتی عمارت تیار کر لیتا ہے؟“

”ہاں۔ یہ اس کا اصول ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ انہی جگہوں پر رہتا ہے جو اس کی ملکیت
میں۔“

”اور وہ ترو کا کا پیرو ہے؟“

”ہاں۔ زبردست۔“

”لیکن ڈوڈو! تمہارا یہی ازم تو ان سارے لوازمات کی نفی کرتا ہے۔ تم لوگوں سے یہ تو یہ ہے کہ
سلمان کی چھت اور زمین کا بستر موجود ہو تو ہر جگہ عیش گاہ ہوتی ہے۔“

”بالکل ٹھیک، لیکن انسانی قدروں میں جو چیزیں افلاحت رکھتی ہیں، اگر انہیں اپنا لیا جائے تو اس میں
کوئی برائی تو نہیں ہے۔ ہمیں معاشرے کے ان افکار کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے جو ہمارے منہ پر اثر انداز
ہوں۔ لیکن اس کے علاوہ جینگو کے ساتھ اس کے اپنے جتنے ساتھی ہیں، جینگو چاہتا ہے کہ وہ عام لوگوں

میں اس انداز میں شامل نہ ہوں کہ کسی کی کوئی بات ان کو متاثر نہ کر سکے۔ وہ اپنے گروہ کو منفرد رکھنا چاہتا ہے۔ شام کو وہ تمام ساتھیوں کو اپنے گرد چاہتا ہے اور اپنے طور پر ان کا امتحان بھی لیتا رہتا ہے کہ ان میں سے کوئی بدکنے والوں میں سے تو نہیں ہے۔

”گویا جینگو تم لوگوں کی پوری پوری نگہداشت کرتا ہے۔“

”ہاں۔“

”اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم ترلوکا کے خلوم ہیں اور جینگو کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیں کسی طور بھٹکنے نہ دے۔ ایک طرح سے وہ ترلوکا کی تبلیغی مہم پر نکلا ہے۔ اور اس تبلیغ کے لیے جو آدمی اس کے ساتھ ہیں ان کی ذہنی بقا بہت ضروری ہے۔“

”لیکن ڈوڈو، تم تو اس سے کافی دور تھے؟“ میں نے اس سے سوال کیا۔

”بیٹھو“ ڈوڈو نے مسکراتے ہوئے ایک صوفے کی جانب اشارہ کیا اور میں پاؤں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”در اصل ان لوگوں پر جو اپنے عقائد میں پختہ ہو جاتے ہیں اور جنہیں ترلوکا کی طرف سے اطمینان بخش قرار دے دیا جاتا ہے، کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا کام ترلوکا کے مشن کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ان پر اعتبار کیا جاتا ہے اور اس اعتبار کے بعد ہی انہیں اتنی آزادی ملتی ہے کہ وہ عوام میں گھل مل جائیں اور انہیں اپنا ہمنوا بنائیں۔“

”خوب۔ گویا ترلوکا اپنے اس مشن کو ساری دنیا میں پھیلاتا چاہتا ہے؟“

”ہاں۔ اس کا یہی خیال ہے اور وہ پر امید ہے کہ ایک دن دنیا تہذیب کے جھوٹے بندھنوں سے باہر نکل آئے گی۔ اس مشن میں ترلوکا اور اس کے ساتھی جس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا اندازہ تم دنیا کے ہر ملک میں کر سکتے ہو سوائے ان چند ممالک کے جو ان چیزوں سے متاثر نہیں ہوتے۔“

”ان چند ممالک میں کون کون سے ممالک شامل ہیں؟“..... میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”اسلامی ممالک“ ڈوڈو نے نفرت بھرے انداز میں کہا جیسے وہ ان ممالک سے بے حد بددل ہو۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے ڈوڈو کا یہ نفرت بھرا انداز اچھا نہیں لگا۔ اس کی بات نے میرے دل پر خاص اثر کیا۔ میرے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے مگر ڈوڈو نہیں جانتا تھا کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ تاہم اگر وہ کسی سے خوفزدہ تھا اور اگر ترلوکا کو اپنے مشن میں کہیں ناکامی ہوئی تھی تو یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ وہ میرے ہم مذہب لوگ تھے۔ خوف کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا سرور میرے دل و ذہن پر طاری تھا۔ حالانکہ مجھ جیسے انسان کے لیے مذہب اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میرا نام تو نوازا صفر ضرور تھا لیکن میں مذہب سے بہت دور تھا۔ مذہبی افکار و افعال مجھ سے دور جا چکے تھے اور بظاہر تو اب میں کسی مذہب میں شامل ہی نہ رہا تھا

جانے کیوں ذہن و دل پر ایک وجد طاری ہو گیا تھا۔

دیر تک میں ڈوڈو سے کوئی بات نہ کر سکا۔ ڈوڈو نے اس دوران چند باتیں کیں لیکن اس کی کوئی بھی میری سمجھ میں نہ آئی۔ میرے کانوں میں ایک عجیب سی آواز گونج رہی تھی۔ ذہن کچھ کہہ رہا تھا اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟ نہ جانے کیوں؟

”شاید تم تھکن محسوس کر رہے ہو پیکر“ ڈوڈو نے کہا۔ ”جاؤ ہاتھ روم میں جاؤ اور نماز پڑھ کر آرام میں تو ابھی تھوڑی دیر تک مصروف رہو گے۔ ویسے تم یہاں ایک پرسکون زندگی گزار سکتے ہو۔ کسی اور ذہن میں لانے کی ضرورت نہیں۔“

”تمہارا شکریہ ڈوڈو“ میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

جب میں ہاتھ روم سے نکلا تو ڈوڈو اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے کچھ کام ہے۔ اس وقت مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں ایک آرام دہ مسیج پر جا کر لیٹ گیا۔ ابھی لیٹے چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ گردن سے لے کر ٹخنوں تک سفید اور سیاہ لباس میں ملبوس ایک لڑکی میں ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس کے خوبصورت سنہرے بال نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔

اندر آکر وہ احتراماً ”جگی۔“

”آپ کا نام مسٹر پیکر ہے نا؟“

”ہاں“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کافی لائق ہوں۔ اگر سونا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی، ورنہ کافی پینے کو دل چاہے تو بنا کر پیش کر

”شکریہ، پلاؤ“ میں نے کہا اور وہ مسکراتے بغیر ایک طرف بڑھ گئی۔ اس نے کافی کی ٹرے ایک میز کی اور ایک سادہ سے پیالے میں کافی بنانے لگی۔ پھر اس نے کافی کا پیالہ ایک جانب رکھ دیا۔ میں اس کے..... لڑکی کا بغور جائزہ لیتا رہا۔

اس کے انداز میں کوئی اتراہٹ یا کوئی احساس نہیں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے متاثر یا یہ سوچ رہی ہے کہ کوئی اجنبی اس کمرے میں موجود ہے۔ جب اس نے کافی کا پیالہ لا کر میرے

نے رکھا تو اس کا چہرہ ساٹھا تھا۔

”معاف کیجئے مس“ میں نے اسے مخاطب کیا اور وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

”آپ بھی بیس رہتی ہیں؟“

”ہاں“ اس کی سپاٹ آواز ابھری۔

”ترلوکا کے خادموں میں سے ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا نام ہے آپ کا؟“

”نمین“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کے بولنے کا انداز مشینی ہے“ میں نے قدرے بے تکلفی اختیار کی۔

”اوہ، نہیں جناب مجھے افسوس ہے کہ آپ کو یہ احساس ہوا۔ میں آپ کا احترام کرتی ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ مسٹر جینگو کے مہمان ہیں“ اس مرتبہ اس کی آواز میں تھوڑی سی تبدیلی تھی۔

”آپ مسٹر جینگو کا بہت احترام کرتی ہیں؟“

”میں ان کی ایک ادنیٰ خلومہ ہوں“

”صرف خلومہ یا ان کی مرید بھی؟“

”یہاں کوئی ایسا شخص نہیں رہتا جو مسٹر جینگو کا مرید نہ ہو یا کم از کم ان کے خیالات سے متفق نہ ہو۔“

”لیکن میں تو ذرا مختلف ہوں“ میں نے کہا اور وہ نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔

”میں سمجھی نہیں جناب؟“

”مقصود یہ کہ میری تو ابھی مسٹر جینگو سے ملاقات بھی نہیں ہوئی“

”ایسے لوگوں کا ایک مخصوص شعبہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اب چونکنے کی باری میری تھی۔

”جی ہاں۔ آپ یہاں تنہا نہیں آسکتے تھے۔ یقیناً“ آپ کو ہمارا کوئی نمائندہ لے کر آیا ہو گا۔ اور اگر

ہمارا نمائندہ آپ کو یا کسی بھی ایسے شخص کو جو یہاں کے ماحول سے اجنبی ہو لے کر آتا ہے تو اس کا مقصد یہ

ہوتا ہے کہ آپ یا وہ شخص جو یہاں تک پہنچا ہے، اپنے اندر مسٹر جینگو سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے

اور ہمارے عقائد پر چل سکتا ہے۔“

”ہوں اور تم ان تمام لوگوں کا احترام کرتی ہو، جو تمہارے مسلک سے متفق ہوں۔“

”بے شک، اپنے مسلک سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ میں بھی اپنے عقائد اور اپنے مسلک کی پوجا

ہوں۔ مسٹر جینگو کی ایک ادنیٰ کنیز۔ جو شخص ہمارے مسلک میں شامل ہونے والا ہو وہ بھی ہمارے لیے قابل

احترام ہے۔“

بڑا ہی شائستہ انداز تھا اس کا۔ اور لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ میں نے اس کے بولنے کے اند

کو پسند کیا اور اس سے کہا:

”مس نمین، اگر آپ پسند کریں تو براہ مہربانی تھوڑی دیر کے لیے تشریف رکھیں۔“

”کوئی حرج نہیں ہے جناب، ویسے آپ مسٹر ڈوڈو کے مہمان ہیں شاید؟“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں وہی مجھے یہاں تک لائے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مسٹر ڈوڈو غالباً“ پاس کو کوئی رپورٹ دینے گئے ہوں گے جب تک وہ تشریف نہیں

میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”شکریہ۔ تو پھر بیٹھ جائیے۔ میں مسٹر جینگو اور عظیم ترلوکا کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا

ہوں۔“

”ضرور ضرور۔ ہمارے لیے یہ پسندیدہ ترین موضوع ہوتا ہے“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب

”آپ ترلوکا کے خاص معنظمین میں شامل ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ کیا آپ اس کی تعلیمات

کامل طور پر متفق ہیں؟“

”جی ہاں۔ مکمل طور پر متفق ہوں۔“

”آپ کے عقائد اور آپ کا مسلک کیا ہے؟“

”دیکھئے جناب میں مقرر نہیں ہوں جو اپنے عقائد اور مسلک پر انداز میں پیش کر سکوں۔۔۔۔۔ میں

زیادہ تفصیل میں تو نہیں جاسکتی۔ البتہ چند بنیادی باتوں سے آپ کو ضرور آگاہ کر دوں گی“ میں نے کہا

”جی ہاں سانس لی۔“

”جی ہاں ضرور۔ میں بھی ترلوکا کے متعلق بنیادی باتیں ہی جانتا ہوں“ میں نے کہا اور وہ شروع

”مذہب، تہذیب، تمدن، اخلاقیات، معاشرتی بوجھ اور انسانی مسائل۔ یہ سب انسانیت کے

انسانوں کے لیے ایک بوجھ بنا کر نازل کیے ہیں۔ کمزور انسان اس وزن کو بوجھ کو اٹھانے کے قابل

نہیں ہیں۔ بس ترلوکا کا یہی کہنا ہے کہ تہذیب و تمدن اور اخلاقیات کے ہم ہندوں کو یکسر کاٹ دیا جائے۔ ہر

انسان اپنے طور پر زندہ رہے اور اپنے ان سانسوں کو پورا کرے جو اسے زندگی دینے گئے ہیں“ میں نے کہا

”میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھتا رہا۔ جس پر خرد انبساط کی لہرں بھگی ہوئی تھیں۔“

پہلے بھی میں کئی بار ان لوگوں کے عقائد سن چکا تھا۔ ترلوکا کے بے شمار مریدین میرے سامنے آئے

میں ان کے عقائد سے ناواقف نہیں تھا لیکن میرا ذہن انہیں قبول نہیں کرتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرے

ذہن میں کچھ دلائل تھے مگر میں نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ دلائل اس لڑکی کو بتائے جائیں جو کسی اور کی زبان

پر بولی رہی ہے اور خود اپنے طور پر محض بنیادی باتوں ہی کو سمجھ سکتی ہے۔ میں پر خیال انداز میں گردن ہلاتا

اور لڑکی پر اشتیاق نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ چند ساعت کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا

”میں نہیں سمجھا“ میں

ساتھ مل جاتا۔

میرا مذہب کتنا پختہ، کتنا سچا تھا کہ ہر کانے والے جو پوری دنیا کو اپنے جال میں پھانتے پھر رہے تھے، اسے ناکام لوٹے تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے تھے تو غلط نہیں ہو گا اور یہ کتنا دلکش اور نرانا تصور تھا۔

پھر نین تو وہاں نہ آئی، البتہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے دیو ہیکل ڈوڈو میرے سامنے آکر اٹھا ہوا۔
”میرے عزیز دوست پیکرا میری غیر موجودگی میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ مجھے احساس ہے اس دوران تم خوش و خرم نہ رہ سکے ہو گے۔ تنہائی زیادہ اچھی نہیں ہوتی۔ لیکن اس دوران تمہیں کچھ سمجھنے کا موقع ضرور ملا ہو گا۔ رہی میری غیر موجودگی کی بات تو میں بے مقصد نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنی آمد پورٹ دینی تھی اور تمہارا رجسٹریشن بھی کرانا تھا۔“

”کیسا رجسٹریشن؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم نے تمہیں اپنے مخصوص مہمانوں میں شامل کر لیا ہے اور تمہاری خدمت کی تمام تر ذمہ داریاں مسٹر جینگو پر آ پڑی ہیں۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ..... جینگو اسی عمارت میں رہتا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”بے شک، میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ لیکن وہ اکثر اپنے مشن پر باہر ہی رہتے ہیں۔“

”مشن؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ مسٹر جینگو کا ایک مخصوص مشن ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں تفصیل سے پھر کبھی بتاؤں گا۔“

”لیکن وہ اپنے مشن کا پرچار کس طرح کرتا ہے؟“

”ایک ایسے عام انسان کی حیثیت سے جو دوسروں کی پسندیدہ شخصیت میں شمار ہوتا ہے۔“

”کیا میں دیکھ سکتا ہوں ڈوڈو کہ مسٹر جینگو کس طرح اپنی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں؟“

”اپنی نہیں، ترلوکا کی تعلیمات کا“ ڈوڈو نے تصحیح کی۔

”میرا مقصد یہی ہے۔“

”ضرور دکھاؤں گا بلکہ تھوڑی دیر کے بعد میرا یہی پروگرام ہے۔ میں تمہیں پیرس کے مختلف علاقوں کی سیر بھی کراؤں گا۔ اپنے کہنے کے مطابق تم پہلی مرتبہ پیرس آئے ہو اور تمہارا یہاں کا قیام طویل ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ تم پیرس سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لو۔“

”شکریہ ڈوڈو“ میں نے جواب دیا۔

ڈوڈو مسکراتے لگا پھر بولا ”ارے ہاں تم نے کچھ کھلایا یا؟“

”ہاں، تمہاری ایک خلامہ میرے لیے کلنی لائی تھی۔“

”کیا میری یہ مختصر گفتگو جس میں کوئی ادبیت، کوئی علیت نہیں ہے اور جس میں کوئی ایسی تڑپ نہیں ہے جو دوسروں کو متاثر کر سکے، کسی طور آپ کے ذہن تک پہنچتی ہے؟“

”ہاں کیوں نہیں۔ عقائد کی ایک زبان ہوتی ہے۔ ہر مسلک کسی دوسرے مسلک سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ تم نے عقائد کی زبان میں مجھ سے بات کی ہے۔ میرے پاس بھی کچھ سوالات ہیں لیکن میرا خیال ہے تم اپنے عقائد کو ذہن میں رکھ کر میرے سوالات کا جواب دینے سے پہلو تھکی کرو گی۔ اس لیے پہلے میں اپنے طور پر مطمئن ہونا چاہتا ہوں اس کے بعد میں اس سلسلے میں بہتر طور سے سوچ سکوں گا۔“

یقیناً ”یقیناً“ ترلوکا ہی کی ہدایت پر جینگو اس مہم پر نکلے ہیں۔ اور آپ بھی مسٹر جینگو سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ اگر وہ آپ کو مطمئن کر سکے تو ٹھیک ہے اور اگر آپ کو وہ مطمئن نہ کر پائے تو آپ کو اس وقت بھی اس بات کی کھلی آزادی ہو گی کہ آپ جو عقائد چاہیں اختیار کریں۔ صرف اتنا ضرور ہو گا کہ اس کے بعد آپ ہمارے مہمان نہیں رہیں گے“ اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

صورت حال خاصی حد تک میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ایک دلچسپ مشغلہ میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر نین نے مجھ سے اجازت مانگی۔

”آپ حکم دیں تو تھوڑی دیر کے بعد پھر آ جاؤں۔ لیکن اگر اس دوران مسٹر ڈوڈو آ گئے تو مجھ پر اس حکم اور وعدے کا ایفا ضروری نہیں ہو گا۔“

نین کے جانے کے بعد میں نے اس کی باتوں پر غور کیا۔ کوئی نئی بات میرے علم میں نہیں آئی تھی۔ ساری باتیں میں پہلے بھی سن چکا تھا اور نہ پہلے سے متفق تھا اور نہ اب۔

لیکن اس وقت جب میں اپنے سارے مشاغل ترک کر چکا تھا اور اپنا سارا کاروبار اور اپنی زندگی چھوڑ آیا تھا تو زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ تو درکار تھا۔ جو کچھ ڈوڈو نے کہا یا جو کچھ نین کہہ کر اسے سوچ کر یہ بات میرے ذہن میں ابھرنے لگی کہ میں ترلوکا کے عقائد کے بارے میں اور چھان بین کروں اور دیکھوں کہ ترلوکا نے اپنے عقائد کی تعلیمات کا جو جال پھیلایا ہے، اس کے پیچھے کون سا جذبہ کار فرما ہے اور وہ کیا چاہتا ہے۔

بڑا مشکل محسوس ہوتا تھا جبکہ مذہبی طور پر میں اس بات کا قائل تھا کہ مذہبی تعلیم دینے والوں میں آخری انسان آچکا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسرا شخص اس سے بہتر تعلیم لے کر اس دنیا میں کبھی نہ آئے گا۔ میں مذہبی محاطات سے بہت دور، ایک پست اور ادنیٰ انسان تھا لیکن میرے عقیدے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اور نہ آنے کا امکان تھا۔

تو پھر کیوں نہ اس ترلوکا ہی کو دیکھ لیا جائے کہ کتنے پانی میں ہے اور کیا کچھ رکھتا ہے اپنے پاس۔ دیر تک میں اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ ڈوڈو کے وہ الفاظ مجھے جب بھی یاد آتے میری روح پر

”مزید ضرورت محسوس کر رہے ہو؟“

”نہیں۔“

”تب ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ، تھوڑی دیر کے بعد ہم یہاں سے چلیں گے“ ڈوڈو نے کہا اور میں نے

گردن ہلا دی۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میں اور ڈوڈو ایک خوبصورت کھلی کار میں پیرس کی سڑکوں پر نکل آئے۔ حسین پیرس میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس شہر کے بارے میں اس سے پہلے بہت کچھ سن چکا تھا۔ یہاں کی تاریخ بھی نہ جانے کس طرح ذہن میں رہ گئی تھی۔ پیرس کا شمار پورے یورپ کے حسین ترین ہی نہیں بلکہ قدیم ترین شہروں میں بھی ہوتا تھا۔

دیر تک میں پیرس کی تاریخ اپنے ذہن میں دہراتا رہا۔ پھر ڈوڈو نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا:

”تم نے چونکہ پہلی بار پیرس دیکھا ہے اس لیے ہم جس اہم مقام سے گزریں گے، میں تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گا“

”ضرور ڈوڈو ضرور“ میں نے اخلاقاً کہا۔ حالانکہ میرا دل قطعی نہیں چاہ رہا تھا کہ ڈوڈو مجھے ان تصورات سے دور کرے جو میرے ذہن میں آرہے تھے۔

”لیکن میں ڈوڈو کی میزبانی کے فرائض کی انجام دہی میں بھی حارج نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے اخلاقاً ڈوڈو کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”چند لمحوں کے بعد ہم پیرس کی ایک خوبصورت ترین سڑک شانزے لیزے پر پہنچ گئے۔ وہ پیرس کی خوبصورت ترین سڑک تھی۔ شہر کے مرکز میں نپولین کی فتوحات کی یاد میں تعمیر کردہ ”فتح کی محراب“ تھی۔ جس کے عین نیچے ایک گمنام سپاہی کی قبر پر ابدی شعلہ روشن تھا۔ وہ سپاہی ان تمام فرانسیسی سپاہیوں کی نمائندگی کرتا تھا جنہوں نے ملک و ملت کے لیے جانیں نثار کیں۔

اس محراب سے بارہ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں نکل کر پیرس کے سینے پر پھیل گئی تھیں اور ان کی سڑکوں میں ایک کانام — شانزے لیزے تھا۔

کار ہلکی رفتار میں شانزے سے گزرتی رہی اور پھر ڈوڈو کے بتانے کے مطابق مومارت کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی گلیوں کا علاقہ مومارت، پھر کلیسائے سیکرے کرل جہاں مصوروں کا ایک بڑا لگا ہوا تھا۔ وہ مصور سیاحوں کی تصویروں بنا کر ان سے رقومات وصول کرتے تھے۔

”ڈوڈو کی زبان قہنجی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ مجھے ان تمام چیزوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ڈوڈو! میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ مجھے مسٹر جینگو زیارت کرانے کے لیے نکلے تھے۔“

”ہاں واقعی۔۔۔۔۔ واقعی“ ڈوڈو جیسے چونک پڑا۔ پھر آہستہ سے بولا ”لیکن میں بھولا تو نہیں،

”کیا مطلب؟“

”مسٹر جینگو اس وقت تبلیغی مہم پر ہوں گے۔“

”میں سمجھا نہیں“

”ہاں۔ ان کا یہی معمول ہے۔ تم ان کے بارے میں سب کچھ جان کر حیران رہ جاؤ گے۔ ایک ایسا نوجوان ہے اندر نہ جانے کون کون سی وسعتیں چھپائے رکھتا ہے۔ ایک عام انسان کی حیثیت سے سڑکوں پر اچھڑتا ہے اور وہ لوگ جو جھوٹی تہذیب و تمدن سے آگے گئے ہوں، اس کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ جینگو تجارت کا راستہ بتاتا ہے اور جو لوگ نروان کی تلاش میں ہوتے ہیں، جینگو ان متلاشیوں کو تزلوکا کا بتا دیتا ہے۔“

”خوب“ میں نے بے خیالی میں گردن ہلائی۔ میں ان لوگوں کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے.....

تھوڑی دیر کے بعد ایک سڑک سے گزرتے ہوئے اچانک ڈوڈو نے کار کو بریک لگائے اور اس کے ایک سمت کھڑا کر دیا۔ میری نگاہیں بائیں سمت میں بھٹک رہی تھیں جہاں بے شمار لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ان میں عورتیں، جوان اور بوڑھے سبھی لوگ شامل تھے۔

”ہتھی نہیں چل رہا تھا کہ مجمع کے درمیان کیا ہو رہا ہے لیکن شاید ڈوڈو اس قسم کے اجتماعات کو پہچانتا ہے۔“

”جیسے موسیقی کی دلچسپ تانیں سنائی دے رہی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”آہ مسٹر جینگو تاروں کے شہنشاہ ہیں۔ ان کے گٹار کے تار روح کو جکڑ لیتے ہیں اور انسان اپنی ہر سے عاری ہو جاتا ہے۔ پھر جب ان کی آواز فضا میں گونجتی ہے تو جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا ہے، اس کا براہ راست روح سے ہوتا ہے۔ اس طرح لوگ ان کا پیغام بہت غور سے سنتے ہیں۔“

”کیا یہ مجمع جینگو ہی نے لگایا ہے؟“

”ہاں۔“

”تم نے کیسے پہچان لیا؟“

”اس کے تاروں کے سر ہم میں سے ہر ایک کی گمراہیوں میں اترے ہوئے ہیں۔ آؤ ذرا ڈوڈو نے کہا اور میں کار سے اتر کر اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

کاکورو چوک کے درمیان برہنہ عورتوں کے مجسموں کے سروں پر آویزاں فواروں سے پانی اچھل

رہا تھا۔ چوک کے دوسری جانب سکندر سوئم کا مشہور پل تھا۔ وہاں سے وہ سڑک دریا کے کنارے جاتی تھی اور اس کے اختتام پر بیڑھیاں پانی میں اتر جاتی تھیں۔ بلاشبہ حسین ترین علاقہ تھا۔ میں اور ڈوڈو اس مجمع کے قریب پہنچے، جس کے درمیان سے موسیقی کی تانیں ابھر رہی تھیں۔ ان تانوں میں گلے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ انتہائی بے ڈھنگی اور بے نکی آوازیں جو میرے لیے ناقابل فہم تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ تفریح پسند فرانسیسی ان آوازوں پر سردھن رہے تھے۔ لڑکیوں رقص کر رہی تھیں۔ اس مجمع میں جتنے افراد تھے، کبھی کسی نہ کسی طرح تھرک رہے تھے اور مجمع کے درمیان ایک لمبا تڑنکا، واڑھی والا آدمی جھوم جھوم کر گٹار بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ قریب کھڑے ہوئے افراد سے اس طرح بے خبر نظر آ رہا تھا جیسے اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

میں نے اس کے گلے پر سردھننے والوں کا والمانہ پن دیکھا اور متعجب رہ گیا۔ عجیب و غریب لوگ تھے۔ حالانکہ نہ گانا میری سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ گٹار کوئی ایسا نغمہ بکھیر رہا تھا جو بہت ہی خوبصورت ہو یا ذہنوں کو متاثر کرتا ہو۔ بس ایک تیز دھن تھی اور اس میں اس شخص کی بے ہنگم آوازیں شامل تھیں لیکن آدمی اچھی شخصیت کا تھا۔ اس نے معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بدن پر وہ معمولی سا لباس خاصا جگ رہا تھا۔ دیر تک وہ جھوم جھوم کر گٹار بجاتا رہا پھر آہستہ آہستہ گٹار کے سرمدھم پڑ گئے تھے۔ تھرکنے والوں کے بدن بھی ساکت ہوتے جا رہے تھے۔ چند ساعت کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔

تب لڑکیوں کی سرلی چیخیں سنائی دیں اور وہ دوڑ دوڑ کر اس سے لپٹنے لگیں۔ وہ احراما! اس کے گالوں کے چٹخ چٹخ بوسے لے رہی تھیں اور واڑھی والا شخص خاصا بو کھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دس بارہ بٹے کٹے آدمی آگے بڑھے اور پیچھے سے ان لڑکیوں کو بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر اس سے جدا کرنے لگے۔ وہ شخص جیزی سے آگے بڑھا اور ایک مجتھے کے پیروں کے نزدیک بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور میں نے اس کی شخصیت میں ایک بہت ہی انوکھی خصوصیت محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے برقی رو نکل پر پورے مجمع پر سحر طاری کر رہی ہو۔ ذہن خواہ خواہ اس کی جانب راغب ہوتا تھا پھر اس کی گونج دار آواز ابھری۔

رقص و موسیقی کے متوالو! میں زندگی ہوں اور زندگی ہر بوجھ سے آزاد ہے۔ اپنے ذہنوں کو دنیا کے ہر تردد سے نکال لو۔ ماحول کے الجھے دھماکے تیارے لیے نہیں ہیں۔ ان دھاگوں کو توڑتے ہوئے نکل آؤ۔ یہ دھماکے تہذیب کی بھلوٹ ہیں۔ تم آزاد ہو لیکن کمزور اور بے بس کیڑوں کی طرح زندہ ہو۔ اپنی آزادی کو بھلوٹی تہذیب کے دھاگوں میں نہ الجھاؤ۔ تہذیب جو ایک مکڑی ہے، اور اس کے تانے بانے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تم اپنی بلند پرواز کو ان تانوں بانوں میں گم کر کے خود سے کیوں بے گانہ ہو گئے ہو؟

ایک ہی آواز تھی، ایک ہی نعرہ تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ان کی یہ بکواس سن چکا تھا۔ حالانکہ بے رہا تھا۔ چوک کے دوسری جانب سکندر سوئم کا مشہور پل تھا۔ وہاں سے وہ سڑک دریا کے کنارے جاتی تھی اور اس کے اختتام پر بیڑھیاں پانی میں اتر جاتی تھیں۔ بلاشبہ حسین ترین علاقہ تھا۔ میں اور ڈوڈو اس مجمع کے قریب پہنچے، جس کے درمیان سے موسیقی کی تانیں ابھر رہی تھیں۔ ان تانوں میں گلے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ انتہائی بے ڈھنگی اور بے نکی آوازیں جو میرے لیے ناقابل فہم تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ تفریح پسند فرانسیسی ان آوازوں پر سردھن رہے تھے۔ لڑکیوں رقص کر رہی تھیں۔ اس مجمع میں جتنے افراد تھے، کبھی کسی نہ کسی طرح تھرک رہے تھے اور مجمع کے درمیان ایک لمبا تڑنکا، واڑھی والا آدمی جھوم جھوم کر گٹار بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ قریب کھڑے ہوئے افراد سے اس طرح بے خبر نظر آ رہا تھا جیسے اسے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

میں نے اس کے گلے پر سردھننے والوں کا والمانہ پن دیکھا اور متعجب رہ گیا۔ عجیب و غریب لوگ تھے۔ حالانکہ نہ گانا میری سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ گٹار کوئی ایسا نغمہ بکھیر رہا تھا جو بہت ہی خوبصورت ہو یا ذہنوں کو متاثر کرتا ہو۔ بس ایک تیز دھن تھی اور اس میں اس شخص کی بے ہنگم آوازیں شامل تھیں لیکن آدمی اچھی شخصیت کا تھا۔ اس نے معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بدن پر وہ معمولی سا لباس خاصا جگ رہا تھا۔ دیر تک وہ جھوم جھوم کر گٹار بجاتا رہا پھر آہستہ آہستہ گٹار کے سرمدھم پڑ گئے تھے۔ تھرکنے والوں کے بدن بھی ساکت ہوتے جا رہے تھے۔ چند ساعت کے بعد وہاں خاموشی چھا گئی۔

تب لڑکیوں کی سرلی چیخیں سنائی دیں اور وہ دوڑ دوڑ کر اس سے لپٹنے لگیں۔ وہ احراما! اس کے گالوں کے چٹخ چٹخ بوسے لے رہی تھیں اور واڑھی والا شخص خاصا بو کھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسی اثناء میں دس بارہ بٹے کٹے آدمی آگے بڑھے اور پیچھے سے ان لڑکیوں کو بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر اس سے جدا کرنے لگے۔ وہ شخص جیزی سے آگے بڑھا اور ایک مجتھے کے پیروں کے نزدیک بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور میں نے اس کی شخصیت میں ایک بہت ہی انوکھی خصوصیت محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے برقی رو نکل پر پورے مجمع پر سحر طاری کر رہی ہو۔ ذہن خواہ خواہ اس کی جانب راغب ہوتا تھا پھر اس کی گونج دار آواز ابھری۔

رقص و موسیقی کے متوالو! میں زندگی ہوں اور زندگی ہر بوجھ سے آزاد ہے۔ اپنے ذہنوں کو دنیا کے ہر تردد سے نکال لو۔ ماحول کے الجھے دھماکے تیارے لیے نہیں ہیں۔ ان دھاگوں کو توڑتے ہوئے نکل آؤ۔ یہ دھماکے تہذیب کی بھلوٹ ہیں۔ تم آزاد ہو لیکن کمزور اور بے بس کیڑوں کی طرح زندہ ہو۔ اپنی آزادی کو بھلوٹی تہذیب کے دھاگوں میں نہ الجھاؤ۔ تہذیب جو ایک مکڑی ہے، اور اس کے تانے بانے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ تم اپنی بلند پرواز کو ان تانوں بانوں میں گم کر کے خود سے کیوں بے گانہ ہو گئے ہو؟

ایک ہی آواز تھی، ایک ہی نعرہ تھا۔ اس سے پہلے بھی میں ان کی یہ بکواس سن چکا تھا۔ حالانکہ بے

ڈوڈو مجھے لے کر اپنے بصرک میں پہنچ گیا۔ شام ہو گئی اور پھر نہ جانے کہاں سے لوگ اس عمارت میں آنے لگے۔ یہ پیرس کے معزز طبقے کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک فیشن ایبل، ایک سے ایک حسین عمدہ لباسوں میں ملبوس۔ ان کی کاریں عمارت کے مخصوص حصے میں کھڑی تھیں۔ میں نے انہیں ایک لان پر جمع ہوتے دیکھا۔ ڈوڈو اس وقت میرے پاس موجود نہیں تھا۔ یہاں موجود لوگ کچھ مخصوص مصروفیات میں..... گم تھے۔ اچھی گھاگھی تھی اور میں بصرک کی کھڑکی سے ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈوڈو مسکراتا ہوا آیا۔

”پیرس کیسا لگا؟“ اس نے پوچھا

”میرا خیال ہے تم نے سارے پیرس کا حسن یہاں جمع کر لیا ہے۔“

”اوہ نہیں۔ یہ تو صرف لاکھوں حصہ ہے۔ جینگو کی متعدد درس گاہیں پیرس میں پھیلی ہوئی ہیں۔“

”درس گاہیں؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں جہاں وہ ترلوکا کی تعلیمات کا درس دیتا ہے۔“

”اوہ۔ تو یہاں اور بھی عمارتیں ہیں؟“

”ہاں کئی عمارتیں۔“

”لیکن وہ وہاں کب جاتا ہے؟“

”دن مقرر ہیں۔ تمام درس گاہوں میں مقررہ اوقات اور مقررہ دنوں میں درس ہوتا ہے۔ لوگ یہاں بھی درس حاصل کرنے آتے ہیں۔“

”خوب۔ لیکن تمہارا ذریعہ پلٹی کیا ہے؟“

”وہ آواز جو ایک بار روح سے ٹکرا جائے ہمیشہ روح میں زندہ رہتی ہے۔ جینگو سڑکوں کا شہنشاہ ہے۔ وہ آوارہ انسانوں کی مانند پھرتا ہے اور اپنی آواز لوگوں کی روحوں کو سناتا ہے۔ بس اسے سمجھنے والے اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔“

”کمال ہے“ میں نے گردن ہلائی۔

”ابھی تم نے کچھ نہیں دیکھا پیکر۔ آگے دیکھو کیا کیا ہے۔ عظیم ترلوکا کا مشن ایک دن پوری دنیا لے گی۔ وہ انسانیت کا ہمدرد ہے۔“

دل تو چاہا کہ اس انسانیت کی دھجیاں اڑا دوں اور جینگو کو درست کر دوں لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔ لان پورا بھر چکا تھا۔ حالانکہ وہ نوجوانی کی عمر کے شوخ و سنگ لڑکے لڑکیاں تھے لیکن پورے ضبط کے ساتھ بیٹھے تھے، کوئی آواز نہیں تھی۔

”اگر تم چاہو تو خود بھی ان میں شریک ہو سکتے ہو“ ڈوڈو نے کہا۔

”کسی کو اعتراض تو نہیں ہو گا؟“

”ہمارے ہاں لفظ اعتراض کا وجود نہیں ہے۔“

”پھر میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔“

”میں اب جاؤں گا۔ انتظامی امور کی ذمہ داریوں میں کچھ حصہ مجھے بھی ادا کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے ڈوڈو“ میں نے جواب دیا۔ اور ڈوڈو چلا گیا۔

میں مختصر سی تیاریوں کے بعد باہر نکلا اور اس لان کی طرف چل پڑا جہاں وہ سب جمع تھے۔ بے شمار

میں اور بے شمار لڑکے۔ اپنے لباسوں سے صاحب حیثیت معلوم ہوتے تھے۔ کوئی میری طرف متوجہ

نہیں کیا۔ سب اپنی دھن میں مست خاموش بیٹھے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

میرے نزدیک ہی دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں گردنیں جھکائے خاموش تھیں اور یوں لگ رہا

تھیں کہ روحانی طور پر بھی جینگو سے متاثر ہوں۔ ڈوڈو اور دوسرے لوگ انتظامی امور میں مصروف تھے اور

میں نے لوگ انتظار کر رہے تھے۔ میں نے آکٹاہٹ سی محسوس کی اور قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف

”ایکسکیوز می مس۔“

لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں سوالیہ تاثرات نظر آئے۔

”معاف کیجئے دوسرے لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ ہم شناسا تو نہیں ہیں لیکن گفتگو

”ضرور جناب“ لڑکی کی آواز میں کوئی خاص تاثر نہیں تھا۔

”ابتداء تعارف سے ہو جائے۔“

”میرا نام کیشنو ہے“ لڑکی نے جواب دیا۔

”شکریہ“ مجھے پیکر کہتے ہیں۔ ویسے مس کیشنو، کیا آپ بھی ترلوکا کی مرید ہیں؟“

”نہیں، لیکن میں اس کی تعلیمات سے متاثر ہوں۔ اور باقاعدہ جینگو سے متفق ہونا چاہتی ہوں۔

کے افکار بہت پسند ہیں۔“

”اور اس کا فن؟“

”وہ بھی لا جواب ہے۔“

”آپ یہاں درس لینے آئی ہیں؟“

”ہاں۔ اس کے افکار دل کو روشن کرتے ہیں۔ جینگو ایک انوکھی کشش کا مالک ہے اور یہاں جتنے

میں نظر آ رہے ہیں سب اس کے پرستار ہیں۔ ارے ہاں یہ کہنے کی ضرورت بھی کیا ہے کیا تم اس

ماروں میں نہیں ہو؟“

”میں آج ہی یہاں آیا ہوں اور بد قسمتی سے اس سے میری ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی۔“

”اوہ۔ تم اس کے کسی رکن سے ملے تھے؟“

”ہاں۔“

”کس سے؟“ لڑکی نے دلچسپی سے پوچھا۔ اس کے انداز سے اجنبیت رخصت ہوتی جا رہی تھی۔

”اس کا نام ڈوڈو ہے۔“

”میں جانتی ہوں وہ پہاڑی؟“

”ہاں۔“

”تم دیکھو کیسے کیسے لوگ اس کے پیروکار ہیں۔ پھر جس کا وہ پیروکار ہوگا وہ کیا چیز ہوگا؟“

”ترلوکا کی بات کر رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”تم ان لوگوں کی کون سی بات سے متاثر ہو؟“

”تم خود سوچو مسٹر بیکر، کیا زندگی کے کسی لمحے میں تمہیں اپنے آپ سے ہمدردی نہیں محسوس

ہوتی۔ ہم کتنے مختصر وقت کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں لیکن ہماری روح پر کتنے بوجھ ہیں۔ کیا ہم اس بوجھ

کو اٹھائے اٹھائے پھرنے میں فرحت محسوس کرتے ہیں؟“

”ٹھیک ہے، واقعی انسان تو بڑی کمزور ہستی ہے۔“

”جینگو روح کا سراغ پا گیا ہے۔ مگر وہ صرف دوست روحوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ابھی ابھی چند

کی بات ہے، اس نے ایک انوکھا کارنامہ دکھایا۔“

”کیا؟“

”تم اس لڑکی کو دیکھ رہے ہو نا۔ وہ جو نیلی شال اوڑھے ہوئے ہے اور گرے کلر کے سوٹ والی

نوجوان کے پاس بیٹھی ہے۔“

”ہاں“ میں نے لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”لڑکی کا نام دیستان ہے اور نوجوان کا نام بیکر ہے۔ فرانس کا مہتمل ترین آدمی ہے اور وہ لڑکی

کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔“

”تھی سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”اب وہ اس کے اسٹور میں سیلز گرل نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”اب وہ اس کی بیوی ہے“ کیشنو مسکراتی ہوئی بولی۔

”اوہ۔ لیکن اس میں جینگو کا کیا کمال ہے؟“

”ہے“ اس نے زور دے کر کہا۔

”میں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اس نے پر لطف انداز میں کہا:

”مسٹر بیکر کے اتنے اسٹورز اور دوسرے کاروبار پھیلے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے اسٹاف کو پہچانتے بھی

نہ طاہر ہے ان کے منجبر و غیرہ ملازموں کے نگران ہوں گے۔“

”ہاں طاہر ہے“ میں نے گردن ہلائی۔ لڑکی کے گفتگو کرنے کا انداز مجھے پسند آیا تھا۔ اس کے ساتھ

مارے خدو خال بولتے تھے۔

”لیکن مسٹر بیکر، جینگو کو پسند کر بیٹھے اور ترلوکا کی تعلیمات میں شریک ہونے لگے۔ چلاک لڑکی کو

ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی جینگو کو پسند کرنے والوں میں شامل ہو گئی اور مسٹر بیکر کے ساتھ ان محافل

میں ہونے لگی اور پھر ایک دن اس نے مسٹر بیکر سے دل کا دم عاکہ ڈالا۔ مسٹر بیکر حیران رہ گئے۔ انہیں

کسی نہیں تھا کہ وہ ان کے اسٹورز کی سیلز گرل ہے۔ چنانچہ انہوں نے لڑکی سے معذرت کر لی۔ پھر

ترلوکا کی تعلیمات جاری تھیں کہ ایک انوکھا سوال پوچھا گیا۔“

”خوب“ میں نے پہلو بدلا۔

”جینگو کہہ رہا تھا، مجھے اس کے الفاظ آج بھی یاد ہیں“ کیشنو خواہ مخواہ اس چھوٹے سے واقعے

سے سنارہی تھی۔ لیکن مجھے بھی کوئی اور کام نہیں تھا، اس لیے میں بور نہیں ہو رہا تھا۔

”انسان ایک دوسرے کا سہارا نہیں بن سکتا کیونکہ وہ خود اپنا سہارا نہیں ہے۔ دولت بھی انسانوں کی

سات ہے، ورنہ جس وقت تہذیب نہیں تھی، لوگ جنگل میں رہتے تھے۔ اس وقت بھی وہ زندہ تھے۔

ن کے مالک تھے اور اپنی ہر آرزو صرف اپنی مرضی سے پوری کرتے تھے لیکن دولت نے ایک کو حاکم

کو محکوم بنا دیا۔ تہذیب کی اس روایت نے انسانوں سے ان کی مرضی چھین لی اس لیے ہمیں اس

زندہ رہ کر بھی دولت کا غلام نہیں بننا چاہیے۔“

”تو کیا مسٹر جینگو! اس دور کا انسان اپنی مرضی کا مالک بھی نہیں بن سکتا؟“ کسی نے سوال کیا۔

”بن سکتا ہے۔ اگر وہ دولت کی غلامی کو ترک کر دے۔“

”کیا ترلوکا کے پیروکار اس کی تعلیمات کے سہارے اس چیز کو بھلا سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔ اگر وہ ترلوکا سے مخلص ہیں۔“

”کیا آپ کسی کے خلوص کا جائزہ لیں گے مسٹر جینگو“ اس بار کھڑی ہونے والی لڑکی دیستان تھی۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو لڑکی؟“

”ترلوکا کی تعلیمات انسان کو تہذیب و ثقافت کے ورثے کو ترک کرنے کا درس دیتی ہیں۔ کیا یہ

س سے متفق ہیں؟“

”تم کسی خاص آدمی کی طرف اشارہ کر رہی ہو لڑکی؟“

”ہاں۔“

”وہ یہاں موجود ہے؟“

”ہاں۔ وہ موجود ہے۔“

”لڑکی! اتفاق سے تم نے میرے لیے یہ موقع فراہم کر دیا ہے جس کا میں بھی خواہش مند تھا۔ جاننا چاہتا تھا کہ لوگ میری باتوں سے کس قدر متاثر ہیں اور جو متاثر نہیں، ان پر میں کس طرح اثر ڈال کر ہوں۔ چنانچہ کھڑے ہو کر بتاؤ کہ تمہاری مراد کس شخص سے ہے اور تم اس سے کیا چاہتی ہوں؟“

”میں کراؤننز کے مسٹر بیکر کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا بیکر یہاں موجود ہے؟“ جینگو نے چاروں طرف دیکھا اور بیکر پریشانی کے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

”میں بیکر ہوں“ اس نے کہا۔

”کیا چاہتی ہو اس سے؟“ اس نے بیکر کی طرف اشارہ کر کے لڑکی سے کہا۔

”میں اسے دل و جاں سے زیادہ چاہتی ہوں۔ میں اس سے شادی کی خواہش مند ہوں۔ کیا میری

خواہش انسانی فطرت سے مختلف ہے؟“

”نہیں“ جینگو نے جواب دیا ”لیکن بیکر سے بات کرنا بھی ضروری ہے“ اور پھر وہ بیکر کی طرف

مخاطب ہوا ”مسٹر بیکر، کیا تمہیں اس لڑکی کی چاہت کا علم ہے؟“

”ہاں جناب۔“

”یہ لڑکی تمہیں زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے پسند ہے؟“

”یہ بات نہیں جناب، بس یہ میری حیثیت سے میل نہیں کھاتی، یہ میرے اسٹور کی سیلز گرل

ہے۔“

”آہ۔ اس میں اس کا کیا قصور ہے، تمہاری تہذیب نے تفریق کی ہے، ورنہ یہ تمہارے سارے

اسٹورز کی مالک بھی ہو سکتی تھی۔ نہیں بیکر، انسانیت کی یوں تذلیل نہ کرو، تمہیں اس لڑکی کو اپنا لینا

چاہیے۔“

”لیکن جناب! میری سوسائٹی، میرا معاشرہ اسے قبول نہیں کرے گا۔“

”اسی معاشرے سے اختلاف کرنا تو ہمارا مشن ہے میرے دوست۔ نزدیک آؤ“ جینگو نے کہا اور بیکر

اس کے قریب پہنچ گیا۔

”لڑکی تم بھی یہاں آؤ“ وہ بولا اور دیستان بھی نزدیک پہنچ گئی۔ ”تم دونوں کو معاشرے اور

تہذیب کے خلاف یہ قدم اٹھانا ہے، میں کہتا ہوں کہ اسے اپنالو۔“

”بیکر نے گردن جھکادی ”بولو اختلاف کرو گے؟“

”نہیں“ بیکر آہستہ سے بولا۔

”تب تم آئندہ محفل میں شریک ہو گے تو یہ تمہاری بیوی بن چکی ہوگی۔“

اور بیکر جیسے محصور ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ دوسری محفل میں آیا تو دیستان اس کی بیوی تھی۔“

”خوب“ میں نے گردن ہلائی۔ کیشنو مسکرانے لگی۔ اس وقت دور سے جینگو آتا نظر آیا اور

اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جینگو کی گردن میں گٹار لٹکا ہوا تھا اور وہ بڑے پروقار انداز میں چل رہا تھا۔

اس جگہ پہنچ گیا جو اس کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ لوگ عقیدت کی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے

”محبت کے متوالوں کی خدمت میں محبت کا سلام“ اس نے نرم آواز میں کہا اور گٹار کے تاروں پر

بھیر دیا۔ تانیں ابھریں اور خاموشی پھیل گئی۔

”یہ محفل محبت ہے۔ انسان آج سے ہزاروں سال پہلے کے دور میں ہے اور تہذیب و ثقافت کے

میں سے آزاد ہے۔ اس لیے اے محبت کے متوالو! ایک دوسرے کو چاہو تاکہ تمہارے دلوں سے

ت نکل جائے۔ تم آپس میں تفریق نہ محسوس کرو۔ ترلوکا کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ امر ہے اور وہ

جو ترلوکا کی زبان سے نکلی ہو، کسی کو دوبارہ جتنا اس کی توجہ بن کرنا ہے۔ اگر تم اس سے متفق نہ ہوتے تو

موجود نہ ہوتے۔ کیا میں جھوٹا ہوں؟“

”نہیں“ آوازوں کی ایک لہر اٹھی۔

”تو پیار کے دیوانوں کی خدمت میں محبت کا ایک نغمہ“ اس نے کہا اور گٹار سنبھال لیا۔ گٹار پر ایک

دھن بجتے لگی اور لوگ وجد میں آ گئے۔ لیکن کسی بے ہودگی کا مظاہرہ نہیں ہوا تھا۔ جو تعجب خیز بات

چند ساعت کے بعد جینگو نے گانا بھی شروع کر دیا تھا۔ فرانسیسی زبان میں وہ ترلوکا کی تعلیمات کا

کر رہا تھا۔ آواز اچھی تھی لیکن انداز بڑا بے ڈھنگا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نغمہ ختم ہو گیا اور لوگوں نے

سجائیں۔

”کسی کے ذہن میں کوئی الجھن تو نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا اور لوگ خاموش رہے۔ کسی نے کسی

کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بہت سے افراد پھیل گئے۔ وہ ٹرے اٹھائے ہوئے تھے اور ان برتنوں میں

سکرٹ تھے۔

عورت اور مرد کی مناسبت سے سکرٹ لے لیے گئے اور چاروں طرف چرس کا دھواں پھیل گیا۔

”تو یہ تمہیں جینگو کی محفلیں۔ بہر حال تھوڑی سی جدت تھی اور مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔

میں کا ایک سکرٹ میرا کیا بگاڑ سکتا تھا لیکن اس سکرٹ نے کیشنو کی آنکھیں سرخ کر دیں۔

”کیا نام بتایا تھا تم نے بیکر؟“

”کس کا نام؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنا۔ اور کس کا“
”پیکر“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”اوہ ہاں پیکر۔ سنو پیکر۔ ہمیں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کسی تردد کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“

”کیا ترلوکا کی یہی تعلیم ہے؟“
”ہے نا۔ تب تم مجھے پسند آئے ہو۔ میں تمہارا قرب چاہتی ہوں“ اس نے کہا اور میں نے بوکھلائی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لی۔ چرس کی سگریٹ نے ترلوکا کے عقیدت مندوں کے دل بے خود کر دیے تھے۔ اور اب وہ دنیا کے بنائے ہوئے اصولوں سے ہٹ گئے تھے۔ کسی کی نگاہ میں حیرت کا تاثر نہیں تھا۔ حجاب کیا چیز ہے اور اخلاقی اصول کیا ہے۔ جینگو کے ایک فقرے نے ان کے ذہن سے یہ خیال مٹا دیا تھا۔

فرار کے اس طریقہ کو بھرپور انداز میں پھلانے کے لیے ترلوکا سرفرست تھا اور ذہنوں کو بھٹکانے میں اس کے افکار بہت زیادہ سامنے آتے تھے۔ میرے ذہن میں اب یہ کرید لگ گئی تھی کہ میں ترلوکا کو قریب سے دیکھوں اور یہ جاننے کی کوشش کروں کہ اس سازش میں اس کا کتنا ہاتھ ہے اور اس کے خیالات کیا ہیں۔ کیا چاہتا ہے وہ اور انسانوں کو کس منزل تک لے جانے کا خواہش مند ہے؟
کیشنو جینگو کے تحفے سے اس قدر متاثر ہو گئی تھی کہ اس کے بعد بات یہیں تک محدود نہ رہی۔ میرا خیال ہے جینگو کی تعلیمات کا یہ آخری آئٹم تھا۔ کیونکہ متاثر ہونے والے جوڑے چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ کچھ اپنی کاروں میں بیٹھ کر چل پڑے تھے، چنانچہ کیشنو نے بھی میرے سامنے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے میری بات سنی پیکر، میں تمہارا قرب چاہتی ہوں۔ میں اخلاق اور اصول کے سارے بندھن توڑ کر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارے قرب کی خواہش مند ہوں، آؤ یہاں سے چلیں۔“
جانے والوں کو میں دیکھ ہی چکا تھا اور پھر جینگو کا مہمان تھا۔ سو اس کا رنگ قبول کرنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں کیشنو کو لے کر اپنی رہائش گاہ میں آ گیا۔ وہی رہائش گاہ تھی جو بہر حال میری اپنی نہیں تھی۔ لیکن بہر صورت میں ڈوڈو کا مہمان تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ڈوڈو کب اپنی بیرک میں واپس آیا اور کب چلا گیا۔ ہاں رات کی پرسکون نیند کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو کیشنو میرے پاس موجود نہیں تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کتنی گہری نیند سویا تھا۔ حالانکہ..... ابھی بہت زیادہ وقت نہیں ہوا تھا جب میں کیشنو کے ساتھ یہاں آیا تھا لیکن پوری رات گزر گئی تھی اور اب سورج کی روشنی کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر داخل ہو رہی تھی۔
میں نے اٹھ کر خود کو سنوارا اور پھر بیرک کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

سامنے ہی لوگ چل پھر رہے تھے۔ وہی خاموش خاموش سا انداز، وہی پرسکوت ماحول جو ہنگامی رنے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ میں چاروں طرف دیکھتا رہا۔ لیکن ڈوڈو مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ تھوڑے فاصلے پر موجود تھی جو پچھلی شام کافی لے کر آئی تھی۔
میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ میرے نزدیک آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر پر اخلاق مسکراہٹ تھی۔
”جناب!“ اس نے آہستہ سے سر جھکا کر کہا۔

”ڈوڈو کہاں ہے؟“
”کیا میں اسے بلاؤں؟“
”بلاؤ“ میں نے کہا اور وہ سر جھکا کر چلی گئی۔
”تھوڑی دیر کے بعد ڈوڈو مجھے اپنی جانب آتا نظر آیا۔ میں دروازے پر ہی کھڑا ہوا تھا۔ ڈوڈو کے مسکراہٹ پچھلی ہوئی تھی۔“

”کو دوست! رات کی نیند کیسی رہی؟“ ڈوڈو نے میرے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔
”پرسکون“ میں نے جواب دیا ”لیکن تم کہاں چلے گئے تھے؟“
”اوہو۔ ابھی تم اس ماحول کے عادی نہیں ہو۔ کیا تم اپنی محبوبہ کے ساتھ میری موجودگی برداشت کر سکتے ہو؟“

”نہیں نہیں۔ لیکن.....“ میں نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔
”میں آیا تھا اور قدرت کا ودیعت کردہ ایک فطری منظر دیکھ کر واپس چلا گیا“ ڈوڈو نے کہا اور میں نے نچائیں۔

اس کے بعد ڈوڈو سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس نے مجھ سے پوچھا:
”مجھے بلایا تھا پیکر، کیا کوئی خاص کام تھا؟“
”نہیں۔ بس یہی معلوم کرنا تھا کہ تم کہاں چلے گئے تھے اور ہاں وہ لڑکی بھی چلی گئی۔“
”کون سی لڑکی؟“
”وہی جو رات کو میرے ساتھ تھی۔“

”رات کو اس پر آزادی کا بھوت سوار تھا۔ لیکن دن کی روشنی بہت سے ذہنوں کو بدل دیتی ہے۔
نہیں بدلتے جو عام بندھنوں سے آزاد ہو کر صرف ترلوکا سے عقیدت رکھتے ہیں۔“

”جینگو کہاں ہے؟“ میں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

”موجود ہے۔ کیا اس سے ملاقات کرو گے؟“

”ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں۔“

”تو پھر ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے ملاؤ“ میں نے کہا۔

”پہلے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ۔ میں تمہارا ناشتہ بھجواتا ہوں۔ پھر جینگو سے ملاقات کرنا۔“

”ڈوڈو کیا جینگو آسانی سے لوگوں سے مل لیتا ہے؟“

”ہاں۔ کیوں نہیں۔“

”میرا مقصد ہے کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے اتنے پیروکار ہیں لیکن اس سے ملنے کے اوقات مقرر نہیں ہیں۔ اس کا کوئی اصول نہیں ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اصول۔۔۔۔۔ ہم اصولوں ہی کے تو دشمن ہیں۔ اصول کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ تم اگر جینگو سے

اس سلسلے میں پوچھو بھی نہیں اور اس کے پاس چلے جاؤ تو وہ مسکرا کر تمہیں خوش آمدید کہے گا۔ اگر کسی

ملاقات میں کچھ پابندیوں کو مد نظر رکھا جائے تو پھر یہ تو اصول ہو گئے اور ہم ان اصولوں سے نفرت کرتے ہیں

ہم تمدن و انسانیت کے بنائے ہوئے ان تمام اصولوں سے انحراف کرتے ہیں جنہوں نے انسان کو نظر

آنے والے پھندوں میں جکڑ لیا ہے۔ میرے دوست، ترلو کا کی تعلیمات کا ایک چھوٹا سا مظہر یہ عمارت ہے

تم یہاں جو چاہو کرو، یہاں کوئی اصول اور کوئی قانون رائج نہیں ہے“ ڈوڈو نے جذبات کے عالم میں کہا۔

”ہوں“ میں نے گردن ہلائی اور میرے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ٹھیک

ڈوڈو، اگر یہ بات ہے تو میں اس نظریے کو آزماؤں گا۔“

”ضرور ضرور۔ ڈوڈو کی طرف سے تمہیں دعوت ہے“ اس نے جواب دیا اور میں نہ سہتا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے لیے ناشتہ آگیا اور ناشتے سے فارغ ہو کر میں باہر نکل آیا کہ ذرا دیکھوں

سی جینگو نے یہاں کس قدر نظم و ضبط قائم کیا ہے۔

عمارت میں ان لوگوں کی مشغولیات عام تھیں۔ جس انداز میں کسی گھریلو ماحول کا تصور کیا جا سکے

ہے، وہی یہاں موجود تھا۔ لوگ صفائی ستھرائی میں مشغول تھے۔ کچھ لان سنوار رہے تھے، کچھ عمارت کی

صفائی کر رہے تھے۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ عمارت کے دروازے سے گزر کر اندر پہنچا۔ ایک

وسیع ہال تھا جس میں سامنے کے رخ پر ایک راہداری دور تک چلی گئی تھی۔ راہداری کے دونوں سمت کمروں

کے دروازے تھے۔ اختتام پر ایک اور بڑا دروازہ نظر آ رہا تھا جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

میں اس دروازے سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ بائیں ہاتھ پر مجھے ایک دروازہ نظر آیا جس پر ایک

پردہ لٹک رہا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

کمرہ صاف ستھرا اور خلصا کشادہ تھا۔ لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

سامنے ہی جینگو بیٹھا تھا۔ اس کے بدن پر لباس کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ وہ لباس سے عاری ایک

آرام کرسی پر تھکا تھکا سادہ از تھا۔ میں جھجک کر پلٹا تو اس کی بھاری آواز سنائی دی۔

”آؤ، واپس کیوں جا رہے ہو“

”میں ٹھٹھک کر رہا اور پھر اس کی جانب مڑا۔

”تم بے لباس جو ہو۔“

”بے لباس؟“ جینگو کی طنز بھری آواز ابھری ”تمہیں اس پر کیوں اعتراض ہے؟“

”مم۔ میرا مطلب ہے کہ تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں۔ حقیقت کی دنیا میں آؤ۔ کیوں فضول خیالات میں وقت گناتے ہو؟“

”اوہ“ میں نے گردن ہلائی اور پھر میں باقاعدہ اس کی جانب رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ جینگو کے ہونٹوں

ایک پر سکون مسکراہٹ تھی۔

”تم کون ہو، کیا ہو، کیوں آئے ہو، مجھے نہیں معلوم لیکن میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں، بیٹھ جاؤ“

اس نے انتہائی نرم لہجے میں ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کرسی

میں جاؤں۔ میری نگاہیں جینگو پر تھیں جو اپنی بے لباسی کے باوجود اس قدر پر سکون نظر آ رہا تھا جیسے اسے

کسی قسم کا کوئی تردد نہ ہو۔

اس کا جسم سڈول تھا۔ جسٹنی اعتبار سے وہ انتہائی طاقتور آدمی نظر آتا تھا۔ میں اسے کچھ دیر خاموشی

سے دیکھتا رہا۔ جینگو اس طرح میری جانب متوجہ تھا جیسے میری آمد کے بارے میں جاننے کا خواہش مند ہو۔

میں نے پر سکون لہجے میں کہا:

”میں تمہارا نیا مہمان ہوں جینگو اور تمہاری اس عمارت میں مقیم ہوں۔“

”اگر تم خود کو میرا مہمان اور اس عمارت کو میری عمارت سمجھتے ہو تو میں تمہیں اپنے مہمان کی

حیثیت سے اس عمارت میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ لیکن میرے دوست اگر غور کرو تو یہ عمارت نہ تو میری

ہے نہ تمہاری اور نہ کسی اور کی۔ جب تک اپنی بنیادوں پر کھڑی ہے، کھڑی رہے گی اور جب بوسیدہ ہو جائے

گی تو گر پڑے گی۔ آخر ہم ان بوسیدہ ہونے اور گر جانے والی عمارتوں پر تکیہ کیوں کریں۔ ہمارا کیا تعلق ہے

ان سے؟ ہم تو بے اختیار وجود میں آئے ہیں اور نہایت بے بسی سے چلے جائیں گے۔ ہم تو سفر پر آنے والے

مسافر ہیں اور مسافر کا کچھ نہیں ہوتا۔ تم میری بے لباسی سے جھجک رہے ہو۔ ذرا ان معصوم بچوں کے بارے

میں بتاؤ جو مل کے شکم سے بے لباس آتے ہیں۔ ہم جو اپنے لیے اصول تراش چکے ہیں، ان کے جسموں کو

انہی اصولوں میں قید کر دیتے ہیں۔ گویا بنیادی طور پر انسان، انسان کا دشمن ہے۔ سب سے پہلے وہ اسے قید

کرتا ہے اور اس کے بعد اپنی طاقت سے کلام لے کر اس کی شکم سیری کرتا ہے۔“

”میرا خیال ہے جینگو، ہم اس کو ظلم نہیں کہہ سکتے۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اس لیے کہ جب بچہ کھلی فضاؤں میں سانس لیتا ہے تو اسے بدلی ہوئی آب و ہوا کے تحت کچھ

چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب یہ چیزیں اسے میسر نہیں ہوتیں تو اس کی زندگی دشوار گزار ہو جاتی

ہے۔ چنانچہ اس کی قید ایک طرح سے پہلا احتیاطی قدم ہوتا ہے جس کو ضرورت نے جنم دیا ہے۔
”اوہ تم نے ٹھیک کہا۔ لیکن اس دور کی بات کرو جب لباس کا وجود نہیں تھا۔ کیا نمود وہیں سے جاری نہیں ہوئی۔ کیا سرد غاروں میں پیدا ہونے والے بچے موت کا شکار ہو جایا کرتے تھے؟“ جینگو نے سوال کیا۔

”ہاں۔ اس وقت انسانیت بڑی بے بس تھی۔ وحشت کے اس دور میں انسانی زندگی جس قدر ارزاں تھی اس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو، بے شمار افراد زندگی کی ضروریات پوری نہ ہونے کی وجہ سے مر جاتے تھے۔ غذا کا نظام اس قدر بستر نہ تھا۔ غور کرو چھوٹے چھوٹے معصوم بچے پتھروں اور دانتوں کی ہڈیوں سے بنے ہوئے ہتھیاروں سے جانوروں کا شکار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر انہیں ایک اصول کے تحت غذا فراہم نہ کی جاتی تو وہ زندگی کہاں سے پاتے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ انسان کی نمود کے فوراً بعد بلکہ اس کی نمود سے کچھ پہلے ہی کچھ اصولوں کی بنیاد رکھ دی گئی تاکہ ان کے ذریعے زندگی پرورش پائے تو غلط نہیں ہے“ میں نے کہا اور جینگو کے چہرے پر تردد کے واضح اثرات نظر آنے لگے۔ شاید وہ خود کو کسی حد تک لاجواب محسوس کر رہا تھا۔ اس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اچانک ہی مجھے اپنے بدن میں سردی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

جینگو کی نگاہوں میں عجیب سی چنگاریاں رقص کر رہی تھیں اور مجھے اپنا وجود مفلوج ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

”میرے دوست میں تمہیں اپنے افکار و خیالات سے کسی مناسب وقت پر آگاہ کروں گا۔ میرا خیال ہے تم اس بھنگی ہوئی تہذیب کی دلدل میں اس قدر غرق ہو چکے ہو کہ آسانی سے نہیں سمجھ سکو گے۔ اس کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار ضروری ہے“ جینگو کے انداز میں وہ گرم جوشی اور وہ تپاک نہیں رہا تھا جو تھوڑی دیر قبل تھا۔

لیکن میری زبان جیسے اینٹھ سی گئی تھی۔ پورا بدن سرد ہو گیا تھا۔ میں نہ تو کچھ سوچ سکتا تھا نہ کچھ بول سکتا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں جینگو کو کوئی جواب دوں۔ اپنی اس کیفیت سے مجھے سخت پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔

اسی وقت دو افراد کمرے میں داخل ہو گئے اور جینگو چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ جونہی جینگو کی نگاہیں مجھ سے ٹپیں، میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کی وہ کھچاؤٹ اور بے بسی ختم ہو گئی ہے۔

ان دونوں نے جینگو سے کچھ کہا۔ جینگو فوراً ”کھڑا ہو گیا۔

”مجھے تھوڑی دیر کے لیے اجازت دو میرے مہمان۔ تم اپنی قیام گاہ میں آرام کرو اور بے فکر رہو۔ میں تم سے بہت جلد ملاقات کروں گا اور تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر کے مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے تمہارے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتے ہو۔ سنو تمہارا نام کیا ہے؟

”پیکر“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں مقیم ہو؟“

”ڈوڈو کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر۔“

”کیا تمہیں وہاں کوئی تکلیف ہے؟“

”نہیں۔ انسانیت سے بغاوت کے جراثیم میرے اندر بھی موجود ہیں لیکن بہت تھوڑے سے۔

”چنانچہ میں کسی تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتا اور نہ اپنی ذات کی تکلیف کو کوئی اہمیت دیتا ہوں۔“

”اوہو“ جینگو نے میری جانب دیکھا اور کہا ”خاصا بول لیتے ہو۔ لیکن میں تم سے اس موضوع پر

کسی اور وقت گفتگو کروں گا۔ اپنی مصروفیت کی بنا پر ہم اس وقت سکون سے تہاولہ خیال نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے جینگو“ میں انتظار کروں گا۔ اور ہاں میں وعدہ کرتا ہوں اگر میں تمہارے افکار و خیالات

سے متعلق ہو گیا تو تمہارے ایسے پیروؤں میں شامل ہو جاؤں گا جن پر تم ہمیشہ ناز کرو گے۔“

جینگو استہزائیہ انداز میں ہنس دیا اور گردن ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل

گئی اور میں بھی اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

اس کھلے دل والے شخص پر میں نے اچھی طرح غور کیا تھا اور یہ اعتراف کیے بغیر نہ سکا کہ جو

ہومنگ انہوں نے رچایا تھا اس میں وہ انتہائی فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ جو پابندیاں انہوں نے ختم کی تھیں،

میں پر وہ خود بھی عمل کرتے تھے اور جینگو مجھے اپنی اس قیمتی رہائش گاہ میں اس طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا جیسے

یہاں سے اسے کسی چیز کے گم ہونے کا ڈر نہ ہو۔ اور یہ اعتماد یقیناً ”ایک اچھی بات تھی۔

میں اس کمرے سے باہر نکل کر ٹھٹھا ہوا عمارت کے دوسرے حصوں کو دیکھنے لگا۔ خاصی وسیع اور

کشادہ عمارت تھی اور ہر قسم کی ضروریات سے آراستہ وہاں کافی افراد تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد

بھی لیکن سب کے سب خاموش اور ایک دوسرے سے دلچسپی نہ رکھنے والے۔ پھر میں رہائش گاہ سے باہر

نکل آیا اور ڈوڈو کی رہائش گاہ کی جانب چل پڑا۔

ڈوڈو اپنے کمرے میں موجود نہیں تھا۔ ایک بستر پر لیٹ کر میں نے اپنے پاؤں دراز کیے اور جینگو

سے اپنی اس دلچسپ ملاقات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ اچانک ایک سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔

اس وقت جب جینگو نے مجھے دیکھا تھا میری قوت گویائی کیوں سلب ہو گئی تھی۔ یہ سوال مجھے

پریشان کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مقناطیسییت دیکھی تھی اور اس وقت

جب اس نے گہری نگاہوں سے میرے وجود کا جائزہ لیا تھا میرے بدن میں سرد لہریں سی دوڑنے لگی تھیں۔ وہ

کیا تھا؟ اگر اس طرح اس نے میری قوت گویائی سلب کر لی تو پھر میں نہ تو بول سکوں گا اور نہ وہ کلام کر سکوں گا

جو کرنا چاہتا ہوں۔

میں سوچتا رہا۔ آخر وہ قوت کیسی تھی؟ کیا جینگو کے سامنے آنے والے اس کی آنکھوں کی قوت

سے ہی مسکرا رہے ہیں۔ کیا وہ پھانٹ ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر ترلو کا بھی کوئی ایسی ہی پر اسرار قوت ہوگی۔

کوئی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ایک اجنبی لڑکی تھی جو اندر آ رہی تھی۔

”ہیلو“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

”اوہ سو دی جتاپ۔ کیا مسٹر ڈوڈو موجود نہیں ہیں؟“

”نہیں۔ کہیں گئے ہوئے ہیں“

”آپ یہیں رہتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میرا مطلب ہے پہلے تو.....“

”ہاں ڈوڈو میرا دوست ہے۔ آپ چاہیں تو اس کا انتظار کر لیں۔ ممکن ہے آئی جائے۔“

”مسٹر جینگو کے ساتھ گئے ہیں؟“

”شاید نہیں۔“

”شاید مجھے اجازت دیں۔“

”جیسی آپ کی مرضی، ویسے کیا آپ یہیں رہتی ہیں؟“

”اوہ نہیں۔ میں پیرس کے ایک نواحی علاقے میں رہتی ہوں۔ دوسرے تیسرے روز اوہر آتا ہوتا ہے۔ آج آئی تو سوچا کہ ان سے ملتی چلوں۔“

”کیا آپ بھی ترلو کا کے افکار کی گرویدہ ہیں؟“

”جی نہیں۔ میں حقیقت کی دنیا میں رہتی ہوں۔ مجھے زندگی اور انسانوں سے پیار ہے۔ میں انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں سے دلچسپی رکھتی ہوں۔ ان جھوٹی فضلوں میں نہیں رہتی جس میں آپ لوگ رہتے ہیں۔“

”پھر ڈوڈو اور آپ کی دوستی کیسے ہو گئی؟“

”کوئی گمراہی رشتہ نہیں ہے۔ بس اس نے ایک بار میری تھوڑی سی مدد کی تھی۔ میں اس کی شکر گزار ہوں۔“

”اگر آپ چاہیں تو اس کے لیے کوئی پیغام دے دیں۔“

”ارے نہیں کوئی پیغام نہیں۔ پھر کبھی آئی تو مل لوں گی۔ اچھا اجازت“ اس نے کہا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”اپنا نام بھی نہیں بتائیں گی آپ؟“

”کیا ضرورت ہے؟“ لڑکی لاپرواہی سے بولی اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اس دیوانگی کا شکار نہیں تھی لیکن بہت جلد وہ

میں سے نکل گئی اور میں جینگو کی اس سیاست کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی اثناء میں ڈوڈو آگیا۔

”کیسے ہو میرے دوست؟“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں ڈوڈو۔“

”جینگو سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں۔“

”قریب سے دیکھنے پر وہ کیسا لگا؟“

”نہایت پراثر۔“

”میں نہ کہتا تھا“ ڈوڈو کے ہونٹوں پر..... مسکراہٹ دوڑ گئی ”وہ مقناطیس ہے، کون ہے جو اس

نہیں ہوتا۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے ڈوڈو، لیکن ایک بات تو بتاؤ۔“

”پوچھو، ضرور پوچھو میرے دوست۔“

”کیا جینگو کو میرے بارے میں معلوم تھا؟“

”کیا معلوم تھا؟“

”جی نہیں، میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں۔ تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟“

”ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔“

”اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ کسی ملاقات کے بارے میں بتانا اصول بن جاتا ہے

رہے ہم اصولوں کے ہی مخالف ہیں۔“

”خوب۔ میں نے اس سے کچھ بحث بھی کی تھی۔“

”کس سلسلہ میں؟“

”اس کی برہنگی کے سلسلہ میں۔“

”اوہ“ ڈوڈو نے قہقہہ لگایا۔ ”یہ کون سی نئی بات ہے۔ بہر حال اس نے تمہیں قائل کر دیا ہوگا۔“

”بات مکمل نہیں ہو سکی۔ کچھ لوگ آگئے تھے۔“

”وہ تمہیں پورے طور سے مطمئن کر دے گا۔ اس کی فطرت ہے۔“ ڈوڈو نے عقیدت بھرے

صوت سے کہا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈوڈو جینگو کی عقیدت سے سرشار ہے اور اس کے خلاف کچھ سننا

میں کرے گا۔ اس لیے اس سے گفتگو میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے زیادہ گفتگو

کی۔

”میں اس سے دوسری ملاقات ضرور کروں گا۔“

”دوسری کیا؟ اب تو ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں پیکر وہ عجیب ہستی ہے۔ تم نے اس جیسا دوسرا شخص نہیں دیکھا ہوگا۔“

”ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“

”وہ نہ جانے کتنی دولت کا مالک ہے۔ لیکن اگر کوئی اجنبی اسے بھیک بھی دیتا ہے تو وہ قبول کر

ہے۔ اس کی ذات سے بہت سے دلچسپ قصے وابستہ ہیں۔“

”تم کہاں سے اس کے ساتھ ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹرلوکا کے ساتھ؟“

”نہیں میرا مطلب ہے جینگو کے ساتھ۔“

”طویل عرصہ سے۔ میں تو ہوں ہی امریکن۔“

”اوہ۔ تم امریکن ہو؟“

”ہاں۔ تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟“

”خدا و خال اور عادات و اطوار سے تم امریکن نہیں معلوم ہوتے۔“

”میں امریکہ کی ایک ریاست کے دیہات کا باشندہ ہوں اور وہاں کا مشہور ریسلر تھا۔ بڑی

کشتیاں جیتی ہیں میں نے اور امریکہ کے لوگ چیمپئن ڈوڈو کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اب دوسری چیز ہے۔ اب تو اگر وہ قوت آزمائی کرتا ہے تو صرف ٹرلوکا کے مفادات کے لیے۔“

”خوب۔ تو تم پہلوان ہو؟“

”ہاں۔ چھ سال سے چیمپئن ہوں شکاگو کا۔ اور آخر تک نہیں ہارا۔ میں نے اعلان کیا تھا کہ جس

بار جاؤں گا اسی دن سے کشتیاں لڑنا چھوڑ دوں گا۔ لیکن ہارا نہیں۔ اور ہارا بھی تو صرف مسٹر جینگو سے۔“

”جینگو سے؟“

”ہاں۔ کسی کی عظمت کو قبول کرنا میرے نزدیک ہارنے ہی کے برابر ہوتا ہے۔“

”اچھی بات ہے ڈوڈو، مجھے پسند آئی“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈوڈو چلا گیا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔

ان سارے معاملات کے جاننے کا مجھے شوق تھا اور اس پر اسرار تحریک نے مجھے خود بھی الجھا دیا تھا

لیکن اس کے باوجود میں اپنی دلچسپیاں بھی ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس عمارت میں خاصا وقت گزر گیا تھا اور یہاں کی تفریحات دلچسپ بھی تھیں۔ لیکن فرانس میں اور کچھ بھی تھا اور میں اس سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔

یہ شام اور اس شام تھی۔ آج یہاں کوئی پروگرام بھی نہیں تھا۔ جینگو کا درس کہیں اور تھا۔ ڈوڈو

تھ نہیں آیا کہ میں اس سے اس مقام کے بارے میں پوچھتا۔ چنانچہ میں خود ہی باہر نکل آیا۔

بوئے ڈی بولون کی حسین بستی، دریائے سین کے خاموش پانی کے ساتھ میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ دریا کی جانب کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے مکانات بکھرے ہوئے تھے۔ چند جگہوں پر ہاؤس بوٹ تھر رہے تھے۔ ان کے دروازوں پر اکثر خونخوار کتے نظر آتے تھے۔ ہاؤس بوٹوں کا تم ہوا تو شاہ بلوط اور بید کے درختوں میں گہری ایک سیرگاہ نظر آئی جس کے کنارے چند لوگ مچھلی میں مشغول تھے۔

میں چلتا رہا۔ پیرس کا دور تک کا علاقہ دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ یہاں تک کہ زیر زمین ریلوے تک پہنچ گیا اور پھر زیر زمین ریلوے کے شاندار نظام کو دل میں سراہتا رہا۔ پھر ایفل ٹاور اسٹیشن پر پہنچ

ایفل ٹاور اپنی روایتی بلندیوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے نیچے سیاحوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ مگر اگر آکس کریم بیچنے والے، تصویر کارڈ بیچنے والے اور پھر نزدیک نزدیک بکھرے ہوئے قبوہ خانے، روایتی رونق یہاں نظر آتی تھی۔ دیر تک میں اس رونق میں کھویا رہا۔ ملک ملک کے لوگ نظر آ رہے اور میں ان میں اپنے ہم وطنوں کی شکلیں بھی دیکھ رہا تھا۔ ان احساسات کا تذکرہ نہیں کروں گا جو ان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ کیونکہ ان میں مایوسی اور اداسی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد واپس جینگو کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔

وہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لان تاریک پڑا تھا۔ رہائش گاہ میں ڈوڈو مل گیا۔ وہ آرام سے لیٹا تھا۔ کر بیٹھ گیا۔

”آؤ آؤ۔ کہاں چلے گئے تھے؟“

”بس ایسے ہی گھومنے نکلا تھا۔ لیکن آج مجھے پیرس کی سڑکوں پر جینگو نہیں نظر آیا۔“

”میرا باس“ ڈوڈو ہنس پڑا۔ آج وہ تبلیغ کے موڈ میں تھا اور یہ فرانس کی پولیس کے لیے برادن

”کیوں؟“

”بس جینگو کی فطرت میں مزاح کا عنصر بھی ہے۔ آوارہ گردی کرتے ہوئے ایک ایسی عمارت نظر آئی جس میں ایک تقریب تھی۔ نہ جانے اسے کیا سوچھی کہ وہ اس عمارت کی طرف چل دیا لیکن باہر کھڑے آدمیوں نے اس کے لباس کی وجہ سے اسے اندر داخل ہونے سے روک دیا۔ جینگو واپس آیا اور اس کے بعد وہ دوبارہ اسی تقریب میں پہنچا۔ اس کے بعد جو ڈرامہ کی تفصیل دلچسپ ہے۔“

”کیا ہوا؟“ میں بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں اس کی تفصیل اسی انداز میں سناؤں گا تاکہ پوری طرح لطف اندوز ہو سکو۔ جب ایک عمدہ کار میں اندر داخل ہوا تو میں اس کی کار چلا رہا تھا اور میرے بدن پر ڈرائیور کی وردی تھی۔ بڑے جفاکوری لوگ موجود تھے وہاں۔ دولت کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ زیورات اور اعلیٰ لباس کے مالک اعلیٰ شراب، سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے اور ایک لمبا ترنگا شخص جو اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس قریب آگیا۔ ان دونوں کے درمیان جو مکالمے ہوئے وہ یوں تھے:

”تشریف لائیے جناب! میری بد قسمتی ہے کہ میں آپ کو پہچان نہیں سکا تھا۔“

”آپ اس عمارت کے مالک ہیں؟“

”جی ہاں۔ میرا نام بونگسن ہے۔ پر نکلیں نواؤ فرمیں۔“

”اور میں جینگو ہوں“ جینگو نے کہا اور کوٹ کے مٹن کھول دیے۔ تب بونگسن نے اپنے ملازم کو اشارے سے بلایا۔

”مسٹر جینگو کا کوٹ احتیاط سے رکھ آؤ۔“

”لیس سر“ ملازم نے ادب سے جھک کر کوٹ لیا اور چل پڑا لیکن اس دوران جینگو نے واسکٹ اتار دی تھی۔ بونگسن نے پھر ہاتھ بڑھایا اور واسکٹ لے لی۔ لیکن جب جینگو نے شرٹ بھی اتار کر کے ہاتھ میں دی اور اوپر کے بدن سے برہنہ ہو گیا تو بونگسن کی بوکھلاہٹ قاتل دید تھی۔

اس نے گھبرا کر مہمانوں کی طرف دیکھا جو اب اس دلچسپ شخصیت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور وقفے میں گڑبڑ ہو گئی۔ مسٹر جینگو کے بدن پر چٹلون بھی نہیں رہی اور جب بونگسن ان کی جانب پلٹا تو کر رہ گیا۔

یہ.... یہ کیا حماقت ہے۔ کیا تم۔۔۔۔ کیا تم پاگل ہو؟“

”کیوں میرے عزیز دوست، تمہارے ذہن میں یہ خیال کیسے پیدا ہوا؟“ جینگو نے پوچھا۔

”میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے، اے سو، تم اسے یہاں سے لے جاؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“

پاگل ہے تو اسے پاگل خانے میں داخل کراؤ۔“

”نہیں جناب! بلکہ میرا لباس اگر مجھے اجازت دے تو میں اس بد تمیزی پر تمہیں ہمیشہ کے لیے گویائی سے محروم کر دوں“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”کک، کیا بکواس کر رہے ہو؟“ مسٹر بونگسن پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی مہمانوں کو اور کبھی

اور کبھی مسٹر جینگو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

تب مسٹر جینگو مہمانوں کی طرف بڑھے اور کافی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ کچھ لوگ ناراض

کا اظہار کر رہے تھے اور کچھ قہقہے لگا رہے تھے۔ خاص کر نوجوان مسٹر جینگو کو بڑی دلچسپی سے دیکھ

تھے۔ مسٹر جینگو.... نے مجھے اشارہ کیا اور میں بھاگ کر کار سے گٹار نکل لایا۔

میں نے گٹار مسٹر جینگو کے ہاتھ میں دیا اور مسٹر جینگو نے گٹار کے تاروں پر ہاتھ پھیرا۔ لوگ ان کی متوجہ ہو گئے تھے۔

”عزیزو! میں زمین پر بسنے والے کمزور انسانوں کا حقیقی نمائندہ ہوں اور تمہارے سامنے آتے ہوئے

میں چاہا کہ میں لباس حقیقی ہی میں تم سے گفتگو کروں۔“

”بیسر بیسر بیسر“ نوجوانوں نے تالیاں بجائیں۔

”میں تمہاری چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو لوٹنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ مسٹر بونگسن کی اس

ب میں کوئی گڑبڑ پیدا کروں۔ لیکن تمہارا اجتماع دیکھ کر اپنی آواز تمہارے کانوں تک پہنچانے کی خواہش

میں دل میں پیدا ہو گئی اور میں یہاں چلا آیا۔ صرف یہ کہنے کے لیے کہ زندگی کی دلچسپیوں میں لباس کے

ن بے حقیقت ہیں۔ اگر تم سب اس جگہ کپڑوں کے جال سے آزاد ہو جاؤ تو تم محسوس کرو گے کہ

کی خوشیاں کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔“

”میں کہتا ہوں، میں کہتا ہوں یہاں سے نکل جاؤ“ پیچھے سے مسٹر بونگسن نے جینگو کو پکڑنے کی

کوشش کی لیکن میں زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے مسٹر بونگسن کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ بونگسن چیخ

ملازموں کو بلارہا تھا اور تھوڑی دیر میں اچھا خاصہ ہنگامہ ہو گیا۔

تب نہ جانے کس طرح پولیس وہاں پہنچ گئی اور اس نے مسٹر جینگو کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ پولیس نے

اس کے لباس سے لے کر اس کی درخواست کی لیکن مسٹر جینگو نے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ حقیقت کے لباس

میں اور یہ قدرتی لباس کسی بھی طور قاتل اعتراض نہیں ہے۔ پولیس مسٹر جینگو کو لے کر چل دی اور

میں مسٹر جینگو نے پولیس کو قائل کر دیا کہ وہ درست کہہ رہے تھے۔ پولیس والوں کو انہیں چھوڑنا پڑا

ان سے استدعا کی گئی کہ وہ دوبارہ بونگسن کی کوٹھی نہیں جائیں۔“

”کمال ہے“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا ”ویسے اس کی رہائش گاہ میں میں نے بھی اسے بے

لایا تھا۔“

رات کو حسب معمول میں نے کھانا وغیرہ کھایا اور آرام کرنے لیٹ گیا لیکن تقریباً گیارہ بجے ہوں

ب ڈوڈو نے مجھے پکارا ”وہ کیس سے آیا تھا۔“

”کیا بات ہے ڈوڈو؟“

”مسٹر جینگو کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”چلوں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ بہت کم کسی کو اتنی دلچسپی سے طلب کرتے ہیں“ ڈوڈو نے کہا اور میں اس کے ساتھ باہر

آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں جینگو کے ساتھ تھا۔ اس وقت اس کے بدن پر لباس کا انبار تھا اور چہرے

وہ ایک عظیم مدبر نظر آ رہا تھا۔ تین آدمی اس کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اور جینگو سنجیدہ تھا۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ان آنکھوں میں بڑا جلال تھا۔ مجھے اپنے وجود میں ٹھنڈک کی محسوس ہوئی۔

”بیٹھو نوجوان، تمہارا نام پکیر ہے نا؟“

”ہاں۔“

”ہماری گفتگو ادھوری رہ گئی تھی پکیر۔“

”ہاں مسٹر جینگو۔“

”بیٹھ جاؤ نوجوان۔ میں تم سے ضروری گفتگو کروں گا“ اس نے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ لیکن اس مرتبہ میں نے چالاکی سے کام لیا اور اس سے نگاہیں ملانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جینگو نے نہایت نرم لہجے میں کہا:

”ترلوکا کا مشن صرف یہ ہے کہ ہم کمزور انسان جو حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور اپنی مرضی کے بغیر مر جاتے ہیں، ان بندھنوں سے آزادی حاصل کریں، جو تہذیب نے ہمارے گرد پھیلا رکھے ہیں۔ تم غور کرو ہماری چند روزہ زندگی میں کچھ خواہشات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں لیکن معاشرے کے بنائے ہوئے اصول اگر ان خواہشات کو بھی پورا نہ ہونے دیں تو پھر دنیا میں آنے کا کیا فائدہ؟“

”ٹھیک ہے جینگو، لیکن اگر تم پتھروں کے دور کی بات کرتے ہو تو اس دور کا انسان وحشی اور ناقابل بھروسہ تھا۔ جبکہ آج کا انسان نہ تو وحشی ہے اور نہ ناقابل بھروسہ۔“

”نا قابل بھروسہ اور وحشی نہ کہو میرے دوست۔ اگر انسانیت کا یہی مزاج رہے تو کیا برا ہے؟“

”بہت برا ہے جینگو۔ خاص طور سے اس وقت جب زمین وجود میں آئی تھی اور انسان پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس وقت انسانی آبادی بہت کم تھی۔ اس کے ذرائع بہت کم تھے۔ وہ جنگلوں میں شکار کرتا تھا۔ لوگوں میں خلوص نہیں تھا۔ اگر انسانوں نے انسانوں کے بارے میں سوچا اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا ارادہ کیا تو اس میں کیا برائی ہے؟“

”کوئی برائی نہیں ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔ لیکن ہمیں ایسے اخلاق اور ایسے تمدن کی ضرورت نہیں ہے جو ہماری خواہشات کو زندگی کی قیمت دے کر حاصل کرنا پڑیں۔ انسان اپنی کمزور ہستی کو دوسروں کا پابند کیوں کرے۔ تم خود سوچو کیا یہ صحیح ہے۔“

”ٹھیک ہے جینگو، لیکن اخلاقی اقدار سے روگردانی مناسب نہیں ہے۔“

”تو کیا ہماری سوچ غلط ہے؟“

”نہیں۔ لیکن معاشرے کے کچھ اصول و ضوابط بھی ہوتے ہیں۔“

”اصول، اصول کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم تہذیب کے بنائے ہوئے ان اصولوں ہی کے تودشمن ہیں۔“

”نہیں جینگو، یہ بات غلط ہے۔ ہمیں معاشرے کے اخلاق و ضوابط کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ انسان ضرور ہو لیکن کرم نہ ہو۔ کیا ضروری ہے کہ آزادی اپنے اخلاقی اقدار اور اصولوں کو روند کر حاصل کی جائے؟ جینگو آزادی اپنے اخلاقی اقدار کو برقرار رکھ کر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہماری زندگی پر یہ چیزیں حاوی ہیں۔“

”لیکن ہم ان چیزوں کی نفی کرتے ہیں۔ ہم اپنی اخلاقی اقدار سے نجات چاہتے ہیں۔ کیا دیتی ہیں یہ موت، زندگی سے عاری مردہ حیات، جس میں خوشی کی کوئی رمت تک نہیں۔“

”لیکن تم رشتوں کے تقدس کو کیوں بھول رہے ہو جینگو۔ ہمارے ہاں ماں باپ، بیٹی، بہن بھائی رشتے ہوتے ہیں اور ان سب پر ایک دوسرے کا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنوں کی اس تمیز کو چھینیں گے تو خود کو خوش نہیں رکھ سکیں گے۔“

”جنس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”زندگی کی آرزو پیدا کرتی ہے۔ نمود کے فرائض انجام دیتی ہے“ میں نے کہا۔

”پھر یہ قید کیوں ہے؟“

”معاشرے نے اس کے لیے اصول بنا دیے ہیں۔ دنیا کے کسی مذہب نے جنس پر پابندی نہیں لگائی۔ ہاں کچھ اقدار کچھ سارے ضروری ہیں۔“

”اے جینگو، مذہب، مذہب۔ کون سے مذہب کی بات کرتے ہو، انہوں نے خود کو منوانے کے لیے ایک خدا تخلیق کیا ہے۔ اسے خدا، گوڈ، اوم کہا کہ باقی سب جانے پہچانے تھے اور انسان ان سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو ان کتابوں کو ان میں گوڈ کہاں ہے؟“

”جینگو نے چند کتابیں نکل کر میری طرف اچھال دیں اور کتابیں زمین پر گر پڑیں۔ تب ایک کتاب درمیان سے کھل گئی۔ میں نے دیکھا وہ میری کتاب تھی اور اس پر میرا ایمان تھا۔

ایک گناہ گار انسان ضرور تھا۔ میں نے مذہب، انسانیت، معاشرہ سب کی دجیاں اڑائی تھیں۔ میں کبھی اس سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ میری کتاب تھی۔ وہ مقدس تصور جو زندگی کی سخت ترین گھٹن میں میرا تھکا ہوا مجھے سکون دیتا تھا۔

میرا ذہن تاریک ہو گیا۔ میری سوچ مردہ ہو گئی۔ میں نے اس مقدس کتاب کو اٹھایا۔ میرے دل میں آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے پینہ آگیا تھا۔ میں نے اس کتاب کو سینے سے لگا لیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اپنے سینے میں سمیٹ لوں۔ میں دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ پھر میں نے ادب سے اسے ایک طرف رکھ دیا۔

”جینگو“ میری آواز میں بے پناہ غراہٹ تھی۔ اس نے ان سب کو لرزادیا۔ ”جینگو کتے تو نے“

”ہاں انسان نے کائنات کی توہین کی ہے۔ میرا رواں رواں اس مقدس کتاب کے تقدس کا امین ہے۔ سخت ذلیل انسان میں تجھے فنا کر دوں گا“ نہ جانے میری آواز کو کیا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک وحشیانہ دھاڑ کے

ساتھ اس پر چھلانگ لگا دی اور جینگو کو رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ کمرے میں شدید ہڑونگ مچ گئی۔ میں نے اپنے دانتوں سے جینگو کو اوجھڑا لیا۔ میں نے اسے لہولہا کر دیا۔

”خدا کی قسم، خدا کی قسم میں تجھے فنا کر دوں گا۔ میں ترلوکا کو..... صفحہ ہستی سے مٹا دوں گا۔ جینگو میں ترلوکا کے ایک ایک پیرو کا دشمن ہوں۔ خدا کی قسم میں زمین سے تمہارا تپاک وجود مٹا دوں گا۔ یہ کتاب زندہ ہے جینگو، زندہ رہے گی۔ اس کے خدمت گار رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ میں تجھے۔ میں تجھے.....“ اور پھر ان سب نے مل کر مجھے جینگو کے جسم سے اٹھالیا۔ ڈوڈو نے زور سے میرے سینے پر ٹکرائی تھی لیکن میں تو وحشی ہو گیا تھا۔ میں نے ڈوڈو کو گردن سے پکڑ کر اٹھالیا اور زمین پر دے مارا۔ جینگو دوڑتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ دروازے سے ٹکرا کر گر بھی تھا۔ اب کمرے میں دو چار افراد تھے اور میں تھا۔ ڈوڈو شکاگو کا چیپمن تھا لیکن جگہ جگہ سے زخمی نظر آ رہا تھا۔ پھر کسی نے میرے سر پر کوئی وزنی چیز دے ماری اور میرے اعضاء مضحل ہو گئے۔ میں تاریکوں میں جاسویا۔ سکون کی گہری نیند۔

نہ جانے کب آنکھ کھلی۔ ایک کمرہ تھا جس میں میں ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ایک دہلی پتلی سی لیکن بے حد خوبصورت نرس میرے نزدیک بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں نرس کے سفید چہرے کو دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔

”نرس“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر کتاب رکھ کر میرے نزدیک آگئی۔ یہ کون سی جگہ ہے نرس؟

”ذہن پر زیادہ زور نہ دو“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اگر تم بتا دو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“

”تمہارے لیے بہتر نہیں ہے، باہر تمہارے دشمن پہرہ دے رہے ہیں۔“

”جینگو کے آدمی؟“

”ہاں“

”عمارت بھی جینگو کی ہے؟“

”ہاں“ نرس نے جواب دیا اور میں نے گہری سانس لی۔

”کچھ اور بھی بتاؤ گی نرس؟“

”ذہن پر زور نہ دو تو بہتر ہے“ اس نے کہا اور میں چند ساعت خاموش رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا:

”تم بھی ترلوکا کی پیروکار ہو؟“

”میرا خیال ہے تمہیں اپنی بیماری کے بارے میں گفتگو کرنی چاہیے۔ ان باتوں سے تمہیں کیا سروکار؟“

”یہ تو میری بیماری ہے نرس۔ جواب دو۔ کیا تم اس کی پیروکار ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر گہری سانس لے کر بولی:

”میں جو کچھ بھی ہوں اپنے طور پر درست ہوں۔“

”میں تلخ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ نرس اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف رخ کیا اور بولی:

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔ تم سے کیا اپنی ضرورت بیان کروں گا؟“

”کیوں آخر میری طرف سے اتنے بدل ہو، کیا صرف اس لیے کہ میں تمہاری ایک ایسی خواہش کر سکی جس کا تعلق میری ذات سے تھا۔“

”یہ بات نہیں ہے نرس، بلکہ تم شکر کرو کہ تمہاری زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ تم نے بارے میں نہیں بتایا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک پڑی۔

”اگر تم ترلوکا کی پیروکار ہو تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔“

نرس بدستور مجھے سپاٹ نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا:

”تم ترلوکا سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہو؟“

”کیا تمہیں ترلوکا سے عقیدت ہے؟“ میں نے پوچھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لکیر کھینچ گئی۔

”اس لیے نہیں منع کر رہی کہ تم مجھے قتل کر دو گے، بس تمہاری ضدی طبیعت کو دیکھ کر دل چاہتا نہیں مطمئن کر دوں۔ میں ترلوکا سے شدید گھمن کھاتی ہوں۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں“ اس نے ہریلے لہجے میں کہا اور میں عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ مجھے ایک دم سکون کا احساس ہوا

میرے علاوہ بھی اس گروہ میں کوئی ایسا ہے جو ترلوکا اور جینگو سے نفرت کرتا ہے۔“

”تم نے جینگو کو زندگی بھر کے لیے بہت سی چیزوں سے محروم کر دیا ہے۔ وہ خاصا زخمی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم خود اسے دیکھ لو گے۔ بہت جلدی وہ تمہارے سامنے آئے گا۔ ویسے اس وقت جدید ترین اس کا علاج ہو رہا ہے۔“

”اوہ کیا وہ اتنی خراب پوزیشن میں ہے؟“

”نہ صرف وہ بلکہ وہاں موجود تمام لوگ بھی۔ ڈوڈو جو امریکہ کا بہترین ریسلر تھا، موت اور زندگی کا لنگ رہا ہے۔ ان میں سے ایک شخص مرچکا ہے اور دوسرا شدید زخمی ہے۔ کسی کو بھی نہ چھوڑا

تم نے۔

میں اس لڑکی کی سپاٹ سی کیفیت پر غور کر رہا تھا۔ نہ جانے کس قسم کی تھی۔ پھر بھی اس نے مجھے کچھ بتایا تھا اسے سن کر مجھے بے پناہ خوشی ہوئی تھی۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر جینگو کے ساتھی میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں۔ انہیں مجھے کر دینا چاہیے تھا۔“

”وہ یہی کرتے لیکن جینگو نے بے ہوش ہونے سے قبل انہیں منع کر دیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”پتہ نہیں بس وہ ایسا ہی بے ٹکا آدمی ہے۔ اس نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے“ نرس نے کہا اور میں دل ہی دل میں مسکرانے لگا۔

یہ تو قدرت کے راز تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ظاہر ہے ہو ریشو نے بھی یہی کہا تھا۔ اس خطبہ میں جتلا ہو گیا تھا کہ مجھے زچ کر کے مارے گا اور بلاخر اس کا یہ خطبہ اسی کی ڈوب۔ جینگو بھی یہی ہو گا۔ اسے بھی اپنی شکست یا توہین کا بدلہ لینے کی خواہش ہوگی۔ وہ اپنے لوگوں میں ذلیل ہو گیا تھا۔ اگر اس کے آدمی مجھے قتل کر دیتے تو یہی کہا جاتا کہ میں جینگو کو اس حالت میں پہنچانے کے بعد اس کے آدمیوں سے مارا گیا۔ لیکن یقینی طور پر جینگو میرے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی اپنی گری ہوئی بحال ہو جائے۔

میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا تھا کہ میری روح کے وہ داغ دھل جائیں جن سے وہ اذیت کاٹ سکتی تھی۔ لیکن بخشش کا تصور بھی میرے لیے حسرت انگیز تھا۔ بھلا مجھ جیسے انسان کی بخشش کیسے ہو سکتی تھی؟ کے ہاتھوں ہزاروں انسانوں کو اذیت پہنچی تھی۔

ہوش آنے کے بعد بھی میرے خلاف کوئی تحریک نہیں ہوئی۔ میں تیزی سے رو بہ صحت تھا۔ وہ نرس میرے لیے ایک معمد بن گئی تھی۔ دہلی پتلی سی حسین نقوش والی لڑکی جو مسکراتا تو جانتی ہی تھی۔ وہ ایک مشین کی طرح اپنے کام کرتی اور اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔

”نرس“ ایک دن میں نے اس سے کہا اور وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی ”کیا تمہارے یہاں اور کوئی نرس نہیں ہے؟“

”نہیں“ اس نے مختصر کہا۔

”میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“

”کیا یہ ضروری ہے؟“

”ہاں۔ خاص طور سے اس لیے کہ تم بھی میرے مسلک سے متفق ہو۔“

”غلط خیال ہے تمہارا“ اس نے سختی سے کہا۔

”میرا مسلک کچھ اور ہے۔“

”کیا؟“

”تین لپانچ انسانوں کی پرورش اور بس۔“

”کون ہیں وہ؟“

”براہ کرم فضول باتوں میں نہ الجھیں۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔“

”اپنا نام بھی نہیں بتاؤ گی؟“ میں نے کہا اور وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”میرا ڈالسنک“ اس نے جواب دیا۔

اور یہ نام آپ کے لیے اجنبی نہ ہو گا۔ یہ وہی میرا ہے جو بعد میں راجہ نواز اصغر کی بیوی بنی۔

☆ ☆ ☆

میں خاموشی سے میرا کو دیکھتا رہا۔ یہ نرم و نازک سی لڑکی نہ جانے اپنے اندر کون کون سے اسرار رکھتی تھی۔ بہر حال اس سے زیادہ میں اس سے کچھ پوچھنے میں ناکام رہا۔ وہ لٹ سے مس نہیں ہوئی تھی اور میں لپانچ انسانوں کے بارے میں بھی کچھ نہ جان سکا جن کی پرورش اس کا مسلک تھی۔

ہاں چوتھے دن اس نے مجھے اطلاع دی ”ڈوڈو بھی مر گیا۔ غالباً“ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

”لو۔۔۔۔۔“ مجھے افسوس ہے۔ بہر حال خوب آدمی تھا۔ اور اس نے فرانس میں مجھے بہت سی سہولتیں دی تھیں۔“

میرا نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ بلاآخر چھ دن مجھے طلب کر لیا گیا اور جس کمرے میں مجھے لے جایا گیا تھا وہ تاریک تھا۔ پھر اچانک

میں تیز روشنی پھیل گئی اور کمرے کے درمیان ایک لپانچوں والی کرسی پر جینگو نظر آیا۔ اس کی ایک ہڈی بندھی ہوئی تھی اور کئی جگہ سے وہ ٹوٹا پھوٹا نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

”بات یہ ہے مسٹر پیکر“ اس نے بھاری آواز میں کہا ”میں لوگ ذاتی دشمنی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تشدد کا پرچار کرتے ہیں۔ ہمیں مذہب سے کوئی پر خاش نہیں ہے۔ کمزور انسان بہت سی حسرتیں اور

میں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ان خواہشوں کو دبانے کے لیے ان آرزوؤں کے نہ پورا ہونے کی حسرت نے کے بعد مذہب تراشے گئے ہیں اور ان مذہب کے پیروؤں نے جزا و سزا کا تصور دیا ہے۔ ناکاموں

لے جنت تخلیق کی گئی ہے تاکہ وہ ایک اور زندگی کی آرزو میں سلگتے رہیں۔ انتظار کرتے خوشی ہیں، اس کے ساتھ یہ کتاب بڑا مذاق ہے۔ وہ خوشی جو انہیں زندہ رہ کر نہیں مل سکی، مرنے کے بعد پوری ہو

گی، وا۔۔۔۔۔!“

”تو تم مسلمان ہو۔“

”ہاں۔“

”ایک ایسے مذہب کے پیرو جو سب سے زیادہ کٹر ہے۔ لیکن کیا تم اپنے مذہب سے مطمئن ہو تو اس

اصغر؟“

”جہاں تک مذہب کی بات ہے، میرا مذہب دنیا کا آخری اور سب سے مکمل مذہب ہے۔“

”کیا اس مذہب نے مکمل انسان تخلیق کیے؟“

”ایسے مکمل انسان جن کی مثل انسانیت کی تاریخ دینے سے قاصر ہے، اگر تمہاری کوئی تعلیم

ہے تو میرے مذہب کا مطالعہ کرو“ میں نے فخر سے کہا۔

”تمہاری بد قسمتی سے میں نے ہر مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ ان لوگوں کی بات کرو گے جو بانی مذہب

ان سے قریبی لوگ تھے۔ اس کے بعد کیا تمہارا مذہب افراتفری کا شکار نہیں ہو گیا؟“

”مذہب اپنی جگہ مضبوط اور ٹھوس ہے۔ چند انسانوں کے انفرادی کردار کی بات دوسری ہے اور

انسان تو بقول تمہارے کمزوریوں کا مرقع ہوتا ہے۔“

”وہی میں کہہ رہا ہوں۔ جب کوئی مذہب انسان کو مکمل نہیں کر سکتا تو پھر اس کا سہارا لینے کی

ضرورت ہی کیا ہے؟“

”دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہو جینگو، اگر مذہب اور اس کے اقدار انسان کی ذات کی اصلاحی

کرتے تو یہ دنیا بھیڑیوں کا غول ہوتی۔ ہر طاقتور اپنے سے کمزور کو کھا جاتا۔ انسان سے بڑا دندہ روئے زمین

دوسرا کوئی نہیں ہے۔ یہ محب انسانیت لوگوں کی کوششیں ہی ہیں جن کی وجہ سے بھیڑیوں کا یہ غول پر سکون

ہے اور انسان سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔“

”سکون کی زندگی، ہونہ، تم اسے سکون کی زندگی کہتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔ اگر مذہب کی دیوار نہ ہوتی تو ہر شخص بے سہارا ہوتا اور تم جیسے لوگ کسی بھی طرح

اس انسان کو زندہ نہ چھوڑتے جو تم سے منحرف ہوتا۔“

”بے کار بات ہے۔ جب تم اپنے آپ کو کسی تعلیم سے پوری طرح متاثر نہیں کر پاتے تو پھر

تعلیمات کا دامن کیوں پکڑتے ہو خود کو آزاد چھوڑ دو۔“

”ہمارے اندر جو خامیاں ہوتی ہیں، ہمارا ضمیر ان پر شرمندہ رہتا ہے اور یہ شرمندگی مذہب کا عطیہ

ہے۔ اگر یہ عطیہ نہ ہوتا تو ہر برائی کے لیے برائی کا تصور ہی مٹ جاتا اور ہر انسان کھلم کھلا برائیاں کرتا۔“

”یہ خوب بات ہے۔ تم جو کرتے ہو اسے انسانی کمزوری قرار دیتے ہو اور جو نہیں کر پاتے اس کے

لیے مذہب پر احسان رکھ دیتے ہو۔“

”یہی کیا کم ہے جینگو کہ ہم جو برائی کرتے ہیں اس پر پشیمان رہتے ہیں۔ میں نے کہا نا کہ اگر برائی

پشیمانی کی چادر بھی الٹ جائے تو یہ دنیا جنم بن جائے۔“

”کیا انفرادی طور پر ہر شخص یہی سوچتا ہے؟“

”ضمیر سب کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس کی ٹیسوں سے متاثر نہ ہو تو ضمیر کا کیا قصور؟“

”میں تم سے تمہاری بات کرتا ہوں۔“

”ضرور کرو میرے دوست، میرا خیال ہے تم وہ کر رہے ہو جو میرے لیے شدید بہتری کا باعث ہے۔

اپنی ذات میں اتنی خامیاں پیدا کر چکا ہوں کہ اب ان گڑھوں کو بھرنے کا تصور بھی ذہن میں آتا ہے تو

بے حد کمزور پاتا ہوں۔ اگر تمہاری اس کوشش سے میری اصلاح ہو جائے تو میں تمہیں اپنا دوست ہی

من گا۔“

”ہاں ہاں۔ خوبصورت گفتگو کرنا بڑی اچھی بات ہے۔ تو میں تم سے کہہ رہا تھا کہ میں تم سے

اپنی ذات کے بارے میں سوال کرتا ہوں۔ تم جس مذہب کے پیرو ہو، اس کی تعلیمات ضرور تمہاری نگاہ

میں آئیں گی۔“

”بے شک ہیں۔“

”کیا تم اپنے آپ کو مطمئن پاتے ہو کہ تمہارے مذہب نے تمہیں جو تعلیمات دی ہیں، تم انہیں

اگر رہے ہو؟“

”ہرگز نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں اپنے مذہب کا مذاق ہوں۔ میں ان تعلیمات سے نفی کر رہا ہوں جو میرے مذہب

مجھے دی ہیں“ میں نے جواب دیا۔

”اور یہ بات تم فخر سے کہہ رہے ہو؟“

”نہیں۔ انتہائی شرمندگی کے ساتھ۔“

”خوب خوب۔ یہ شرمندگی کب سے لاحق ہے؟“ جینگو نے سوال کیا۔

”اس وقت سے جب میں نے پہلی برائی کی اور میرے ضمیر نے مجھے اس برائی کے خلاف پہلی بار

گودی۔“

”تو اس کے بعد تم دوسری برائی کیوں کرتے رہے؟“

”اس لیے کہ میں اس کمزور دنیا کا کمزور انسان تھا۔“

”واہ۔ اچھا طریقہ ہے۔“

”نہیں جینگو، میں تم نے تمہارے ہی الفاظ دہرا رہا ہوں۔ مذہب نے ہمیں اچھائیوں کی جانب کیا۔

انسانی کمزوری ان اچھائیوں کو مانتے ہوئے بھی ان پر عمل نہ کر سکی۔“

”اوہ تو پھر اس کمزوری کو تم کہاں لے جاؤ گے میرے دوست۔ جب تم محسوس کرتے ہو کہ انسانی فطرت کی کمزوریاں یہ وزن نہیں اٹھا سکتیں تو تم اس بوجھ سے آزاد کیوں نہیں ہو جاتے؟“

”اس لیے کہ یہ بوجھ بوجھ نہیں ہے۔ بلکہ روح و قلب کی صفائی کے لیے ایک مجرب نسخہ ہے۔“

”جسم کی گندگی کے لیے کوئی مجرب نسخہ نہیں ہے تمہارے مذہب میں؟“ جینگو نے سوال کیا۔

”بے شمار، لیکن اگر ہم عمل کرنا چاہیں تو۔“

”تو پھر عمل کرنے کے لیے کوئی ذریعہ کیوں نہیں بتایا گیا؟“

”بے شمار ذرائع بتائے گئے ہیں۔ لیکن بات وہی انسانی کمزوری کی آ جاتی ہے۔“

”میرا خیال ہے تمہاری گفتگو احمقانہ ہے“ جینگو نے کسی قدر الجھ کر کہا۔

”نہیں جینگو! بلکہ تم لاجواب ہو گئے ہو۔“

”اوہ۔ محض بکواس۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر تم مذہب کی پیروی کرنا چاہتے ہو تو اس کے بارے میں سوچو مت بلکہ عمل شروع کر دو۔“

”ہاں ہاں۔ بنیادی عمل بے حد ضروری ہیں۔ اگر ہم ان پر ہی کاربند ہو جائیں تو میں سوچتا ہوں کہ کم از کم مذہب کا ایک سلسلہ تو پورا ہو ہی جائے۔“

”تو تم کاربند کیوں نہیں ہوتے؟“

”میں ہونا چاہتا ہوں۔“

”خوب خوب“ جینگو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ ”تو سنو میرے دوست“ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اپنے مذہب کی اچھائیوں کو نگاہ میں رکھو اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو اور ماحول کو دیکھ کر میں یہ کوشش کروں گا کہ وہ اچھائیاں تمہیں کوئی سہارا نہ دے سکیں۔ تم اچھائیوں کی جانب راغب ہو تو برائیاں تمہاری مجبوری بن جائیں اور اگر تم ان اچھائیوں کو قبول کرنے سے قاصر رہو تو پھر ترلوکا کی طرف آ جاؤ۔ تمہارے لیے کھلی دعوت ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”تم جو کچھ کر چکے ہو اس کے صلے میں تمہیں بدترین سزا دی جانی چاہیے تھی۔ لیکن ترلوکا عجیب و غریب فطرت کا مالک ہے۔ اس نے ہماری روح میں جو احساسات پیدا کر دیے ہیں ان کے تحت جینگو تمہیں آزادی بخشا ہے۔ جاؤ تم کبھی ہماری دسترس سے باہر نہ رہو گے۔ لیکن تم ان اچھائیوں کو تلاش کرو جو تمہیں مذہب کی طرف لے جاتی ہیں۔ اگر تم انہیں پانے میں کامیاب ہو گئے تو تمہارے ہی حق میں بہتر ہے لیکن اگر تم انہیں پانے میں ناکام رہے تو پھر تمہیں ترلوکا کے حضور پیش کر دیا جائے گا تاکہ وہ تمہاری اصلاح قلب کر سکے۔“

میں نے چند ساعت سوچا۔ جینگو نے مجھے بہت بڑا چیلنج دیا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس چیلنج

بر لوں۔

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ میں نے جواب دیا اور جینگو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”لیکن نواز اصغر، اگر تم نے پیرس سے فرار ہونے کی کوشش کی تو پھر ترلوکا کے مجرم کی حیثیت سے گولی مار دی جائے گی۔“

”تو میں ترلوکا کا قیدی ہوں؟“

”نہیں۔ اس کے مجرم۔ تم نے اس کی ذات کا چیلنج قبول کیا ہے، مردانہ وار مقابلہ کرو اور اسے دو۔ بھاگ جانے والوں کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ اگر تم یہ چیلنج نہ قبول کرتے تو جو جرم تم کر چکے کے عوض تمہیں اسی جگہ گولی مار دی جاتی اور تم جانتے ہو ہم یہ کر سکتے تھے۔“

”ہوں“ میں نے گردن جھکا کر سوچا۔ بات ٹھیک تھی۔ اس وقت یہ لوگ ایسا کر سکتے تھے۔

”کیا سوچا؟“

”تمہارا ایک مطالبہ میں تسلیم کرتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”پیرس نہیں چھوڑوں گا۔ اس وقت تک جب تک کہ تم نہیں چاہو گے۔“

”یہ ایک سچا فیصلہ ہے؟“

”ہاں۔“

”اس کی وجہ؟“

”میں اس بات کو مانتا ہوں کہ اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں اور تم مجھے مار سکتے ہو۔ چنانچہ اگر سے کسی وعدے کے عوض زندگی مانگ رہا ہوں تو اس وعدہ کو ضرور پورا کروں گا“ میں نے جواب دیا۔

”خوب۔ میں اسے تمہارے مذہب کی سچائی سمجھ لیتا ہوں۔ ہارڈ“ اس نے کسی کو آواز دی اور دی ایک ستون کے عقب سے نکل آیا۔ جینگو نے پورے انتظامات کیے تھے۔ ظاہر ہے اس نے مجھے تھکا۔

”یس سر!“ آنے والے نے گردن جھکا کر کہا۔

”اسے بے ہوش کر کے کسی مناسب جگہ ڈال آؤ“ جینگو نے کہا اور اس شخص نے پستول نکل لیا۔

”لے اسے میرے چہرے کی طرف رخ کر کے فائر کر دیا۔ میں اتنا بے بس تھا کہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

پستول سے گولی کی بجائے ایک بھورے رنگ کا غبار نکلا تھا۔ پھر یہ غبار میری ناک سے نکل آیا اور میرا منہ ہو گیا۔

لاکھ کوشش کے باوجود میں سانس نہ لے سکا اور دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ یہ بے ہوشی نے کتنی طویل تھی۔ بہر حال ہوش آیا۔ قرب و جوار کے ماحول کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی

پارک ہے۔

میں ایک طویل سانس لے کر اٹھ گیا۔ پارک میں پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھنا چاہا لیکن کلائی خالی تھی۔ ایک لمحے تو میں حیران ہوا کہ انہوں نے میری گھڑی کیوں اتار لی لیکن دوسرے لمحے میں نے کسی احساس کے تحت اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ بدن کے لباس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میرے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے۔

”شکر ہے“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے ایک صبح یاد آگئی تھی جب ہو ریٹھو نے ہمیں برہنہ کر کے ایک کوڑا گھر پر پھینک دیا تھا اور شہر کے لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ وہ تو بھلا ہو سردارے کا اس نے پاگل پن کا ڈھونگ رچا کر ہر وقت جان بچائی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ ان شریف لوگوں نے صرف جوتے چرائے تھے۔

میری نگاہ چاروں طرف بھٹکنے لگی اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں اس سچ کا خیال آیا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس سچ پر ایک بوڑھا فرانسیسی بیٹھا لوٹکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں پاؤں اٹھا کر سچ پر رکھ لیے تھے اور اس کے جوتے نیچے رکھے ہوئے تھے۔

ایک لمحے میں میرے ذہن میں آیا کہ ان جوتوں کا ساز میرے پیروں سے مختلف نہیں تھا اور ممکن ہے اس کی جیب میں بھی کچھ موجود ہو۔ بہت عمدہ۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

لیکن دوسرے لمحے میرے ذہن میں کچھ عجیب سی آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ آوازیں۔۔۔۔۔ آوازیں۔۔۔۔۔ میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ یہ آوازیں میرے مقدر میں تو نہیں تھیں۔ عرب زبان کی یہ آیات میرے لیے ناقابل فہم تھیں لیکن میرے ذہن و دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔

مجھے کیا سمجھایا جا رہا تھا۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ پوری زندگی برائیوں کی تلاش میں سرگرداں انسان اب نیکیوں کے راستے تلاش کر رہا تھا۔ یہ رہنما آوازیں۔ یہ رہنما آوازیں یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں؟

”بائیں سمت چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ صورت شکل سے عرب باشندے معلوم ہوتے تھے ایک کے سامنے ٹرانزسٹر رکھا ہوا تھا اور کہیں سے تلاوت ہو رہی تھی لیکن یہ رہنما آوازیں تو میرے لیے نہیں تھیں۔

میں نے رخ بدل لیا۔ اس بوڑھے فرانسیسی کے جوتے اس کے اپنے تھے، میرے لیے نہیں تھے تب میرے اندر ایک استقامت ابھری۔ ایک احساس ابھرا اور میں نے وہ جوتے حاصل کرنے کا فیصلہ ترک کر دیا۔

لیکن اب۔۔۔۔۔ اب کیا کروں۔ شام ہو چکی تھی۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

”اونہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ سینکڑوں دن اور سینکڑوں راتیں عجیب و غریب گزری ہیں۔ وہ برے اور بری راتیں۔ یہ اچھائیوں کی تلاش ہے۔ یہ سچ نروان کی تلاش ہے تو اس سے گھبرا جانا کیا معنی! اور میرے اندر ایک ایسا عزم ابھرا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ننگے پیروں کو میں بھول گیا تھا۔ میں پھر باہر نکل آیا۔ پارک کے باہر نیولی پارک کی ایک سل لگی ہوئی تھی۔ سامنے ہی نیولی کا پل نظر آ رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر سپر مارکیٹ، ریسٹوران اور ایسی ہی چیزوں کی بھرمار تھی۔ کشادہ سڑکیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ میں چل پڑا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ اس ایک نامعلوم منزل کی طرف۔

پھر ایک سپر مارکیٹ کے قریب ایک بوڑھی عورت نے مجھے اشارے سے قریب بلایا اور میں اس کی ایک پینٹنگ دیکھ گیا۔

”فریج؟“ اس نے تذبذب انداز میں مجھے دیکھا۔

”نہیں۔“

”پھر کون ہو؟“

”مشرقی“ میں نے جواب دیا۔

”اوہ“ اس نے گہری سانس لی۔ وہ مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھی ”تمہارے جوتے کہاں

”کب۔ کیسے؟“

”بس پارک میں تھا۔ کسی نے جوتے اور جیب میں جو کچھ تھا غائب کر لیا“ میں نے مسکراتے ہوئے

”حالانکہ فرانس میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ شاید وہ بھی کوئی مشرقی ہو گا“ عورت نے طنزیہ انداز میں

”اور کچھ کہنا ہے آپ کو؟“

”نہیں۔ بس تم عجیب لگے تھے۔ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟“

”شکریہ“ میں نے جلتے کئے انداز میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”اوہ۔ سنو تو سنی۔ سنو میرا مقصد تمہاری توہین نہیں تھا۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم سفید نسل کی گھٹیا عورت، جس کا نہ کوئی ماضی ہوتا ہے نہ مستقبل۔ تم کسی کی کیا مدد کر سکتی ہو میں نے نفرت سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ بوڑھی میری شکل دیکھتی رہ گئی تھی۔ مجھے اس کے ریمارکس غصہ آ رہا تھا۔ اور پھر شاید بھوک کی بھی کچھ جھنجھلاہٹ تھی۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں میں

مجھے ان لوگوں کی تکلیف یاد آگئیں جنہوں نے راہ حق میں نہ جانے کتنی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ میں تو ابھی حق کی تلاش میں پہلا قدم رکھ رہا تھا۔ تب میرے دل سے ایک دعا نکلی ”خداے قدوس! میری ثابت قدم رہوں۔ جو راستہ اختیار کیا ہے اس سے نہ ہٹوں۔ تو میری مدد کر۔“

اور یہ آرزو کچھ اس انداز میں بیدار ہوئی تھی کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں چننا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔ میری نگاہ ایک اور بوڑھی پر پڑی تھی جو اپنے سامنے سلمان رکھے پریشانی سے اوجھل اور دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

سوری بوائے۔ مجھے ٹیکسی کی تلاش ہے۔ پلیز میری مدد کرو۔ بہت دیر سے پریشان ہو رہی ہوں اس نے کہا۔

”ٹیکسی کہاں سے ملے گی مادام؟“

”یہاں کوئی پبلک بوتھ بھی نہیں ہے۔ یا تو کہیں سے فون کر دیا۔۔۔۔۔“ عورت نے کہا اور دور سے ایک ٹیکسی آتی دیکھ کر چونک پڑی ”اوہ ہلیز“ اس نے استدعا کی اور میں ٹیکسی کی طرف دوڑ گیا۔ میں نے ٹیکسی روکی اور عورت کا سامان اٹھا کر اس میں رکھ دیا۔

عورت اندر بیٹھ گئی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور ایک نوٹ نکال کر اس طرح میری جیب میں ٹھونسا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں تعجب سے نوٹ دیکھ رہا تھا۔

”بخشش“ میں نے سوچا اور پھر میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ اس نوٹ سے کم از کم کچھ وقت کا انتظار ہو سکتا ہے۔ اور۔۔۔۔۔ اور اگر ممکن ہو تو ایک معمولی سا جو تا بھی خرید ا جا سکتا ہے۔

کوئی دکان چھوٹی نہیں تھی۔ بہت کر کے میں ایک دکان میں داخل ہو گیا اور پھر ایک سب سے معمولی جوتے کا انتخاب کیا۔ قیمت پوچھی اور دھڑکتے دل سے انتظار کرنے لگا۔

اور پھر میرا چہرہ کھل گیا۔ بوڑھی یا تو بہت فیاض تھی یا پھر بے وقوف اور گھبرائی ہوئی۔ میں جو تا خرید سکتا تھا اور اس کے بعد بھی چند فرانک بچ رہے تھے۔ میں نے جو تا خرید لیا۔ درحقیقت ایسا ہی محسوس ہوا جیسے برہنگی چھپ گئی ہو۔ پیرس کی سڑکوں پر ننگے پاؤں پھرنے والوں کے گرد لوگ جمع ہی ہو جاتے۔ بیٹ نہ چھپایا بھی جا سکتا ہے لیکن پاؤں؟ میں نے گہری سانسیں لیں اور اب مجھے بقیہ رقم سے پیٹ کا دونخ بھرنے کا خیال آیا۔ اس رقم کو حرام نہیں سمجھ سکتا تھا۔

چنانچہ کلیسا کے سکرے کی میزٹیوں کے نزدیک بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے قہوہ خانوں میں سے ایک میں داخل ہو کر میں نے ایک میز سنبھال لی اور پھر سستی چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ ان چیزوں کے آنے کے بعد میں کھانے میں مشغول ہو گیا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک درمیانی عمر کی پرکشش عورت آکر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے فی ہار شکاری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ لیکن دل ہی دل میں میں نے اس پر لعنت بھیج دی تھی۔

کافی کے دو کپ لینے کے بعد میں نے بل طلب کیا۔ سولہ فرانک اور میرے پاس بیس فرانک تھے۔ اس سے دو فرانک سب بقی بچے دو۔ میں دل ہی دل میں بیس پڑا۔ کروڑوں روپے۔۔۔۔۔ کی دولت ضرور لینڈ کے بینکوں میں بھری پڑی تھی لیکن میری حیثیت صرف دو فرانک تھی۔

درحقیقت انسان اتنا ہی بے حقیقت۔۔۔۔۔

لیکن سوچ کے دھارے وہیں رک گئے۔ جس جیب میں رقم رکھی تھی وہ نیچے سے غائب تھی اور آسانی سے باہر نکل گیا تھا۔ جسم نے پینہ چھوڑ دیا۔ جیب کٹ گئی تھی۔ لیکن کب؟ کہاں؟ کچھ یاد آتا۔ یاد کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب میرے سے کیا کہا جائے گا۔ کوئی چیز بھی تھی جسے رکھ کر کھڑا ہو جاتا۔

زندگی میں پہلی بار اتنی سی بات پر میرے چہرے پر مردنی چھائی اور سر جھکا گیا۔ بل میرے سامنے رہا تھا۔ میرا چلا گیا تھا اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے بل دیکھ رہا تھا۔ تب ایک آواز سنائی دی۔

”ہیلو!“

”آواز نسوانی تھی۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں اور پھر ایک گہری سانس لی۔ وہی شکاری عورت تھی جس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی پر خلوص مسکراہٹ تھی۔

”بیٹھنا چاہتی ہوں“ اس نے کہا اور میں نے پریشانی سے گردن ہلا دی۔ اسی وقت ویٹر آیا اور عورت نے اسے اشارہ کیا۔ اس نے اپنے پرس سے ایک نوٹ نکال کر پیٹ میں رکھ دیا۔ ”اس میز کا بل بھی بیس لے آنا“ اس نے کہا اور گردن خم کر کے چلا گیا۔ ”میرا نام سونیٹا ہے“ اس نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ ”فریج بول“ اس نے پھر پوچھا۔

”ہاں“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”شکر ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ تمہارا تعلق الجزائر سے ہے؟“

”نہیں۔ میں ایشیائی ہوں۔“

”اوہ۔ کیا واقعی؟“

”ہاں۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“ انڈین ہو۔“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”پاکستانی“ اس پورے عرصہ میں پہلی بار میرے منہ سے اپنے وطن کا مقدس نام نکلا تھا۔ نہ جانے

”اوہ۔ پاکستانی۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”نواز“

”خوب۔ ڈیز نواز۔ میرے بارے میں کوئی بری رائے قائم مت کرنا۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے“ اس نے کہا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیسا حادثہ؟“

”میں ایک مقامی یونیورسٹی میں نفسیات کی لیکچرار ہوں۔ تھوڑی سی فیس ریڈنگ کر لیتی ہوں۔ پیرس کا ماحول بڑا خراب ہو گیا ہے۔ مقامی لوگ بھی چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر اتر آتے ہیں۔ نہ جانے پیرس ذہنی طور پر اتنا دیوالیہ کیوں ہو گیا ہے؟“

”میرے چہرے سے آپ نے کیا اندازہ لگایا“ مجھے اپنا خیال غلط معلوم ہوا۔ نزدیک سے وہ اتنی بری عورت نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

”شاید کسی نے آپ کی جیب خللی کر دی ہے۔“

”ہاں۔ یہ سوراخ دیکھئے“ میں نے اپنی جیب کا سوراخ دکھایا۔

”ہوتا ہے۔ ہوتا ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے اس معمولی سے کام آسکی۔ لیکن میں اس کے بعد بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ پیرس میں مہمان ہیں اور آپ کے حالات بھی پیرس ہی میں خراب ہو گئے ہیں۔ یہاں کے لوگ آپ کے میزبان ہیں۔ لیکن ہر جگہ ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔“

”آپ نے درست کہا؟“

”اس لیے آپ میرے مہمان رہیں گے۔ دیکھئے انکار نہ کریں۔ خودداری اچھی چیز ہوتی ہے لیکن ایسے دوست جو بے غرض ہوں ان کی دل شکنی مناسب نہیں ہوتی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....“

”لیکن نہیں ڈیز نواز۔ میں اس بھری دنیا میں تنہا ہوں۔ انسان خوشیاں خرید نہیں سکتا بس کبھی کبھی یونہی سر راہ کوئی خوشی مل جاتی ہے تو اسے اٹھا لیتی ہوں۔ اگر تم نے منع کر دیا تو میں اس ہو جاؤں گی۔“

”خاتون۔ میں.....“

”موسیو نواز، پلیز“ اس نے التجا کی اور میں خاموش ہو گیا۔ بلکہ مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں نے اسے بری عورت سمجھا تھا۔ وہ تو میرے لیے فرشتہ ثابت ہوئی تھی۔ جس نے مجھے بے عزتی سے بچا لیا تھا۔

میں شکر گزار لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”بہتر ہے خاتون سونیتا۔ لیکن آپ تنہا کیوں ہیں؟“

”بے شمار لوگ تنہا ہیں۔ تم ہر ایک سے یہ سوال کرو گے؟“

”ہاں۔ لیکن تمہاری کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ آپ کے شوہر والدین، بھائی بہن کوئی نہیں

”؟“

”ہاں کوئی نہیں ہے۔“

”شوہر بھی نہیں؟“

”شادی ہی نہیں کی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تمہا ہوں۔“

”عجیب منطق ہے“ میں مسکرا کر بولا۔

”تم نے شادی کی ہے نواز؟“

”نہیں۔“

”وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“ اس نے سوال کیا اور مجھے ہنسی آگئی۔

”وجہ تو معلوم ہی ہے۔“

”اور شاید میرے سوال کا جواب بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ اب انھیں یہاں سے کہیں اور سیر کریں۔ میں کلنی کا ایک کپ لینے یہاں آگئی تھی۔“ اس نے اپنی ٹل کی رقم بھی ادا کرتے ہوئے کہا اور میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

”آپ کا قیام کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بلے وارڈ پک ہش کے علاقے میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی ہوں“ اس نے کہا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔ باہر گمرے سبز رنگ کی ایک گاڑی کھڑی ہوئی تھی جس کی چھت کھلی ہوئی تھی۔ اس نے لاک کھول کر دوسری طرف کا دروازہ بھی کھول دیا اور میں اس کے نزدیک آ بیٹھا۔

”زندگی میں کسی ساتھی کی کتنی اہمیت ہوتی ہے“ وہ کار اشارت کرتے ہوئے بولی۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں لوگوں سے بے تکلفی کی قائل نہیں ہوں۔ کبھی کوئی اسٹوڈنٹ بھی میرے فلیٹ تک نہیں پہنچ پاتا۔ ایک مخصوص زندگی، جانی پہچانی تھائی۔ اس تھائی میں کوئی تبدیلی کتنی خوشگوار لگتی ہے۔ اس کا احساس شاید میرے جیسی ہی کسی ہستی کو ہو۔ عام لوگ اس بات کو کیا جانیں۔“

”لوہ۔ ہاں۔ لیکن اس تھائی۔ اس معمول میں کوئی رخنہ اندازی آپ گوارا کر لیتی ہیں۔“

”میری تھائی۔ بس میری بے بسی ہے، ورنہ کون تمہارا ہنا چاہتا ہے۔“

”آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ ابھی آپ کی عمر زیادہ نہیں ہوئی“ میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

”بس ہمت نہیں ہوتی۔“

”کیوں؟“

”دنیا سے خوفزدہ ہوں۔ نہ جانے میرے اندر کون کون سی خامیاں ہوں۔ نہ جانے کسی کو متاثر کر سکو گی یا نہیں۔“

”یہ صرف ایک خواب ہے۔ آپ اپنی فطرت سے ملتے جلتے کسی انسان کو۔۔۔۔۔“

”انسان ملیں تب نہ۔ میرے اندر کیا کشش ہے کہ کوئی اپنا وقت برباد کرے؟“ اس نے کار کے چھوٹے ڈکے سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال لیا اور اس سے ایک سگریٹ نکال کر پیکٹ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے بھی ایک سگریٹ نکال لی اور اس نے اپنے ساتھ میرا بھی سگریٹ سلگا دیا۔ دریائے سین کے گدلے پانی پر سورج کی کرنیں دم توڑ رہی تھیں اور رات کی تاریکی چھاتی جا رہی تھی۔ ہم اقل ٹاور کے قریب پہنچ گئے۔ انجینئر اقل کے کمال کی تصویر۔ اٹھتر لاکھ طلائی فراٹک کی لاگت سے تعمیر شدہ۔ نو سو چوراسی فٹ بلند ٹاور جس کا اوپری حصہ بالوں میں ڈھکا ہوا تھا۔

”اوپر چلو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا کریں گے۔ پیرس دھند میں ڈھکا ہوا ہو گا۔“

”دھند چیر کر جھانکتی ہوئی روشنیاں بے حد حسین لگتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ستاروں کے نزدیک ہوں اور زمین دیکھ رہے ہوں۔ آؤ“ اس نے کہا اور ہم لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ لفٹ نے ہمیں ٹاور کی آخری منزل پر پہنچا دیا اور تصویروں کی بلندیوں سے ہم نے زمین کی طرف جھانک۔ ایک عجیب عالم تھا۔

”اور دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے نیچے آ گئے۔ رات خوب ہو گئی تھی اور پیرس کی سڑکوں پر روشنیوں کے طوفان امنڈ رہے تھے۔ اور پھر سونیتا نے کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ اپنے چہرے سے مختلف عورت، خاموش خاموش سی۔

”اب کہاں چلیں؟“

”جہاں چاہو۔“

”تم اب بھی اواس ہو۔“

”بالکل نہیں۔“

”خاموش خاموش سے ہو۔“

”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”ہاں اواس نہ ہو، ورنہ تمہارے اندر انفرادیت نہیں رہے گی۔ ویسے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا؟“

”ابھی تک کچھ نہیں۔“

”اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے انتظام کر سکتی ہوں۔“

”کیسا انتظام؟“

”ہنولین اسٹریٹ پر ایسے شوروم ہیں جہاں روزانہ اجرت پر مختلف کاموں کے لیے لوگ رکھے ہیں۔ خاص طور سے ایسے لوگوں کے لیے بہت کار آمد جو غیر ملکی ہوں اور کسی حادثے کا شکار ہو گئے۔

اوہ۔ گویا بغیر کسی ضمانت کے ملازمت مل جاتی ہے۔“

”ہاں۔ بس صبح ہی صبح شوروم پر پہنچ جاؤ۔“

”اس اطلاع کے لیے شکریہ گزار ہوں۔“

”واقعی تم خوش نظر آنے لگے۔“

”خوشی کی بات ہے۔ اس طرح کم از کم پیرس میں زندگی گزارنے کے لیے کوئی سہارا تو مل جائے

”چلو مجھے خوشی ہے کہ۔۔۔۔۔ اوہ بارش ہونے لگی“ اس نے کہا۔ ایک پھوار ہمارے جسموں پر پڑی

بالوں نے اچانک ہی برسا شروع کر دیا تھا۔

”آؤ اب گھر چلیں“ اس نے تجویز پیش کی۔

”ہاں۔ یوں بھی رات ہو چکی ہے“ اور اس نے کار کا رخ بدل لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک گنجائش

میں داخل ہو گئی۔ پھر ایک مستقل پارکنگ میں اس نے اپنی کار پارک کی اور ایک عمارت کی طرف

لی۔

عمارت سولہ منزلہ تھی۔ چھوٹی سی لیکن خوبصورت اور وہ اسی عمارت کی آٹھویں منزل پر لفٹ سے

اُبل آئی۔ لفٹ کے عین سامنے اس کا لفٹ تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکالی۔ اندر داخل ہو کر روشنی کی

مجھے آواز دی۔

”ارے باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آؤ۔“

اور میں اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹا سا حسین فلیٹ تھا جس میں صرف دو کمرے تھے اور کچن وغیرہ بھی۔

”یہ میری کائنات ہے“ سونیتا نے کہا اور میں نے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

”لباس بھیک گئے ہیں۔ پہلے ان کے لیے کوئی بندوبست کیا جائے۔ آؤ“ وہ مجھے لے کر اپنے بیڈ روم

داخل ہو گئی۔ اور میں نے تعرض نہیں کیا۔ ویسے میں سوچ رہا تھا کہ لیکچرر صاحبہ نے شادی بھی نہیں کی

اور باہر بارش بھی ہو رہی ہے۔

لیکن بہر حال خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ اس وقت تو باہر کی پوزیشن ضرورت سے زیادہ خراب

”تمہارے لیے کیا کروں؟“ سوچتا ہے پوچھا۔
 ”ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد خشک ہو جائیں گے“ میں نے جواب دیا۔ سوچتا ہے اپنے لیے
 لباس نکال لیا تھا اور پھر وہ مسکراتی ہوئی بولی:
 ”کیوں نہ آج ایک تجربہ ہی سہی۔“
 ”کیسا تجربہ؟“

”میرا کوئی لباس پہن لو۔ تمہارا لباس میں خشک ہونے کے لیے ڈال دیتی ہوں۔“
 ”اوہ نہیں سوچتا۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

”یہاں میرے اور تمہارے علاوہ کون ہے ڈارلنگ“ سوچتا کی آنکھوں کی رنگت بدلنے لگی تھی۔
 ”ٹھیک ہے لیکن مجھے پسند نہیں پلیر۔“

”پھر بھی میں تمہیں اس بھگتے ہوئے لباس میں تو نہ رہنے دوں گی۔ اچھا تم پھر ایسا کرو کہ یہ چادر بدن
 پر کس لو اور لباس اتار دو۔ ہری اپ“ اس نے چادر مجھے تھما دی۔
 مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ ساری چالیں چل رہی تھی۔ بہر حال اس کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس کا
 اندازہ مجھے بخوبی ہو گیا تھا۔ میں نے چادر اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے بدن کے گرد لپیٹ کر لباس اتار
 دیا۔ اس دوران میں نے اس کی طرف سے رخ بدل لیا تھا۔

پھر جب میں اس کی طرف مڑا تو وہ شب خوابی کا لباس پہن چکی تھی اور اس کی ڈوریاں کس رہی
 تھی۔ لیکن یہ..... باریک لہو اس کے جسم کی حسین رعنائیوں کو اور اجاگر کر رہا تھا۔ یہ جسم پوشی کی نہیں
 جسم نمایاں کرنے کی کوشش تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے میرا لباس میرے ہاتھ سے لے
 لیا۔

”میں اسے ایسی جگہ پھیلا دیتی ہوں جہاں یہ خشک ہو جائے“ اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل
 گئی۔

میں کمرے کے درمیان کھڑا اس صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ بہر صورت عورت تو میرے ذہن
 میں نئی نہیں تھی۔ جذبات و احساسات بھی وہی تھے لیکن اب ان احساسات میں ایک ضد بھی پیدا ہو گئی
 تھی۔ جینگو سے میں نے جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرنا چاہتا تھا اور اندر سے ایک عجیب سی قوت مجھے اس عمل
 پر اکسار رہی تھی۔ چنانچہ میں خود کو پرسکون کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چادر میں نے اس انداز میں لپیٹ لی
 تھی کہ میرے جسم کا کوئی حصہ نمایاں نہیں تھا۔ تب سوچتا اندر آگئی۔

”کیا پیو گے؟“ اس نے چند ساعت کے بعد پوچھا۔

”میرا خیال ہے ہم بہت کچھ کھانی چکے ہیں۔ اب اس کی ضرورت تو نہیں رہی۔“

”اوہ۔ یہ کیسے ممکن ہے کچھ تو“۔۔۔۔۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ایک الماری کے نزدیک پہنچی اور

شراب کی ایک بوتل اور دو گلاس نکال لائی۔ اس نے میری ہی کرسی کے نزدیک بیٹھ کر دونوں چیزیں
 میز پر رکھیں اور گلاس میں شراب اڑھیلنے لگی۔
 ”اس وقت اس سے بہتر اور باعث سکون کوئی اور چیز نہیں ہے۔“
 ”شکریہ مس سوچتا۔ لیکن میں اس سے مبرا ہوں۔“
 ”کیا مطلب؟“

”میں نے شاید آپ کو بتایا تھا کہ میں مسلم مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اور ہمارے ہاں یہ چیز حرام

”اوہ۔ کیا پرانی باتیں کر رہے ہو۔ مذہب معبودوں میں ہوتا ہے۔ یہ سوچتا کامن ہے۔“
 ”مذہب ہر جگہ ہوتا ہے مس سوچتا۔ یہ تو انسان کی روح میں ہوتا ہے انسان کے دل میں ہوتا ہے
 عین ہے کہ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے آپ مجھے اس بات پر مجبور نہیں کریں گی جو میرے
 مناسب نہیں ہے۔ ہاں میں آپ کو پینے سے نہ روکوں گا۔“
 ”کیا خاک مزہ آئے گا تم پینے میں۔ نواز ڈیر ایسی باتیں نہ کرو۔ کیا فائدہ ان باتوں سے؟“
 ”میں مجبور ہوں سوچتا۔“

”ہوں“ اس نے ہونٹ سکوڑے اور اپنے گلاس میں شراب اڑھیل لی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ

”میں تمہیں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔ میرا پروفیشن دراصل کچھ ایسا ہے کہ میں دو سروں سے
 تھلگ ہی رہتی ہوں۔ میرے جاننے والوں میں زیادہ تر میرے طالب علم ہوتے ہیں یا پھر پروفیسرز
 لیکن ان کے سامنے خود کو انتہائی محتاط رکھنا ہوتا ہے اور پھر میں خود اس طبیعت کی مالک ہوں کہ
 سے الگ تھلگ رہنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ ہاں بعض اوقات جب ذہن میں زندگی جاتی ہے تو یہ
 ہوتا ہے کہ میں کس قدر تنہا ہوں۔ اس تھلکی کا ساتھ میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا مسٹر نواز، لیکن
 میں تمہارے قریب ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے تم مجھ سے اجتناب برتنا چاہتے ہو“ اس نے او اس
 کہا اور میں گہری سانس لے کر اسے دیکھنے لگا۔ بے وقوف عورت مجھے چکر میں لارہی تھی۔

”یہ ٹھیک ہے مس سوچتا لیکن آپ جس پروفیشن سے منسلک ہیں وہ بڑا مقدس ہے اور جب تک
 کے تقاضے پورے نہ کرے انسان کسی مقدس پیشے سے وابستگی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔“

”مقدس۔ مقدس“ یہ ساری باتیں اس وقت کی ہیں جب انسان انسانیت سے بڑھ کر کچھ اور بننے کی
 کر رہا ہو..... میں انسان ہوں، ایک کمزور انسان اور میں چاہتی ہوں کہ میری تھلکی میں کچھ
 پیدا ہوں۔ میں ان رنگینیوں کو پیدا کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن اگر کوشش کرتی ہوں تو تم جیسے

لوگ مل جاتے ہیں۔ پلیز نواز! تھوڑی سی "اس نے التجائیہ انداز میں کہا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اگر میں تمہاری بات مان سکتا تو مجھے بے حد خوشی ہوتی سونیتا لیکن میں سختی سے اپنے عمل پر کاربند ہوں۔ کرم تجھ سے دوبارہ نہ کہنا۔ بار بار تم جیسی مخلص ہستی کو منع کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے۔"

"اچھا" اس نے اپنے گلاس کی بجی ہوئی شراب حلق میں اندھیل لی اور پھر اٹھ کر ایک کھڑکی کے قریب پہنچ گئی۔ کھڑکی کھول کر اس نے باہر جھانک۔ بارش کی پھواریں اندر چلی آئیں اور اس نے جلدی کھڑکی بند کر لی۔

"آہ۔ کتنا حسین موسم ہو گیا ہے۔ اس موسم میں شراب سے تمہاری دوری بڑی عجیب سی ہے۔ خیر اب آرام تو کرو۔"

"میں"۔۔۔۔۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ "اگر تم پسند کرو تو میں ڈرائنگ روم میں سو جاؤں یہاں تو ایک ہی بیڈ ہے۔"

"گویا اب یہاں بھی اجتناب برتو گے؟"

"یہ موسم تمہارے اوپر عجیب انداز میں اثر کر گیا ہے سونیتا۔ ایک اچھے دوست کا کام یہ ہے کہ وہ بے وقت میں سنبھل لے۔"

"کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ بھٹکا ہوا وقت۔۔۔۔۔ بھٹکا ہوا وقت کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" اس نے کہا۔

میں اچانک کرختگی آگئی۔

"سونیتا تم مجھے یہاں مسمان بنا کر لائی ہو۔"

"ہاں تو پھر؟"

"بہتر یہ ہے کہ یہ رات مجھے بسر کر لینے دو۔ اور اگر مناسب نہیں سمجھتی ہو تو میں یہاں سے جاؤں؟"

"کہاں جاؤ گے؟ باہر بارش ہو رہی ہے۔"

"ہاں لیکن اگر تم نہ ملتیں تو میں اسی بارش میں کیسے ہوتا۔ مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے۔"

"یہ تمہارے مقدر کی خرابی ہے اور کچھ نہیں۔ تمہارے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ کچھ بندوبست بھی نہیں کر سکتے اور اس کے بعد تم مذہب مذہب کی رٹ لگائے ہوئے ہو" اس کے انداز میں پناہ جھلاہٹ تھی اور میرے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں میں اپنے مذہب کا پیرو ہوں۔ میں ساری دنیا سے زیادہ اپنے مذہب کو چاہتا ہوں۔ اگر تم میری موجودگی پسند نہیں کرتیں تو میں چلا جاؤں گا" میں نے کہا۔

"اسی وقت نکل جاؤ۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ اٹھو" وہ پھری ہوئی شیرنی کی طرح واپس آئی۔ اس

دن پر لپٹی ہوئی چادر کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا "کھڑے ہو جاؤ۔۔۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے" اس نے آوازے کی جانب دھکا دیا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ٹھیک ہے۔ بس سونیتا میں چلا جاتا ہوں" میں نے کہا اور دروازے کی جانب مڑ گیا۔ "میرا لباس ہے؟"

"گیٹ آؤٹ" وہ حلق پھاڑ کر دھاڑی۔

"میرا لباس" میں نے بھاری لہجے میں کہا اور سونیتا جھلائے ہوئے انداز میں ایک طرف بڑھ گئی۔ پھر میری ایک دروازے سے پستول نکل لیا۔

"نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔"

"اوہ گویا تمہاری چادر میں" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور سونیتا نے اندھا دھند ایک فلاں جھونک دیا۔

میں نے ہاتھیں سمٹ سے نکل گئی تھی اور میرے ہونٹ سڑ گئے۔ میں اس کی طرف پلٹ کر میرا خیال تھا کہ اب اس تلاش کر لوں لیکن سونیتا میرے پیچھے ہی آئی تھی۔

"میں کہتی ہوں فوراً" یہاں سے نکل جاؤ" اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور میں نے گردن ہلا کر

اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ مجبوری تھی۔ اس انداز میں تو گھر سے باہر جا نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے جانب بڑھا اور دروازے کے باہر قدم رکھ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ سونیتا دروازے کے نزدیک آئے گی وہ دروازے کے نزدیک آئی، میں نے دروازہ پوری قوت سے اندر دھکیلا۔ سونیتا کے حلق سے گلی اور وہ نیچے گر پڑی۔ تب میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے اس ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ دیا جس پر دبا ہوا تھا۔ پھر دوسرے پاؤں کی ٹھوک کرنے پستول کو دور پھینک دیا۔ میں نے جھک کر سونیتا کے بل پر اسے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔ پھر ایک گھونسل میں نے اس کی پشت پر رسید کیا۔ میرے دوسرے ہاتھ سے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ تب میں نے دروازہ بند کیا اور اپنے لباس کو تلاش کرنے لگا جو جگہ مل گیا۔

ابھی لباس کے خشک ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا۔ لیکن میں نے گیلیا لباس دوبارہ پہن لیا اور اپنے جوتے بھی اٹھا لیے جو بھیگ گئے تھے اور اس کے بعد میں اطمینان سے سٹی بجاتا ہوا سونیتا کے باہر نکل آیا۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا چل دیا۔ سردی شدید ہو گئی تھی لیکن میرے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہی انوکھی آوازیں جو نہ جانے کہاں سے میری روح میں اتر گئی تھیں۔ اور یہ آوازیں مجھے سکون دے رہی تھیں۔ میرے ذہن سے تردد کے ہر احساس کو دور کر رہی تھیں۔ پھر ایک سانبان کے نیچے میں نے پناہ تلاش کی۔ لیکن بارش تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

پھر ایک کار کی روشنیاں نظر آئیں۔ رفتار بے حد تھی اور پھر وہ میرے قریب آکر رک گئی
میں چونک پڑا۔
”سنو نواز۔۔۔ سنو“ کسی نسوانی آواز نے مجھے پکارا اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میری
میں نہیں آیا تھا کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں نے اپنی جگہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔
تب کار کا دروازہ کھلا اور سیاہ اور کوٹ اور زننہ ہیٹ میں ملبوس کوئی باہر نکل آیا۔ وہ میرے قریب
پہنچ گیا اور پھر میرے مقتل آگیا۔ ”آؤ نواز میرے ساتھ آؤ پلیز۔“

”کون ہو تم؟“

”میرا۔۔۔ میرا ڈاسلنک“ جواب ملا اور اب میں اسے پہچان گیا۔

”اوہ مس میرا خیریت۔ آپ ان سڑکوں پر اس وقت؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔

”ہاں۔ آؤ“ اس نے کہا اور میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کہیں؟“

”پلیز نواز، آؤ۔“

”سوری۔ میں یہاں کافی آرام سے ہوں۔“

”نواز“ تمہیں اپنے مذہب کی قسم میرے ساتھ آؤ۔ میری ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں
گی۔ کوئی ایسا کام نہیں ہو گا جو تمہاری مرضی کے خلاف ہو یا جس سے تمہاری ذات پر کوئی ضرب پڑے گی۔
”ہوں۔ وعدہ۔“

”خلوص دل سے“ اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ آگے بڑھ آیا۔ ”کار میں داخل ہو کر خاموش
رہنا کوئی گفتگو مت کرنا“ اس نے کہا اور مجھے تعجب ہوا۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور میرا نے کار اشارت کر
آگے بڑھا دی۔

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق خاموشی ہی اختیار کی تھی اور کار سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ پھر
چھوٹی سی قیام گاہ کے سامنے اس نے کار روک دی اور نیچے اتر آئی۔ مجھے بھی اس نے کار سے اترنے کا
کیا تھا۔

کار لاک کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ آئی۔ میں نے اب بھی اس سے گفتگو نہیں کی تھی۔ تب
یعنی پانسہ پلستان کے کاؤنٹر پر پہلی روشنی کے نیچے ایک موٹی بوڑھی عورت اوتگھ رہی تھی۔ میرا نے
کھٹکھٹایا اور وہ چونک پڑی۔

”لوں“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔

”کمرہ چاہیے۔“

”ڈبل؟“ بوڑھی نے رجسٹر سامنے سر کالیا۔

”ہاں۔“

”ہم؟“ بوڑھی ہل پوائنٹ کو زبان سے لگا کر بولی۔

”مسٹر اینڈ مسز ڈینس“ میرا نے جواب دیا اور بوڑھی نے نام لکھ لیا۔

”روم نمبر سات۔ تمہیں فراٹک روزانہ۔ پانچ فراٹک غسل کے لیے“ اور میرا نے کچھ نوٹ نکل کر
سامنے رکھ دیے۔

”فی الحال ایک ہفتے کے لیے۔ اس میں توسیع حسب ضرورت اور یہ تمہارا انعام“ اس نے ایک دس
نوٹ الگ سے اس کے سامنے رکھ دیا اور بوڑھی مودب ہو گئی۔

”میں آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں۔ اس وقت سارے فرائض مجھے انجام دینا ہوتے
ہے۔“ وہ پھدک کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آئی۔

”تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے کمرے میں تھے۔ یہ سارے کھیل مجھے بہت دلچسپ لگ رہے تھے۔
میری طرف دیکھا تو میں مسکرا دیا۔

”آپ بھیگے ہوئے ہیں مسز نواز۔“

”چنانچہ لباس تبدیل کر لوں؟“

”ممکن نہیں ہے لیکن ٹھہریے۔ میں آتش دان گرم کر دوں“ وہ آتش دان کے قریب پہنچ گئی اور
آگ روشن کرتے دیکھ رہا تھا۔

”آئیے۔ براہ کرم اس کے سامنے آجائیے۔“

”شکریہ“ میں نے کہا اور آگ کے سامنے آ بیٹھا۔ میرا نے بھی ایک کرسی میرے قریب کھینٹ لی

”آپ کا کیا حکم ہے میرا؟“ میں نے پوچھا۔

”براہ کرم اس انداز میں گفتگو نہ کریں۔ میں آپ کی عزت کرتی ہوں“ وہ بولی۔

”اس کے عوض مجھے کیا پیش کرنا ہو گا؟“

”آپ مجھے ذلیل کرنے پر تلے ہی ہوئے ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں جاؤں؟“

”دل تو چاہتا ہے کہ آپ سے بہت سی گفتگو کروں۔“

”ایسی ہی طوریہ گفتگو؟“

”تب موضوع آپ ہی بتادیں۔“

”میرے پاس کوئی موضوع نہیں ہے۔“

”اچھا یہی بتادیں کہ آپ نے یہ کرم فرمائی کیوں کی؟“

”آپ کے کردار سے متاثر ہو کر۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ خوب تو میرے کردار میں کوئی خوبی نظر آئی ہے آپ کو؟“
”ہاں۔“

”لیکن آپ اس سائبان کے نیچے کہاں سے آگئیں؟“
”آپ کی نگرانی پر میری ڈیوٹی ہے۔ اب ساری رات میں آپ کی نگرانی کروں گی۔“
”خوب۔ تو میری نگرانی کی جارہی ہے؟“
”اس وقت سے جب سے آپ وہاں سے نکلے ہیں۔“
”لیکن کیوں؟“

”جینگو نیم پاگل ہے اور اس کا مسلک یہی ہے کہ آپ اگر کوئی عام انسان ہوتے تو شاید وہ آپ پر اتنی توجہ نہ دیتے۔ لیکن جو شخص ڈوڈو جیسے آدمی کو ہلاک کر دے وہ ان کی نگاہوں میں کوئی عام آدمی نہیں ہے۔“

”لیکن وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“
”آپ کو اپنے ساتھ شریک کرنا۔ وہ آپ کو اپنے مسلک کا قائل کرنا چاہتے ہیں۔“
”آپ ان کے مسلک میں شامل نہیں ہیں؟“
”ہرگز نہیں۔“

”پھر آپ ان کے ساتھ کیوں ہیں؟“
”اپنی مجبوری بتا چکی ہوں۔“
”یعنی وہ لپانچ لوگ۔“
”ہاں۔“

”لیکن وہ ہیں کہاں؟“
”فرانس میں نہیں ہیں۔“
”اوہ۔ اور ان کی کفالت؟“

”بخوبی ہو رہی ہے۔ اسی لیے میں ان کے ساتھ ہوں۔“
”ایک طرح سے آپ کی مجبوری آپ کو ان کے ساتھ رکھے ہوئے ہے؟“
”ہاں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“

”افسوس ہوا۔ خیر تو کیا آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ انہی کی ہدایت ہے؟“
”نہیں۔ ان کی ہدایت تو یہ ہے کہ آپ کو زندگی کے کسی مشن میں کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔“

”آپ کو ہر طرح سے مجبور کیا جائے کہ آپ برائی کریں۔“
”پھر آپ نے ان سے بغلوت کیوں کی؟“

”بچے ضمیر کی آواز پر۔“

”کیا آپ نے یہ خطرہ مول نہیں لیا؟“

”کیا ہے۔ لیکن جو کچھ کیا ہے اسے چھپانے کی کوشش کروں گی۔ آپ بھی میری مدد کریں۔ میں تک لے آئی ہوں۔ یہاں کے بارے میں انہیں اطلاع دے دوں گی لیکن اس وقت جب آپ مل جائیں گے۔“

”کل کر کہاں جاؤں گا؟“

”آپ خود کوشش کریں کہ کسی طرح انہیں ڈال دے دیں۔ آپ کو چالاکی سے کام لے کر یہاں۔“

”خوب۔ آپ کا شکریہ مس میرا۔ لیکن اگر یہ بات ہے تو براہ کرم مجھے کچھ اور تفصیل بتائیں۔“
”خلا کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟“

”کیا میری جیب خالی کی گئی تھی میرا مطلب ہے بوڑھی عورت سے مجھے جو رقم ملی تھی اسے میری جینگو کے کسی آدمی نے ہی اڑایا تھا؟“
”ظاہر ہے۔“

”اور پھر سوئیتل کیا سوئیتا کو بھی جینگو ہی نے میرے پیچھے لگایا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں سوئیتا اس گروہ کی خاص رکن ہے اور اسے اس بات پر آمادہ کیا گیا تھا کہ وہ آپ کو لے جائے اور اچھائیوں کے راستے سے ہٹا دے۔ اگر آپ اس کے چنگل میں پھنس جاتے تو پھر کو واپس بلا لیتا اور یہ صورت حال آپ کے سامنے رکھتا۔ آپ کو شاید اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ یہ روم میں ٹیلی ویژن کیمرے نصب تھے جو آپ کی گفتگو اور تصاویر ان تک پہنچا رہے تھے۔“

”لوہو تو جینگو کا مشن کوئی فقیرانہ مشن نہیں ہے بلکہ جدید ترین سائنٹیفک طریقوں سے آراستہ

”ہاں۔ ترلوکانے نہ جانے کیا کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ اس کے بارے میں تو اس کے اپنے آدمی ملے نہیں کر سکتے۔ جینگو اس کا نائب خاص ہے اور وہ اس معاملے میں ترلوکا کا دست راست بھی

”خوب۔ کیا آپ نے ترلوکا کا ٹھکانہ دیکھا ہے مس میرا؟“

”نہیں۔ میں وہاں نہیں پہنچ سکی۔“

”اس کے بارے میں مزید کچھ تفصیلات؟“

”افسوس زیادہ معلومات مجھے بھی نہیں ہیں۔“

”کیوں اس کی کیا وجہ ہے؟“

”بہت ساری باتوں کو عام لوگوں سے پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔“

”تو سونیتا کا مشن کیا تھا؟“

”یہی کہ آپ کو اپنے جہل میں پھانس لے اور آپ کی تمام تصویروں وہاں ریکارڈ کی جاسکیں۔ ذریعے آپ کو بتایا جائے کہ آپ کے خیالات و افکار غلط ہیں۔ قدم قدم پر برائیاں ملتی ہیں اور ان برائیاں سے انسان کا بچتا بے حد مشکل ہے۔ وہ آپ کو مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ آپ برے راستوں پر چل نکلیں۔ بالآخر وہ آپ کو قاتل کر کے اپنے میں شامل کر لیں۔“

”خوب۔ تو سونیتا کے ہاں جو کچھ ہوا اسے با آسانی دیکھا جاسکتا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں۔ نہ صرف دیکھا گیا بلکہ اس کی تمام تصویروں بھی ان کے پاس موجود ہوں گی۔“

”آپ اس وقت کہاں تھیں؟“

”وہیں۔ اسی جگہ جہاں یہ تمام تصویروں دیکھی جا رہی تھیں۔“

”پھر اس کے بعد؟“

”اس کے بعد میری ڈیوٹی کا وقت تھا۔ چنانچہ میں وہاں سے چل پڑی۔ وہاں سے واپس آکر میں ان لوگوں سے چارج لیا جو شروع سے آپ کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اب مجھے ہدایت ہے کہ آپ کی نگرانی کروں۔ صبح کو یقینی طور پر کچھ اور کاروائیاں عمل میں آئیں گی۔“

”تب تو مس میرا آپ نے میرے اوپر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

”نہیں مسٹر نواز۔ میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔ البتہ میں اخلاقی فرائض ضرور پورا کرنا چاہتا ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ مس میرا۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں خود بھی اچھے راستوں کا راہی ہوں۔ برائیوں کے بہت سے پہلو میں نے اپنائے ہوئے تھے۔ بلکہ یوں سمجھا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ میری زندگی برائیوں ہی میں گزری ہے۔ میں اگر جینگو کے خلاف اٹھ کھڑا ہوں تو جینگو کو ناکوں پر پنے دوں۔ میں اسے اس حد تک زچ کر دوں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔ لیکن میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کی ہے۔ میں چاہتا ہوں مس میرا کہ..... اب سکون کے راستے اپناؤ۔ نزدان کا ساتھی بن جاؤں۔ مذہب کے بارے میں میں نے کبھی اتنی شدت سے نہیں سوچا تھا۔ یعنی شدت سے وہ میرے ذہن میں اب آیا ہے۔ میں جینگو اور ترلو کا کو شکست دینے کا خواہش مند ہوں۔“

”میری رائے ہے مسٹر نواز کہ آپ ان کی نگاہوں سے او جھل ہو جائیں اور جس وقت بھی ملے فرانس سے نکل جائیں۔ ہاں چند باتوں کو ضرور ذہن میں رکھیں۔“

”ابھی فرانس سے نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ پہلے اس کوشش میں اپنا پورا پورا وقت صرف کریں کہ آپ انہیں پکڑ دے سکیں۔ آپ جس طرح بھی ان کی نگاہوں سے او جھل رہ سکتے ہیں

وقت یہاں گزاریں اور اس کے بعد کسی ایسے طریقے سے فرانس چھوڑنے کی کوشش کریں کہ ان سے نہ آسکیں۔ آپ یہاں سے لندن چلے جائیں۔ ہاں ایک خیال رکھیں کہ انہیں آپ پر شبہ نہ ہو۔ ہم باہر جانے والے راستوں پر ان کی نگرانی ہے۔“

”اتنی شدت سے وہ میرے بارے میں مصروف عمل ہیں۔“

”ہاں۔ جینگو کی یہی علوت ہے اور آپ نے تو اسے وہ نقصان پہنچایا جو اس نے اپنی تمام زندگی میں اٹھایا ہو گا۔ چنانچہ وہ خاص طور سے آپ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔“

”بڑی دلچسپ بات ہے۔ بہر حال میں نے گردن ہلائی۔ آپ کے اس احسان کا میں شکریہ بھی ادا کر رہا ہوں۔ ہاں آپ کی یہ کوشش میرے عزائم میں بہت بڑی معاونت ہے۔“

”بار بار اس کا ذکر نہ کریں نواز صاحب۔ میں جو کچھ کر سکتی ہوں وہ میں نے کیا ہے اور آپ براہ مری طرف سے یہ رقم رکھ لیں۔ اس وقت میرے پاس صرف یہی ہے۔ اس سے زیادہ میں آپ کو دے سکتی۔ ویسے آپ انتہائی کوشش کریں کہ آپ اپنے آپ کو ان نگاہوں سے پوشیدہ رکھ سکیں۔“

”میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا مس میرا۔ لیکن چند سوالات اور بھی ہیں۔“

”جی جی فرمائیے۔“

”آپ اب یہاں سے واپس جا کر انہیں اطلاع دیں گی؟“

”واپس جا کر نہیں بلکہ ٹیلی فون پر۔“

”اور میں یہاں سے چلا جاؤں؟“

”ہاں یہ بوڑھی عورت انہیں بتائے گی کہ آپ اس کمرے میں مقیم تھے۔ میرا نے کہا۔“

”لیکن میرے خیال میں آپ ایک غلطی کر چکی ہیں۔“

”کیا؟“

”آپ نے مسٹر اور مسز ڈنیل کے نام سے یہ کمرہ حاصل کیا ہے۔ یہ مسز ڈنیل کون ہو گی؟“

”اوہ۔ میرا کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ پھر بولی ”یہ تو غلطی ہو گئی۔ مجھے آپ کے ساتھ کمرے تک نہیں آنا چاہیے تھا۔“

”خیر آپ فکر مند نہ ہوں۔ آپ صرف انہیں یہ اطلاع دیں کہ میں اس کمرے میں مقیم ہوں اور اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک کہ ان کے دوسرے آدمی یہاں تک نہ پہنچ جائیں۔“

”تب پھر آپ ان کی نگاہوں میں ہی رہیں گے۔“

”ہاں۔ بہر صورت آپ نے میری جو مدد کی ہے اگر زندگی میں اس کا موقع ملا تو کبھی نہ کبھی اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔ نہ کر سکوں تو آپ مجھے معاف کر دیں۔ باقی جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے تو میرا میں آج جب نیکیوں کا مسافر ہوں اور سیدھے راستے کی تلاش میں ہوں، راہ حق پر چلنا چاہتا

ہوں تو ایک بار پھر اپنی اسی پچھلی زندگی میں آجاؤں گا لیکن اس بار میرا مقصد دوسرا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ ان ہنگاموں کو دوبارہ اپناؤں۔ لیکن اب ان کی نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ اب میں اپنے مذہب محافظ کی حیثیت سے ان کے سامنے آؤں گا اور اپنی وہ صلاحیتیں اچھائی کے لیے کام میں لاؤں گا جن سے تک برائیاں کرتا رہا ہوں میں نے کہا۔

”آپ ان سے مقابلہ کریں گے؟“

”ہاں کوشش کروں گا“ میں نے کہا اور میرا گردن ہلانے لگی پھر اس نے پر خیال انداز میں کہا: ”لیکن مسٹر نواز میرا خیال ہے کہ آپ زیادہ ان جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ اگر آپ سیدھے راستہ کے مسافر ہیں تو کوئی بہتر راستہ تلاش کر لیں۔ ان ہنگاموں سے نکل جانا ہی..... بہتر ہوگا۔ وہ لوگ زیادہ تو ہیں۔ شیطان کے ہاتھ یوں بھی..... لمبے ہوتے ہیں۔“

”میری جنگ ہی شیطان سے ہے“ آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔“

”میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

”بس کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو کسی طرح اس ہنگامے میں ملوث نہ کریں۔“

”میرا مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے گردن جھکا کر کہا:

”مسٹر نواز آپ کو علم ہے کہ میں بھی اپنی مجبوریوں کے تحت ان لوگوں میں پھنسی ہوئی ہوں۔

اگر مجھے اپنے لواحقین کا احساس نہ ہوتا تو میں کبھی ان کا ساتھ نہ دیتی۔ خواہ مجھے جان سے ہاتھ کیوں نہ دو

پڑتے۔ لیکن میری بد بختی میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ ان کے خلاف

بہر صورت آج تک ضمیر کے خلاف جو کچھ کرتی رہی ہوں، اگر اس کی تلافی کے لیے کوئی نیکی مجھے موت سے

بھی ہمکنار کر دے تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ ہر چند کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ تاہم میں کھلم کھلا ان کے

خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اس کی وجہ آپ کو معلوم ہے۔ میں کسی طور اس سلسلے میں خود کو ملوث نہ

کروں گی۔ لیکن براہ کرم آپ انتہائی کوشش کریں کہ آپ ان کی نگاہوں سے دور رہ سکیں۔“

”میں آپ کے اس خلوص اور محبت کی ہمیشہ قدر کروں گا“ میں نے جواب دیا۔

”تو میں اب چلتی ہوں۔“

”کہاں جائیں گی آپ؟“

”بس نیچے اپنی کار میں رات گزاروں گی۔“

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمیں بھی نہیں آئے گی اور آپ کو بھی۔ ظاہر ہے

رات بھر جاگنا ہوگا۔“

”نہیں۔ یہ بات نہیں ہے“ وہ مسکرائی۔

”کیوں؟“

”میں آرام سے کار میں سو جاؤں گی۔ صبح کو اٹھوں گی اور انہیں اطلاع دے دوں گی۔ کیونکہ اس

بستر مگرانی کسی نے کبھی نہ کی ہوگی“ اس نے کہا اور ہنس پڑی۔ مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ بہر حال جیسا آپ پسند کریں۔ میں آپ کو یہ دعوت نہ دوں گا کہ آپ رات بھی

مرے میں گزاریں۔ یہ کسی بھی صورت میں مناسب نہ ہوگا۔“

”ہاں میں بھی اسے مناسب نہیں سمجھتی“ میرا نے جواب دیا اور اٹھتے ہوئے بولی۔

”میری تمام اچھی خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو کامیاب کرے“ اس نے بڑے

خلوص لہجے میں کہا اور پھر اس نے اپنا پرس میرے سامنے خالی کر دیا۔ خاصی رقم تھی۔ میں نے ممنون

وں سے اسے دیکھا۔

”یہ رقم کس حیثیت سے؟“

”نیکی کے راستوں کے مسافر کے لیے میری طرف سے حقیر سا زور راہ۔ آپ اسے کبھی اپنے ذہن پر

نہ سمجھیں“ میرا نے بڑی لجاجت سے کہا۔

”میں آپ کا ممنون ہوں میرا“ میں نے نہایت خلوص سے کہا۔ اس عورت کے ایثار نے میرے

دل میں اس کے لیے بڑے تشکر اور تقدس کے جذبات موجزن کر دیے تھے۔ میں اسے ممنون نگاہوں سے

نکال دیکھتا رہا۔

”وہ باہر نکل گئی۔ میرے ذہن پر میرا کے کردار نے گہرا نقش چھوڑا تھا۔ ایک ایسا نقش جس میں

کڑی تائید تھا۔ گناہوں کے سمندر سے گہرا وہ ایک پھولوں بھرا مقدس جزیرہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں بستر پر

بٹ گیا۔ نیند کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ اور میرا ذہن بے شمار منصوبے تراشنے میں مصروف ہو گیا۔

مجھے آج اپنی صلاحیتوں کو پھر آواز دینی پڑ رہی تھی۔ ہاں رنگ بدلا ہوا تھا۔ میں تعلیم یافتہ تھا۔

مذہب کو میں نے ذہن سے کھرچ پھینکا تھا۔ لیکن اتنا جانتا تھا کہ نیکی کے لیے تلوار بھی اٹھانی پڑے تو گریز نہیں

کرنا چاہیے۔

میرا نے ایسے وقت مجھے سہارا دیا تھا جب میں بے رحم دشمنوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور تنہا تھا۔

لیکن اب میں خود کو تنہا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے دل کو جو سکون اس وقت

مل رہا تھا، میں ہمیشہ اس سے محروم رہا تھا۔ حقیقی سکون کا احساس ہوتے ہی مجھے نیند آگئی۔ دوسری صبح میں کافی

دیر سے جاگا تھا۔

مونٹی عورت ابھی موجود تھی۔ لیکن رات کے جاگنے کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔

”میری ڈیوٹی تو ختم ہو گئی۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”صبح ہی صبح ناشتے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”ناشتہ کرو گے؟“

”ضرور کروں گا۔ لیکن ایک بات بتاؤ مس“
”جی۔“

”میری بیوی ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ میں آج ہی یہ جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں۔“
”تو چھوڑ دو۔“

”تمہیں ایک ہفتے کا کرایہ ادا کیا گیا ہے۔“
”وہ تمہیں واپس مل جائے گا۔“

”شکریہ!“ میں نے دس فرانک کا ایک نوٹ بوڑھی کو دے دیا اور اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا۔

”میں تمہارے لیے ناشتہ بھجوا دوں۔ کیا کھاؤ گے؟“

”جو کھلا دو“ میں نے کہا اور بوڑھی مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے نہایت عمدہ ناشتہ بھجوا دیا جس سے اچھی طرح انصاف کر کے میں نے بوڑھی سے حساب کتاب کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

”میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں لیکن دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میرے پیچھے کوئی نہ ہو لیکن ان لوگوں نے کمال ہوشیاری سے کام لیا ہو گا۔ کافی دیر تک میں تعاقب کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکا۔“

کاکوروچوک سے سکندر سوم کے مشہور پل تک آیا۔ ساری دنیا اپنی اپنی مصروفیات میں مگن تھی۔ جوڑے ایک دوسرے میں گم یہ بھولے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھنے والے بھی موجود ہیں۔ دریا کے پار پولین کا مقبرہ دکھائی دے رہا تھا۔ کلیسائے سکرے کے سفید گنبد اور نہ جانے کیا کیا؟

پھر لوور کے عجائب گھر کے قریب میں نے ان دونوں کو دیکھ لیا جو میرے تعاقب میں تھے۔ پہچان اس لیے گیا کہ پہلے بھی ایک بار ان کی صورت دیکھ چکا تھا۔

یہی دونوں ہیں یا کوئی اور بھی۔ میں نے سوچا اور ان دونوں کے بارے میں اندازہ لگانے کے لیے طویل فاصلہ طے کیا۔ کلیسائے فوٹوڈیم کے خوبصورت مینار نظر آرہے تھے۔ پھر وہاں سے پھولوں کے بازار میں نکل آیا۔

وہی دونوں میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔ اب تک چونکہ میں نے پیدل سفر کیا تھا اس لیے وہ بے چارے بھی پیدل ہی میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ وہ دونوں ہی میرے پیچھے ہیں اور کوئی نہیں ہے تو میں نے انہیں چمکے دینے کا منصوبہ بنایا۔ اور اس خیال کے تحت میں ایک چوڑی سڑک پر آ نکلا۔ وہ دونوں ہوشیاری سے میرا تعاقب کر رہے تھے۔

میری نگاہیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں۔ ان کا فاصلہ سو گز سے زیادہ تھا اور میں بار بار عقب میں ہاتھ پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دور سے ایک خالی ٹیکسی آتی نظر آئی۔
جونہی ٹیکسی میرے قریب پہنچی میں نے اسے آواز دی اور ٹیکسی رک گئی۔ میں جلدی سے عقبی کھول کر اندر بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

”ایفل ٹاور“ میں نے ڈرائیور سے کہا اور ڈرائیور نے ٹیکسی آگے بڑھادی۔ میں نے انہیں بے کے عالم میں دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن دونوں بے چارے مارے گئے تھے۔ نہ جانے انہوں نے کہاں چھوڑی تھی۔

پھر میں انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظر آئے۔ وہ بری طرح تھلا رہے تھے۔
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایفل ٹاور پہنچ کر میں اتر گیا۔ اور ڈرائیور کو بل ادا کر کے طرف چل پڑا۔ میں انہیں کامیاب ڈال دے آیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب میں ان کی نگاہوں سے دور

میں بہت خوش تھا۔ پھر میں نے بازار کھنگالنے شروع کر دیے اور اپنے مطلب کی ایک دکان میں ہو گیا۔ یہاں میک اپ کا سامان موجود تھا۔ میں نے اس دکان سے کافی سامان خریدا اور وہاں سے نکل سامان میں آئینہ بھی موجود تھا۔ میں بیک سنبھالے ایک اور دکان میں داخل ہوا۔ یہاں سے میں نے دوور بھی نہ رہوں اور اپنا کام بھی کرتا رہوں۔ ایک پارک میں بیٹھ کر میں نے پیکٹ کھول لیا اور آئینہ نے رکھ کر میک اپ کرنے لگا۔ ایک ہی راستہ تھا میرے لیے۔ ہال بکھرائے ہلکی سی دگ لگائی اور چہرے پر ترتیب جھاڑیاں اگالیں۔

پھر پھولوں کے ایک کنجے کے پیچھے جا کر میں نے اپنا لباس اتار کر نیا خرید اہوا لباس پہن لیا۔ کیونس جیکٹ جس پر چمڑے کے پھول بنے ہوئے تھے اور کسی بوڑھے فرانسیسی کی چست چٹلون جو میرے جسم پر آئی تھی۔

جوتے وغیرہ کے قسے کس کر میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور پھر کپڑے، آئینہ اور میک اپ کے پیکٹ کا پیکٹ بنا کر ایک کنجے میں پھینک دیا۔ اب میں ایک مکمل بیسی نظر آ رہا تھا اور بظاہر اپنی اوقات پر اُمید

نوبلی پل کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے شوروم میں میں نے سازوں کی دکان تلاش کی۔ بے کی میرا نے میری جس انداز میں مدد کی تھی میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اب بھی اس کی دی ہوئی میں سے میرے پاس خاصی رقم موجود تھی۔ کیونکہ میں نے پوری کفایت شعاری سے کام لیا تھا۔
”اسی فرانک کا ایک خوبصورت گٹار میں نے سازوں کی ایک دکان سے خریدا اور اسے گلے میں ڈال

کروہاں سے چل پڑا گویا۔ اب میں باروزگار بھی تھا۔
مجھے اپنے اوپر ہنسی آ رہی تھی اور یقیناً ہنسنے کی بات بھی تھی۔ کروڑوں روپے کا مالک راجہ نواز اصغر
اب صرف ایک بھکاری تھا۔ ایک بھکاری موسیقار جو گٹار بجا کر بھیک مانگتا ہے اور فی الحال مجھے اسی سے
کام چلانا تھا۔ اس سے کم از کم ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ میں جینگو اور اس کے حامیوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔
گٹار گلے میں ڈالے بیسیوں کی سی شکل بنائے پیرس کی سڑکوں پر گھومنا کوئی انوکھی بات نہیں
تھی۔ میں بھی اسی انداز میں سڑک ناپتا۔۔۔۔۔ رہا اور نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ اب میرے لیے قیام کا
مسئلہ تھا نہ طعام کا۔ جہاں ٹھہر جاتا وہی جگہ اپنی تھی۔ اس وقت جیب میں خاصی رقم موجود تھی۔ اس لیے
اس وقت تک تو کمائی کرنے کا موڈ نہیں تھا جب تک کہ جیب بھاری تھی۔ ہاں اپنے آپ کو اس انداز میں
ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ چنانچہ پیرس کے شب و روز گزرنے لگے۔ جہاں موقع ملتا کھانا کھا لیتا اور
جہاں بیسیوں کا گڑھ دیکھتا وہاں قیام کر لیتا۔

مقامی کیمپنگ جہاں بیسیوں کے ڈیرے تھے، میرا ہیڈ کوارٹر بنی ہوئی تھی۔ یہاں ایک بار میں
نے جینگو کو بھی دیکھا تھا۔ جینگو وہی انداز اختیار کیے ہوئے تھا اور اسی انداز میں گٹار بجا کر لوگوں کو ترلوکا
کی تعلیمات دے رہا تھا۔ دل تو چاہا کہ اسے درست کر دوں لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔۔۔۔۔ پھر بھی
مجھے یقین تھا کہ جینگو مجھے مس کر چکا ہے اور اب اسے میرے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔
آہستہ آہستہ رقم بھی ختم ہو رہی تھی اور میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام بھی نہیں تھا اور جینگو
بھی یہاں موجود تھا۔

جینگو کے بارے میں میں نے سوچا تھا کہ اس کا پیچھا کروں لیکن اس سلسلے میں میں ابھی کچھ سوچ رہا
تھا۔ میں ہر طرح سے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا چاہتا تھا۔ البتہ ایک ایسے شخص سے میری ملاقات ہو گئی جو
ترلوکا کا عقیدت مند تھا۔ اس شخص کو میں نے جینگو کے گروہ میں ہی دیکھا تھا۔ وہیں سے میں نے اس سے
تعارف حاصل کیا۔ نام اس کا ٹینکر تھا۔ ایک مست اور لاپرواہی انسان۔ میں اس سے بڑی عقیدت سے ملا تھا۔

”کیا تم بھی ترلوکا کے پیروکار ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”آہ۔ عظیم ترلوکا کی تعلیمات سے کون انکار کر سکتا ہے“ میں نے جواب دیا۔

”ہاں بے شک وہ انسانیت کا بہترین علمبردار ہے۔“

”اور جینگو اس کا نائب۔“

”بے شک بے شک، جینگو اسی قاتل ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔“

”تمہارا قیام کہاں ہے ٹینکر؟“

”قیام۔۔۔۔۔ قیام کہاں ہوتا ہے۔ کیا انسان کا قیام ہے؟“

”بہر حال سر چھپانے کے لیے ٹھکانہ تو ہوتا ہے۔“

”ہاں کیمپنگ میں ہوں۔“

”کیا تم جینگو کے ساتھی ہو؟“

”اس کا ہر عقیدت مند اس کا ساتھی ہوتا ہے۔“

”یقیناً“ میں بھی اس سے بہت متاثر ہوں۔“

”کیا تم نے کبھی اس کا درس سنا ہے؟“

”ایک بار اتفاق سے۔ دوبارہ کی حسرت ہی رہی۔“

”کیوں حسرت کیوں؟“

”اس کے بعد موقع ہی نہ مل سکا۔“

”یہ کون سی مشکل بات ہے۔ بوئے ڈی بولون اس کی رہائش گاہ ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”میں کسی دن لے چلوں گا۔“

”ضرور۔“

”تمہارا قیام کہاں ہے؟“

”کہیں نہیں ہے“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اؤ۔۔۔۔۔ پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے۔ بہر حال اگر پسند کرو تو میرے ساتھ رہو۔ اور ہاں یہ

”مجھے اس کا شوق ہے۔“

”مجھے بھی شوق ہے لیکن بجائے نہیں آتا۔ آج رات کو محفل رہے گی“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”ٹینکر آسٹریلوی باشندہ تھا لیکن نکلا۔ بہر حال اس وقت وہ میرا مددگار تھا۔ کیمپنگ میں دوسرے

بیسیوں کے ساتھ اس کا ڈیرہ تھا۔ عام بیسیوں کی مانند تلاش اور جب میں نے اسے شام کا کھانا اپنی

کھلایا تو وہ میرا گہرا دوست بن گیا۔

”رات کے لیے کچھ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ سے کیا مراد ہے؟“

”چرس وغیرہ جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔“

”خرید لیں گے۔“

”آہ۔ میرے دوست، تم گریٹ ہو۔ تو آؤ پھر رات کی تیاری کر لیں۔ تمہارا گٹار، چرس اور زندگی

وہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

ہم نے چرس خریدی، سگریٹ بھرے اور رات کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اور پھر میں ٹینکر کو

سگریٹ پلاتا رہا اور ٹینکر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ میں نے چالاکی سے خالی سگریٹ بھی اپنے پاس رکھے تھے۔ چنانچہ جس بھرے سگریٹ وہ پیتا رہا اور میں نے کئی خالی سگریٹ پھونک ڈالے۔

”بہی جوش و خروش میں تھے۔ تب ٹینکر نے ایک مستانہ نعرہ لگایا اور میری طرف جھک کر بولا: ”دوست“

”ہوں“

”تمہارا گٹار کیوں خاموش ہے سناؤ۔ ایک نغمہ سناؤ اور روح میں آگ لگا دو۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے کہا اور گٹار کے تار چھیڑ دیے۔ اور پھر یہ سرائیک خوبصورت نغمے میں ڈھل گئے۔ اس فن نے میرا جتنا ساتھ دیا تھا، کسی اور نے نہیں دیا تھا۔ یہی میرے گرد و قص کرنے لگے۔ ان جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بے خود ہوئے جا رہے تھے۔ ٹینکر کئی بار مجھے چوم چکا تھا۔

اور پھر وہ تڑھال ہو گئے۔ میں بھی تھک گیا تھا۔ میں نے گٹار بند کر دیا۔ ٹینکر سجدے کی سی کیفیت میں پڑا تھا۔ اور شاید سو گیا تھا۔ میں نے گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ اس وقت دو لڑکیاں نشے میں دمت میرے پاس پہنچ گئیں۔

”پالو“ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔

”نہیں کیونکہ“ دو سری بولی۔

”اوہ یو شٹ اپ“ پالو، صرف پالو۔“

”کیونکہ“ صرف کیونکہ“ دو سری سرخ سرخ آنکھیں چمکا کر بولی۔

”ٹھہرو فیصلہ ہوا جاتا ہے۔“

”ہاں فیصلہ کر لو۔“

”اے سنو“ ایک میری طرف رخ کر کے بولی ”تم کیونکہ ہو یا پالو“ اور مجھے ہنسی آگئی۔

”نہو نہیں جواب دو“ وہ غرائی۔

”آدھا آدھا“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“

”آدھا کیونکہ آدھا پالو۔“

”ہرا“ دونوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ پھر ان میں سے ایک بولی ”تب پھر آدھا آدھا ہنٹ لو۔“

”اور میں گھبرا گیا۔ اگر انہوں نے تقسیم شروع کر دی تو میرا کیا بنے گا۔“

”کیونکہ میرا“ ایک بولی۔

”اور پالو میرا لیکن یہ کدھر سے کیونکہ ہے اور کدھر سے پالو“ دو سری نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

”ہاں یہ فیصلہ تو کر لو۔“

”یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ دو سری نے پریشانی سے کہا اور پھر گردن جھٹک کر بولی ”اونہ یہ ہے کا پورا میرا ہے۔ بس تم یہاں سے دفعتاً ہو جاؤ۔“

”بکو مت“ یہ میرا ہے۔ اے اوہر آؤ“ میرے ساتھ چلو“ پہلی لڑکی میری طرف بڑھی لیکن میرے سے قبل ہی دو سری نے پیچھے سے اس کی کمر پکڑ لی اور پھر دونوں میں فری اسٹائل ہونے لگی۔ وہ وحشی کی مانند ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ چند ہی ساعت میں ان کے لباس تار تار ہو گئے اور وہ تقریباً ہو گئیں۔ بال اکھڑ گئے تھے اور چروں پر خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے اور میں گٹار اٹھا کر وہاں سے کھٹک لیا۔ پھر ایک نسبتاً پرسکون جگہ میں، میں نے رات گزار دی۔ لڑکیوں کا ہنگامہ نہ جانے کب تک جاری رہا تھا۔ دو سری صبح ٹینکر نے خود ہی مجھے تلاش کر لیا ”اوہ ڈیر“ تم کہاں چلے گئے تھے؟“

”بس ہوش نہ رہا تھا۔ اوہر آگیا۔ تم بھی تو۔۔۔۔۔“

”ہاں رات کو تم نے خوب سہل باندھا۔ بے شمار لوگ تمہاری تعریف کر رہے تھے۔ دو لڑکیاں شاید اس لیے لڑ پڑی تھیں۔“

”ہاں وہ مجھے تقسیم کرنا چاہتی تھیں۔“

”تو کرنے دیتے تے۔ یہ سب تمہارے گٹار کا مکمل ہے۔ بلاشبہ تم بے مثل موسیقار ہو۔ واہ واہ۔ میں دوستی پر نازاں ہوں۔ ارے ہاں ناشتے کے لیے کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس۔“

”ہاں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“

”تو آؤ نا“ ٹینکر بولا اور پھر ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا ”اگر تم کمانا چاہو تو آج شام ہم کاکٹورا چوک تو بازی کا مظاہرہ کریں۔“

”میرے پاس ابھی کل پیسے ہیں۔ جب ختم ہو جائیں گے تب دیکھا جائے گا۔“

”تب ٹھیک ہے“ تم تو سونے کی کلن ہو“ ٹینکر خوشدلانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ پھر بولا ”اب کیا پروگرام

”تم بتاؤ“

”آرام کریں گے۔ میری نیند تو پوری نہیں ہوئی۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے جواب دیا۔ میں خود بھی کسلندی محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک گوشہ کیا اور آرام کرنے لیٹ گئے۔ کیا خوب زندگی تھی۔ لیکن میں نے خود کو ہر رنگ میں رنگنے کا عادی کر چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد میں سو گیا۔

اور پھر آنکھ کھلی تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ آسمان بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور فضا میں خنکی آگئی تھی۔ میں نے ٹینکر کو دیکھا وہ موجود نہیں تھا۔ لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آگیا۔ اس کے ہاتھ میں

تل میں بیگ ہوا ایک پکٹ تھا۔

”جاگ گئے تم مجھے یقین تھا۔“

”کہاں چلے گئے تھے تم؟“

”کھانے کا بندوبست کرنے۔ بھوک نہیں لگی؟“

”لگی ہے۔“

”تب کھاؤ۔ تازہ تلی ہوئی مچھلی اور سلائس کھن گے ہوئے“ اس نے چٹکارے لیتے ہوئے کہا۔

”خوب۔ پیے کہاں سے آئے؟“ میں نے اس کے ساتھ شریک ہوتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری جیب سے نکالے تھے۔ میں نے سوچا جب تک تم جاگو کھانے کا بندوبست ہی کر لوں“ اس

نے اطمینان سے جواب دیا اور میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

بڑا بے تکلف دوست تھا۔ دوست کے مال کو اپنا ہی مال سمجھتا تھا۔ میرے اوپر کیا اثر پڑتا تھا۔ اتنے

سے پیسوں کو میں اہمیت ہی کیا دیتا۔ میں نے اس کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب کیا ارادہ ہے میرے دوست؟“ بینکر نے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں بینکر، تم بتاؤ۔“

”میں نے تمہاری پسند کا ایک پروگرام منتخب کر لیا ہے۔“

”خوب کیا پروگرام ہے؟“

”جینگو کی ایک درسگاہ میں چلیں گے۔ وہاں اس کا سبق ہے۔“

”کہاں؟“

”میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔“

”ٹھیک ہے“ میں نے جواب دیا۔ لیکن میرے ذہن میں بہت سے خیالات آنے لگے تھے۔ کیوں نہ

کسی طرح جینگو کے گروہ میں شامل ہوا جائے۔ اس کے ساتھ رہ کر میں اس کے لیے کوئی موثر قدم اٹھا سکتا

ہوں۔ حالانکہ یہ خطرناک کام تھا لیکن مجھے خطرات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

اور میں تیار ہو گیا۔ باقی وقت بالکل خالی تھا۔ میں غور و خوض میں مصروف رہا تھا۔ اور میرا ارادہ پختہ

ہو گیا تھا۔ یعنی یہ کہ کسی نہ کسی طرح جینگو کے گروہ میں شامل ہوا جائے اور اس کے بعد حالات جو راستہ

اختیار کریں۔

شام کو چھ بجے میرا دوست بینکر مجھے لے کر چل پڑا۔ میرا گٹار میرے ساتھ تھا۔ جس عمارت میں

آج کا سبق تھا، یہ بھی کافی خوبصورت تھی۔ کبوت جینگو نے یہاں نہ جانے کیا چکر چلا رکھا تھا۔ ایک سے

ایک عمدہ عمارت۔ بے پناہ اخراجات تھے اس کے۔ نہ جانے کہاں سے پورے ہوتے تھے۔ بہر حال اس کے

پروگرام اور اقدامات کافی مستحکم معلوم ہوتے تھے۔

حسب معمول یہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے اور پھر جینگو بھی آگیا۔ وہ اسی طرح مست

اس کی جوانیاں کچھ اور بڑھی ہوئی معلوم ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے وہ مجھ جیسے لوگوں کو کیا خاطر میں لاتا۔

میرے بارے میں یاد بھی نہیں رہا ہو گا۔

”انسانیت کے متوالو“ آج میں تمہارے سامنے صرف روح کے نغمے گاؤں گا۔ مستیاں اپنالو، ترلو کا

مارے لیے سکون بھیجا ہے۔ ساری الجھنیں معاشرے کا انتقام ہیں۔ تم اس معاشرے کے انتقام کا شکار

ہو؟ اپنی ذات کے سارے بوجھ اتار دو۔ گاؤ، میری لے میں لے ملا کر گاؤ۔“

اور جینگو نے گٹار چھیڑ دیا۔ بے حد تیز نغمہ تھا۔ بے شمار لوگ کھڑے ہو گئے اور دیوانہ وار رقص

لگے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اپنے اپنے ساز چھیڑ دیے تھے۔ ایسا طوفان..... بد تمیزی تھا کہ اللہ ان

بینکر بھی رقص کر رہا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بھی کھڑا کر دیا اور میں بھی گٹار بجانے لگا۔ میں

نغمے میں شریک ہو گیا۔ ہو ہو باہا کی آوازوں سے کلن پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

میری آنکھیں بند تھیں اور میں پورے جوش و خروش سے گٹار بجا رہا تھا اور پھر نہ جانے کب جینگو

گٹار بند کر دیا اور دوسرے ساز بے ہنگم چیتے رہے۔ صرف میرا گٹار جینگو کے نغمے کو قائم رکھے ہوئے

پھر کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور گٹار پر میرے ہاتھ رک گئے۔ میں نے آنکھیں کھولیں

میرے سامنے مسکرا رہا تھا۔

بجاؤ بجاؤ ترلو کا کے دیوانے تمہارا فن بے مثل ہے۔ محبت کا یہ نغمہ مجھ سے بھی اچھا بجا رہے ہو۔

اور میں نے نغمہ دوبارہ شروع کر دیا۔ جینگو نے جھوم جھوم کر تالیاں بجاتا شروع کر دیں۔

”اور پھر وہی شور شروع ہو گیا۔ لیکن اب میں پورے حواس میں تھا۔ سنسنی خیز لمحات تھے۔ چلاک

سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں اس کے اس قدر قریب نہیں آنا چاہتا تھا لیکن بہر حال وہ مجھے خصوصی

دے رہا تھا۔ اس لیے اس وقت نہایت احتیاط سے کام لیتا تھا۔ میں جینگو کے عقیدت مندوں کے سے

میں سر جھکا کر گٹار بجانے لگا اور وہی نغمہ گٹار کی دھن پر گونجنے..... لگا جو تھوڑی دیر قبل جینگو بجا رہا

تھا پھر دیوانہ وار ناچنے لگے تھے۔ تب جینگو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور میں نے گٹار بند کر دیا۔

”اب کوئی اور نغمہ موسیقار“ اس نے مست انداز میں جھومتے ہوئے کہا اور میں نے سر جھکا کر

نغمہ شروع کر دیا۔ دوسرا نغمہ بھی خاصا تیز تھا اور میں جانتا تھا کہ اس وقت ان لوگوں کو ایسے ہی نعمات

پورے ہیں۔ چنانچہ میں نے جھوم جھوم کر اپنی پسند کا نغمہ بجا لیا جس کی دھن خاصی تیز تھی اور دلوں کو

کرتی تھی۔ اس وقت ناچنے والوں کی وجہت اور بھی عروج پر پہنچ گئی تھی اور نہ جانے کتنی دیر تک یہ

اور شور رہا۔ جینگو مسکرا رہا تھا۔ وہ خود بھی تالیاں بجا بجا کر جھوم رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے

ہاتھ بلند کر دیا۔

”بس حد سے بڑھی ہوئی ہر چیز نقصان کا باعث ہوتی ہے“ اس نے کہا اور پھر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

”موسیٰ قار تم اس قدر قیمتی ہو کہ تمہیں نگاہوں سے اوجھل کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ“ جینگو نے کہا اور میرا دوست ٹینکر ششدر رہ گیا۔ مجھے جو حیثیت ملی تھی وہ ان لوگوں کے لیے بہت حیران کن تھی۔

میں جینگو کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ درس ختم ہو گیا تھا اور اب جانے والے لوگوں کو واپس جانا تھا۔ جینگو مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک طرف اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندرونی دروازے سے کہیں چلا گیا۔

دیر تک میں خاموش بیٹھا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد جینگو اسی دروازے سے واپس آیا اور مسکراتا ہوا میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”موسیٰ قار تمہارا فن عروج پر ہے۔ تم ترلوکا کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہو۔ جس سے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔ تم اس کی تعلیمات سے کب متاثر ہوئے؟“

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا مسٹر جینگو۔ میری روح اس کے گرد چکراتی ہے“ میں نے جواب دیا۔

”وہ روحوں کا حکمران ہے۔ بلاشبہ وہ روحوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس کے افکار اس کے خیالات بہت بلند ہیں۔ اس نے انسانیت کو جو کچھ دیا ہے، تم یقین کرو میرے دوست کبھی کسی نے نہ دیا ہوگا“

نے کہا اور میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کھلانے لگی۔ لیکن میں اپنی زبان سے اپنے حقیقی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

”موسیٰ قار تم ہمیں اس قدر پسند آئے ہو کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھیں کیا تم اسے منظور کرو گے؟“

”میری اس سے بڑی خوش بختی کیا ہو سکتی ہے جینگو کہ میں ترلوکا کے خدمت گاروں کی حیثیت سے تمہارے ساتھ رہوں“

”یقیناً“ ————— ”یقیناً“ ہم تمہیں اس حیثیت سے اپنے ہاں خوش آمدید کہتے ہیں، فی الوقت تم ہمارے ساتھ یہاں رہو پھر ہم تمہیں ترلوکا کے پاس لے چلیں گے۔“

”میں انتہائی مسرور ہوں“ میں نے کہا اور جینگو گردن ہلانے لگا۔ پھر وہ بولا:

”ابھی تھوڑی دیر کے بعد ہم یہاں سے چلیں گے۔ میں تمہارے آرام و آسائش کا بندوبست کر دوں گا۔“

”ہمیں کسی آرام و آسائش سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ آرام و آسائش ایسے مفروضات ہیں جنہیں انسان نے خود پر مسلط کر لیا ہے۔ زندگی تو بڑی سادہ سی چیز ہے۔ اور آپ خود جانتے ہیں مسٹر جینگو، ترلوکا نے

جو سب سے بڑا درس دیا ہے، وہ ساری زندگی گزارنے کا اصول ہے“ میں نے کہا اور جینگو پیار بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”بے شک کیا پوچھ گئے؟“

”کچھ نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟“

”ایڈن“ میں نے فوری طور پر جواب دیا۔ کچھ سوچ کر جواب دینا خطرناک تھا۔ جینگو مسکرا کر گردن ہلاتا تھا۔

”خوب مسٹر ایڈن۔ تم مجھے کافی پسند آئے ہو۔ میں اب چلتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں سے جاؤں گا تو تم میرے ساتھ چلو گے۔“

”بہت بہتر“ میں نے جواب دیا اور جینگو اسی دروازے سے واپس چلا گیا جس سے آیا تھا۔ گویا مجھے کھانا تھا۔ لیکن اکیلے بیٹھے رہنا مجھے عجیب سا لگتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچا رہا۔ پھر اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگا۔

ظاہر ہے اس کے ساتھ تو جانا ہی تھا اور یہ عمارت اتنی وسیع بھی نہیں ہے کہ وہ مجھے تلاش نہ کرنا چاہیے میں نے سوچا کہ اس عمارت میں کیوں نہ دوسرے لوگوں سے بھی شرف ملاقات حاصل کیا

لیکن ابھی باہر قدم رکھائی تھا کہ دو لڑکیاں آتی نظر آئیں۔ مناسب بدن والی، خوش نما لباسوں میں ملبوس۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں میں ٹرے تھے جس

تین رکھے ہوئے تھے۔

”اوہ“ آپ کہاں جا رہے ہیں جناب“ ان میں سے ایک نے دلکش لہجے میں پوچھا۔

”میں مسٹر جینگو کا مہمان ہوں۔“

”ہمیں معلوم ہے“ آئیے اندر چلیں۔“

”چلے“ میں نے واپسی کے لیے رخ بدل لیا۔

”ویسے کسی کام سے تو نہیں جا رہے تھے آپ؟“

”کوہ نہیں“ مسٹر جینگو کہہ گئے تھے کہ مجھے ان کے ساتھ جانا ہے۔ اس لیے میں انتظار کروں۔ اس

کا تھا اس لیے سوچا عمارت کی سیر ہی کروں۔“

”چلے اب تمنا نہ رہیں گے“ دوسری نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں میرے ساتھ اندر داخل ہو گئیں۔

ایک میز پر ٹرے رکھ دی گئی۔ کافی کی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چند برتنوں میں خشک میوے

گیا۔ ایک نرس ہاتھ کی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور اسے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ یہ میرا ڈالسنگ ہی تھی جو نرس کے لباس میں تھی۔ میرا میرے نزدیک آئی اور اس نے عجیب سے انداز میں مجھے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ میں چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میرا نے دروازہ بند کر دیا اور میرے نزدیک آگئی۔

”ہیلو نواز“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”خوب۔ تم مجھے پہچان گئیں میرا۔“

”ہاں۔ اس لیے کہ اب تمہارے چہرے پر نہ تو وہ داڑھی ہے اور نہ ہی وہ دگ۔“

”لوہو“ میں نے جلدی سے اپنے چہرے کو ٹٹولا۔ واقعی داڑھی غائب تھی۔ پھر میں نے لباس پر غور کیا تو لباس بھی وہ نہیں تھا جو میں نے پہنا ہوا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم نے مجھے اس انداز میں بھی دیکھا تھا میرا؟“

”ہاں دیکھا تھا لیکن تم ان تک آئے ہی کیوں تھے؟“

”بات یہ ہے میرا ڈالسنگ۔ اب میری زندگی کا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ جینکو نے مجھے جس بار پر آمادہ کیا ہی اب میں اسے ادھر اور انہیں چھوڑ سکتا۔“

”لیکن تم پریشانوں میں گھر جاؤ گے۔“

”اب جو کچھ بھی ہوگا میرا دیکھا جائے گا۔ ہر صورت میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے بھرپور مدد کی۔ لیکن ان لوگوں کو تمہاری ذات پر شک تو نہیں ہوا؟“

”شک؟“ میرا کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

”کیوں خیریت؟“

”نہیں کوئی بات نہیں ہے“ اس نے گردن جھٹک کر کہا لیکن میں بغور اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

”میرا پلیز، تم اتنی اچھی انسان ہو کہ تمہیں کسی مشکل میں دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوگا۔ برا مجھے بتاؤ کیا تم کسی الجھن کا شکار ہو گئی ہو؟“ میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

”نہیں نواز۔ یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے، لیکن مجھے کچھ شبہ سا ہو رہا ہے۔“

”کیسا شبہ؟“

”یہی کہ وہ لوگ میری طرف سے اب اتنے مطمئن نہیں ہیں جتنے پہلے تھے۔“

”کیوں؟“

”شاید تمہارا ہی سلسلہ ہو۔“

”تو اس وقت میں تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا میرا۔“

”مجھے اس کے لیے خاص طور سے کہا گیا ہے“ میرا نے سنجیدگی سے کہا اور چھوٹے چھوٹے

”لوکے“ میرا نے رسالہ ایک طرف بچ دیا اور پھر میں نے اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر اپنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نے کہا ”کوشش کرو“ اب اسے ہوش میں آ جانا چاہیے۔“

”میں بھی سوچ رہا ہوں“ دوسری آواز ابھری اور پھر قدموں کی چاپ میرے بستر تک پہنچ گئی۔

”ایک نے مجھے جھنجھوڑا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن میرے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہ تھا۔ تھوڑی دیر تک میرا انداز کھویا کھویا رہا اور پھر جیسے میری سوچ واپس آگئی۔

میں چونک پڑا۔ اور پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے اوپر جھکے ہوئے آدمی نے میرے

”لپٹے رہو“ لپٹے رہو۔ سر چکرائے گا“ اس نے ہمدردی کے انداز میں کہا۔ سینے پر دباؤ بھی غیر

میں تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔

”کیسی حالت ہے؟“

”ٹھیک ہوں لیکن میں کہاں ہوں؟“

”امن و سکون کی جگہ۔ جہاں اگر تم چاہو تو تمہارے لیے جنت تعمیر ہو سکتی ہے۔ لیکن شرط یہی ہے

”لیکن میں کوئی جنت نہیں چاہتا۔“

”یہ مایوسی کے الفاظ ہیں۔ جنت کو تم نے اپنی دسترس سے اتنا دور سمجھ لیا ہے کہ اب تم اس کی

”یہ کھو بیٹھے ہو۔“

”ہوں۔ تو تم جنت کے سوداگر ہو۔“

”ہاں۔ ان مایوس لوگوں کو ہم راستے پر واپس لے آتے ہیں جو راستہ گم کر چکے ہیں۔ قصور کسی کا

”انسان ہمیشہ سیدھے راستے تلاش کرتا رہا ہے۔“

”لوہ۔ تم سیدھے راستوں کے راہی ہو۔“

”ہاں میرے دوست، جنت صرف ایک سبیل ہے۔ ایک اشارہ لیکن اس اشارے کو استعمال کرنے

”خیر“ میرا ذہن دکھ رہا ہے۔ پھر کسی وقت اس بارے میں گفتگو کروں گا۔ اس وقت میں سکون چاہتا

”ضرور“ ہمیں صرف تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“

”لوکے۔ آرام کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک درخواست ہے۔“

”کیا تم منشیات کے اسمگلر نہیں رہے ہو؟“

”رہا ہوں“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تم نے اپنی زندگی میں بے شمار لوگوں کو قتل نہیں کیا ہے؟“

”کیا ہے۔“

”ہو ریٹو جیسا خطرناک انسان تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ میرے علم میں ہے۔ تم نے میرے ضمیر

یعنی دیکھی۔“

”واقعی تمہاری معلومات حیرت انگیز ہیں۔“

”مجھ سے دنیا کی کون سی بات چھپی ہوئی ہے نواز اصغر۔ تمہارا ماضی میرے سامنے ہے۔ پھر اس کے

ٹیکوں کی تلاش میں کیوں نکل پڑے ہو؟“

”برائیوں سے دل آکٹا گیا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ دراصل تمہارے اندر جو جڑ ہے اس نے تمہیں بھٹکایا ہے۔ اگر برائیاں انسانی

کا سہارا نہ بنیں تو نیکوں کے تمام راستے گہرے گڑھوں تک لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں برائیوں میں

لجی تو تم کہاں جاتے؟“

”لیکن ان برائیوں نے مجھے سکون نہیں دیا۔“

”نہیں۔ تم نے سکون تلاش نہیں کیا۔“

”میں سکون کی تلاش میں ہوں۔“

”میں تمہیں سکون دوں گا۔“

”تم تو خود بے سکون ہو جینگو۔ تمہاری ساری نسل مضطرب ہے۔ وہ نشہ آور ادویات میں سکون

ہیں اور جب نشہ اترتا ہے تو اتنی اداس نظر آتی ہے کہ دل ڈوب جاتے ہیں“ میں نے جواب دیا اور

چونک پڑا۔

”نواز“ اس نے عجیب سے لہجے میں پکارا۔

”ہوں۔“

”تم میرے غلام ہو، صرف وہ کہو جو میں کہوں۔“

”میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں جینگو۔ تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں تمہارے ٹرانس میں آ گیا ہوں، ابھی

حق کرو پٹائزم کی۔ تم ایک اچھے پٹائٹ نہیں ہو“ میں نے کہا اور جینگو کو جیسے سکتے ہو گیا۔ کلنی دیر تک

موش رہا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تمہاری انہی صلاحیتوں نے تو مجھے تم پر عاشق کر دیا ہے۔ اب بتاؤ میں تمہیں کیسے چھوڑ دوں لیکن

میں نیکوں کے پیچھے کیوں دوڑ رہا ہوں۔ سب فضول باتیں ہیں۔ تم نے سونپا کو بھی ٹھکرا دیا اور اسے

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تم جن حالات کا شکار ہو گئے ہو، اس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے“ اس نے کہا

اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”وہ مجھے قتل کر دیں گے؟“

”دریغ بھی نہ کریں گے“ میرا نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں۔ میری ان کے مسلک سے دشمنی ہے۔ کیا صرف اس بات پر؟“

”نہیں۔ تم نے ان کے دو آدمیوں کو بھی تو ہلاک کیا ہے اور تم کیا سمجھتے ہو۔ کیا جینگو اتنا ہی فراخ

دل ہے کہ اپنی ٹوٹ پھوٹ کو بھول جائے گا۔ اگر اسے تم سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی تو شاید تمہیں اسی رات قتل

کر دیا جاتا۔“

”اس کا مطلب ہے اسے مجھ سے کوئی دلچسپی ہے۔“

”ہاں تمہیں زندہ رکھنے کا تو یہی مقصد معلوم ہوتا ہے۔“

”تب پھر مجھے قتل کا اندیشہ نہیں ہے۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“

”چنانچہ میری بات تو گئی میرا۔ لیکن اب مجھے تمہارا خطرہ ہے۔ براہ کرم خود کو محفوظ رکھنا۔ میں

یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا“ میں نے کہا اور وہ گردن ہلانے لگی۔

”تم میری طرف سے فکر مند نہ ہونا۔ اگر کسی طرح موقع مل جائے تو یہاں سے نکلنے کی کوشش

کرنا۔“

”اوکے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا میرا۔ تم نے ایسے حالات میں میری مدد کی ہے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو نواز۔ میری دعا ہے کہ تم اپنے مسلک میں کامیاب رہو۔ میں تمہاری جراثیم کی

قدردان ہوں۔“

”شکریہ۔ زندگی میں اگر کبھی.....“ میں نے کہا لیکن اسی وقت باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور

میرا نے مجھے آنکھیں بند کر لینے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے جھپٹا مار کر ایک رسالہ اٹھایا اور ایک کرسی پر بیٹھ

گئی۔

”اسی وقت دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہو گئے۔“

”ہوش آیا؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”ابھی تک نہیں۔“

”پوزیشن کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے اثر زائل ہو چکا ہے۔ اب صرف نیند ہے۔ تھوڑی دیر میں ہوش آ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ ہم یہاں موجود ہیں۔“

چکر دے کر نکل بھاگے۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ؟

”پوچھو۔ وہ بھی پوچھو۔“

”سوختا کے پاس سے آتے ہوئے تم اس کے ہاں سے کچھ اٹھالائے تھے؟“

”کیا مطلب؟“

”اس کے بعد تمہارے پاس یہ لباس اور میک اپ کا سامان کہاں سے آگیا؟“ اور اس بار میرے

ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم روشن ضمیر ہو، معلوم کر لو۔“

”مشکل کام نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، معلوم کر لو تو مجھے بھی بتا دینا۔“

”ضرور بتاؤں گا، لیکن اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”کس سلسلہ میں؟“

”خود میں کوئی لچک پیدا کرو گے؟“

”ارے نہیں جینگو، ابھی تو میں نے زندگی کی ابتداء کی ہے۔ ابھی تو بہت سے مراحل طے کرنے

ہیں۔“

”میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع مت کرو۔ ترلوکا کے مشن کے لیے کام کرو نہ

جانے کیا سے کیا بن جاؤ گے۔“

”میرا مشن کچھ اور ہے جینگو۔“

”وہ کیا؟“

”میں نے ہوریشو کو فٹا کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ میں اس میں کامیاب ہو گیا۔ تم نے میرے مقدس

مذہب کی توہین کی ہے۔ خدا کی قسم..... اب میں مذہب کے نام پر ترلوکا کو فٹا کر دوں گا۔ اسے روئے زمین

سے نیست و نابود کر دوں گا۔ یہ نیکی کر گزرنے سے شاید میری تھکی ہوئی برائیوں کے بوجھ سے مضحل روح کو

کچھ سکون آجائے۔“

جینگو کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کا بدن کانپ اٹھا اور اس کی آنکھوں سے خون اگلنے لگا۔

”تیرا علاج اب صرف ترلوکا کے پاس ہے“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس نے کسی کو

آواز دی۔

☆ ☆ ☆

ایک بار پھر مجھے قید کر دیا گیا۔ لیکن اب مجھے وہ مراعات حاصل نہیں تھیں جو اس سے پہلے تھیں۔

غالبا جینگو میری طرف سے اب قطعاً مایوس ہو گیا تھا۔ ترلوکا کی توہین کر کے میں نے اسے اپنا بدترین دشمن

معتدل حرکتیں کرنے لگیں۔

”یہ تمہاری آخری کوشش ہے جینگو“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”اس کے بعد کیا کرو گے؟“

”لو۔ کیا یہ لڑکیاں پسند نہیں، دوسری آسکتی ہیں۔“

”نہیں واپس بھیج دو۔“

”جاؤ“ جینگو نے کہا اور لڑکیاں اسی انداز میں مسکراتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

”کیا یہ سب کچھ مناسب ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

”براہ کرم کھل کر گفتگو کرو۔“

”تم بہر حال ایک پروقار انسان ہو۔ کیا تمہاری شخصیت اس قدر گراؤٹ قبول کرتی ہے؟“

”کیسی گراؤٹ؟“

”لڑکیاں سپلائی کرنے والے کو کیا کہتے ہیں؟ تمہیں اپنی شخصیت کو مدنگاہ رکھ کر ایسے اوجھے

بے نہیں استعمال کرنے چاہئیں۔“

”اس میں سے کچھ لو، تم بھوکے ہو“ جینگو نے پرسکون لہجے میں کہا اور میں نے ایک سیب اٹھالیا۔

”واؤں؟“

”سہیں شکریہ۔“

”عورت مرد کی ایک ضرورت ہے اور عورت بھی اتنی ہی ضرورت مند۔ اس میں اوجھے ہتھکنڈوں

کی بات ہے؟“

”لیکن میں تمہارے مسلک کا قائل نہیں ہوا ہوں۔“

”ہو جاؤ گے، ہو جاؤ گے“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”لو اور لو۔“

”بس۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا نواز، تم دنیا کی نعمتوں سے کیوں بھاگتے ہو؟ اس کے لیے تو تمہارے مذہب نے

مج نہیں کیا۔“

”ہاں لیکن مذہب کے کچھ اصول بھی تو ہوتے ہیں۔“

”تو تم اصولوں کے جل سے نہیں نکلو گے۔“

”اس لیے کہ میں انہیں جان نہیں سمجھتا۔ انسانی معاشرہ کے نظم و ضبط کے لیے یہ ضروری ہیں۔“

”فضول چیزوں کے پیچھے زندگی کیوں کھو رہے ہو نواز۔ کیا صرف ضد برائے ضد۔ حالانکہ تم کبھی

انسان نہیں رہے۔“

”میں نے ہمیشہ مذہب کی عزت کی ہے۔“

”جھوٹ بول رہے ہو نواز اصغر۔ دنیا کی کون سی برائی تم نے نہیں اپنائی۔ تم جینگو کو کیا سمجھتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”تمہارے خیال میں تم جینگو کی نگاہ سے پوشیدہ رہ سکتے تھے، تم کہیں بھی جا چھپتے نواز، جس وقت

میں اپنے ذہن کے راستے کھولتا، تمہیں تلاش کر لیتا۔ میری نگاہوں کے سامنے ہر گوشہ برہنہ ہے۔ نہ جاس

تم مجھے کیوں نہیں پہچانتے۔“

”اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔“

”کیوں۔ اس میں کیا جھوٹ ہے؟“

”تم صرف گٹار سے مجھے پہچانتے تھے۔ کیونکہ ایک بار تم پہلے بھی میرا گٹار سن چکے تھے۔“

”چلو یہی سہی۔ لیکن میں نے اس کے لیے تمہاری تک و دو نہیں کی کہ میں تمہیں اس قدر اہم

نہیں سمجھتا تھا۔“

”ہاں۔ میں بھی خود کو اس قدر اہم نہیں سمجھتا۔“

”لیکن یہ میری بھول تھی۔“

”کیا مطلب؟“

”تم تو بے شمار خوبیوں کے مالک نکلے۔ خاص طور سے گٹار کے سلسلہ میں۔ یقین کرو تمہاری

انگلیوں میں جادو ہے۔ اس کے علاوہ بھی تم ہمارے لیے اس قدر کار آمد انسان ہو کہ ہم تمہیں پھونڈے تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں جینگو؟“

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔“

”لیکن میں تو تمہارے مسلک کا مخالف ہوں۔“

”وقتی طور پر۔۔۔۔۔ تم ہمارے مسلک سے متاثر ہو جاؤ گے۔ میں تم سے تمہارے ماضی کی بات

کروں گا نواز اصغر۔“

”اچانک اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی

چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میرا ذہن سونے لگا۔ لیکن اچانک ہی میرے اندر وہ قوت بیدار ہو گئی جو میری فطرت کا خاصہ تھی۔ کسی سے متاثر نہ ہونے والی قوت۔ اور میرا ذہن اس کے سحر سے آزاد ہو گیا۔

”اب تم سے گفتگو ہوگی نواز۔“

”میں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا اور خاموش بیٹھا رہا۔“

”تمہارا ماضی تمہاری برائیوں کی کہانی سناتا ہے۔ وہ برائیاں جو تمہارے معاشرے میں برائی سمجھی

”نواز پلیز، میں جو کچھ کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو، میرے لئے کیا مناسب ہے اور کیا غیر

”تم اس بارے میں الجھن میں نہ پڑو۔ اس بارے میں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ میرا حسب

حل خشک انداز میں بولی اور میں عجیب و غریب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کہو۔“ میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

”ابھی تھوڑی دیر کے بعد تمہیں ایک جگہ بلایا جائے گا۔ ممکن ہے میں وہاں موجود ہوں اور یہ بھی

ہے کہ میں وہاں موجود نہ ہوں۔ تمہیں ایک انجکشن لگایا جائے گا جو بے ہوشی کا انجکشن ہو گا۔ اس کے

تمہیں کہیں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ لوگ تمہیں کہاں لے جائیں گے، لیکن

سورت کسی لمبے سفر کا پروگرام معلوم ہوتا ہے۔ تم ان کے چنگل سے نکلنے کی آخری کوشش کر سکتے ہو۔“

”کس طرح؟“ میں نے سوال کیا۔

”جو انجکشن تمہیں دیا جائے گا وہ بے ہوشی کا ہو گا، لیکن اگر میں نے تمہیں وہ انجکشن نہ بھی دیا

ہی ڈاکٹریا کسی دوسرے آدمی کو وہ انجکشن میں ہی فراہم کروں گی۔ لیکن جو انجکشن تمہارے بدن میں

گا وہ بے ہوشی کا انجکشن نہیں ہو گا بلکہ وہ سادہ پانی ہو گا۔ تم بے ہوش ہونے کی اداکاری کرو گے اور پھر

وہ تمہیں لے کر جائیں اور جس جگہ بھی پہنچیں تو تم موقع پا کر پہلی فرصت میں ان کے چنگل سے بھاگ

خواہ کچھ بھی ہو جائے۔“

”خوب لیکن میں تنہا ہوں۔“

”ہاں میں اسی کا بندوبست کر کے آئی ہوں۔“ میرا نے کہا اور اپنے لباس میں سے اس نے ایک

کسا آٹوینک پستول نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ پھر وہ عجیب سے لمبے میں بولی۔

”اس میں آٹھ گولیاں ہیں نواز۔ اور بس اس سے زیادہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔“

”اوہ میرا۔۔۔۔۔ میرا۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ لیکن افسوس میں

میں تمہیں کچھ نہ دے سکوں گا۔“

”خدا حافظ۔“ میرا نے کہا اور مسکرائے بغیر باہر نکل گئی۔ اس کے چہرے پر یا آنکھوں میں نرمی کا

تاثر نہیں تھا۔

اس لڑکی کے کردار سے میں بے پناہ متاثر تھا، لیکن بہر حال کیا کرتا ہوں زندگی میں اگر کوئی موقع فراہم

میں دل و جان سے اس کی مدد کروں گا۔ میں نے سوچا تھا۔ بہر حال میرا باہر نکل گئی تھی۔ تب میں نے

کے دیئے ہوئے آٹوینک پستول کو بڑی احتیاط سے لباس میں چھپالیا۔

اور پھر میں بیٹھ گیا۔ اب میرا ذہن انہی معلومات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس وقت دن کے

”ڈھائی بجے تھے جب چند افراد مجھے لینے آئے۔ اس وقت تک دوپہر کا کھانا بھی نہ ملا تھا یعنی رات ہی کو

کھانا پیا تھا وہی چل رہا تھا اور مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ بہر صورت بھوک پیاس کا ذکر تو حماقت

ہی ہے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔
آنے والے مجھے لئے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے، جہاں چار آدمی موجود تھے لیکن ان کے درمیان میرا ڈالسنگ کو دیکھ میں نے سکون کی سانس لی۔
”مسٹر نواز ہم نہیں کہہ سکتے کہ آپ یہاں کب تک قید رہیں گے، بہر حال آپ کا طبی معائنہ کرنے کے لئے آپ کو طلب کیا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، ویسے میں بالکل تندرست ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
”یقیناً“ ہوں گے۔ لیکن ممکن ہے آپ کو کوئی تکلیف ہو گئی ہو، ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ آپ کو چاق و چوبند رکھیں۔“

”مناسب ہے، جیسا آپ حکم دیں۔“
”براہ کرم آپ اس میز پر آجائیے۔“ اس شخص نے کہا، جو شاید ڈاکٹر تھا کیونکہ دوسرے لمبے وہ اسٹیمو سکوپ لے کر میرے حلق، چہرے اور سینے کا معائنہ کرنے لگا۔ انہوں نے میری آنکھیں بھی کھول کر دیکھیں۔ بظاہر وہ یہی تاثر دے رہے تھے کہ جیسے وہ ڈاکٹری معائنہ کر رہے ہوں۔
”مسٹر نواز آپ طبی لحاظ سے درست ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ ٹینوریا کا ایک انجکشن لے لیں، وہ آپ کو جملہ بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔“

”مناسب“ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کی بجائے اگر مجھے خوراک میا کی جاتی رہے تو زیادہ بہتر ہے، میں نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔“
”اوہ یقیناً“ یہ کسی کی غفلت کا نتیجہ ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے مسٹر جینگو کی یہی ہدایات ہوں۔
”بہر صورت آپ کو کھانا فراہم کر دیا جائے گا کیونکہ یہ انسانی فرض بھی ہے۔“
”ہاں مناسب ہے کہ آپ اس انسانی فرض کو پورا کر دیں ورنہ میں دوبارہ اس کا تذکرہ بھی نہیں کروں گا۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”براہ کرم چند ساعت انتظار کریں۔“ اس شخص نے کہا پھر میرا ڈالسنگ کو دیکھ کر بولا۔
”مس میرا انجکشن لگا دیجئے۔“

”بہت بہتر۔“ میرا نے کہا اور پھر اس نے ان لوگوں کے سامنے ہی ایک انجکشن کی سیل توڑ دی اور سرنج میں بھر کر میری جانب بڑھی۔ اس نے اپنے مخصوص سر دلچے میں مجھ سے بازو آگے بڑھانے کے لیے کہا اور میں نے بازو آگے بڑھا دیا۔ میرا ڈالسنگ نے مجھے انجکشن دے دیا تھا اور پھر وہ سرنج لئے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ انجکشن کی شیشی بھی اس نے ساتھ ہی رکھی تھی گویا وہ اپنے خلاف کوئی ثبوت چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے اس بے چاری نے میرے لیے یہ دوسرا بڑا رسک لیا تھا۔ یوں بھی وہ مشتبہ باتیں کر سکتا تھا تو اس کی شخصیت فوری طور پر مشکوک سمجھی جاسکتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ تزلو کا اس سے بھی بڑا آرٹسٹ ہو گا۔ اس نے جینگو جیسے آدمی کو ذہنی طور پر اس قدر تروا ہے کہ وہ اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس بات کی پرواہ بھی نہیں تھی۔
جس جگہ مجھے قید کیا گیا تھا وہ شاید اسٹور تھا۔ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ چاروں طرف سے اٹا ہوا فرش، غالباً یہ انتقام کی ایک شکل تھی، ورنہ اگر وہ مجھے بہتر طور سے بھی رکھتے تو کوئی دقت نہ تھی۔

اس دوران میری ملاقات میرا ڈالسنگ سے بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس پورے کارخانے میں وہی میری ہمدردی تھی۔ لیکن مجھے خدشہ تھا کہ وہ کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے۔ جینگو نے کہا تھا کہ میں معلوم کرے گا کہ سونیتا کے پاس سے فرار کے بعد یہ آسانیاں مجھے کہاں سے حاصل ہوئیں جبکہ میں ان کے راستے کاراہی نہیں تھا۔ اگر کسی طرح اس کی نگاہ بے چاری میرا پر جا پڑی تو وہ غریب مفت میں لے گی۔

میرے ذہن میں میرا کی صورت ابھر آئی۔ حسین لیکن انتہائی سنجیدہ چہرہ۔ اس عمر کی کسی لڑکی کو اس قدر سنجیدہ نہ دیکھا تھا۔ اپنے بارے میں اس نے مجھے کچھ نہ بتایا تھا۔ حالانکہ میں نے اس سے کئی کے دیگر معاملات کے بارے میں پوچھا تھا سوائے ان تین لاپنج انسانوں کے جنکی وہ کفیل تھی۔ لیکن بارے میں بھی مجھے کیا معلوم تھا۔

ان کے علاوہ اس نے مجھے کسی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ لیکن بہر صورت ان ساری باتوں کے سنے کیوں میں نے اس کے چہرے پر یا اس کے انداز پر ایک بار بھی کوئی ایسی چمک نہیں دیکھی تھی جتنی ہمارا ہو تاکہ وہ کوئی نوجوان لڑکی ہے اور جوانی کی ضرورتوں سے متاثر ہے۔

حالانکہ اگر وہ لوگ چاہتے تو میرا کو بھی مجھے بگاڑنے پر متعین کر سکتے تھے۔ لیکن ممکن ہے وہ اس لڑکی ہی نہ ہو۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں کئی بار اس کا خیال آیا۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا تو اس شخص وجہ نہیں پائی سوائے اس کے کہ اس لڑکی کے کردار نے مجھے متاثر کیا تھا اور پھر یہ کہ وہ میری باتوں سے اس نے ایسے وقت مجھے سارا دیا تھا جب میں اچھائیوں کے راستے سے بھٹک بھی سکتا تھا اور یہ معمولی سی بات تھی۔ لیکن بہر صورت میرے نزدیک کسی کے احسان کا احساس بھی بڑی چیز ہے۔ سو لڑکی میری وجہ سے کسی مصیبت کا شکار ہو جاتی تو میرے لئے واقعی یہ بات باعث شرم ہوتی۔ لیکن میں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ یہاں آ کر کچھ اس طرح پھنس گیا تھا کہ اب بظاہر ان معاملات سے نمٹنے اور ذہن میں نہیں آتی تھی۔

جینگو سے میری جو گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد میرے خیال کے مطابق جینگو کو پوری طرح میری بات آ رہا ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ میں نے اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور نہ ہی میری بات اتنی چمک تھی کہ وہ اس سے کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

کوئی زمین کے بارے میں اندازہ لگالیا۔

یقیناً "میں سمندری سفر کر رہا تھا۔ پھر چوٹ کے بارے میں اندازہ لگایا۔ سر کی خاصی ٹھکانی ہو گئی۔ ان میں ان کے ہاتھ لگ گیا یہ برا ہوا تھا۔ دیر تک میں خاموش پڑا حالات پر غور کرتا رہا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی اور پھر کمرے کے بلنے کی رفتار ست ہو گئی۔ سر چکرانا شروع ہو گیا تھا۔ کیا اور اس کے تھوڑی دیر کے بعد اس کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں نے بے ہوش رہنا ضروری سمجھا تھا اب جو ہوتا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ کیوں اداکاری کی جائے۔ چنانچہ میں نے آنے والوں کو آدمی تھے۔

"اٹھاؤ۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ اور جس بیڈ پر میں لیٹا تھا۔ اسے اسٹریچر کی طرح اٹھالیا گیا۔ جسم کا بیڈ تھا۔ باہر آکر صورت حال کا اندازہ ہوا۔ میں کسی لانچ پر تھا اور اب یہ لانچ ایک جہاز کے ساتھ تھی جو کھلے سمندر میں تھا۔ بے شمار افراد لانچ سے جہاز پر منتقل ہو رہے تھے۔ میرا اسٹریچر بھی ایک چھوٹی کرین کے ذریعہ لانچ سے جہاز پر پہنچ گیا اور وہاں چند لوگوں نے اسے اٹھا لیا۔ میں پینچا دیا۔ باہر نجانے کیا کیا ہوتا رہا۔ پھر جہاز متحرک ہو گیا اور میں نے ایک نامعلوم منزل چل پڑا۔

ابا "تو لو کا کی طرف۔"

کئی گھنٹے اس کیمین میں گزر گئے لیکن کوئی میری طرف نہیں آیا تھا۔ اور پھر جب میں خود عاجز آ گیا تو کھینچنے کی کوشش کی۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ سر میں تکلیف ضرور تھی لیکن ناقابلِ تلافی نہیں۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر نکل آیا۔ کیمین کے باہر رہا دیر تھی جس میں اور بھی دروازہ ہے تھے۔ نہ جانے کس خیال کے تحت میں نے ایک کیمین کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والی ایک سیاہ نسل کی عورت تھی۔ لیکن اسکے نقوش بے حد دلکش تھے اور وہ بھرپور۔ اگر سیاہ رنگ کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسے ایک خوبصورت عورت کہا جاسکتا تھا۔

"ہیلو!"

"میں تمہارے سامنے والے کیمین کا مسافر ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، آؤ اندر آ جاؤ۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"میرے سر میں زخم ہے، اور میں بھوکا بھی ہوں۔"

"ہیٹھو" میں تمہارے لئے بندوبست کرتی ہوں۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا اور میں بیٹھ گیا۔ وہ لگا ہوا ایک ٹین دبا رہی تھی اور پھر ایک شخص اندر داخل ہو گیا۔ "کافی اور کھانے کے لئے کچھ لے عورت نے کہا اور وہ شخص سر جھکا کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مطلوبہ اشیاء آگئیں اور میں ناماند ٹوٹ پڑا۔ میں نے اس شریف عورت کو بھی نہیں پوچھا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ جس وقت میں نے اس کے پینٹسٹ ہونے کا اظہار کیا تھا تو وہ دنگ رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے اس فن پر بڑا فخر ہو گا لیکن میں نے اس کے اس فن کو بھی ناکام کر دیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ جینگو کے دل میں میرے لئے ہمدردی پیدا نہیں ہو سکتی، رہی میری گٹار نوازی، تو وہ اس کے لیے اتنی اہم نہ ہو گی کہ وہ ذرا سی بات کے لئے اتنی بڑی مصیبت مول لے، پھر وہ میرا کیا کرے گا۔ یہ سوال ہنوز تشنہ تھا کیا مجھے قتل کر دیا جائے گا؟ میں نے سوچا۔ یوں بھی جینگو نے کہا تھا کہ اگر میں کچھ خوبیوں کا مالک ہوتا تو انتقام کے طور پر مجھے قتل بھی کیا جاسکتا تھا لیکن اب کیا کیا جائے گا؟ اور اس کا کیا ہو گا؟ کوئی جواب الحاح میرے پاس موجود نہیں تھا۔

اور جس بات کا کوئی جواب ذہن میں نہ ہو تو اس کے بارے میں دماغ سوزی کرنا سوائے حماقت اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی خود کو خلی الذہن کر لیا، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

لیکن کم بختوں نے سلوک بہت برا کیا تھا یہاں لا کر نہ کھانے کو پوچھتے تھے نہ پینے کو، اس وقت میں شدید بھوک کا شکار تھا اور پیاس کی وجہ سے میرے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔

کیا وہ مجھے بھوکا پیاسا مار ڈالیں گے؟ میں نے سوچا اور میری ضدی فطرت عود کر آئی۔ نہیں ایسے جان نہیں دوں گا۔ آخر کمرے میں ہی تو قید ہوں اور دروازہ فولاد کا بنا ہوا نہیں ہے۔ اگر حالات حد سے

بگڑے ہوئے نظر آئے تو پھر ہاتھ پاؤں ہلانے ہی پڑیں گے۔ حالانکہ میں چاہتا تھا کہ انہیں انکی کوششوں نہ روکوں اور دیکھوں کہ وہ مجھے کس حد تک مجبور کر سکتے ہیں۔ لیکن حرام موت مرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

کچھ کر کے مرا جائے تو بہتر ہے۔ اور اس کے لئے میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب تک وہ لوگ خود کوئی کارروائی نہ کریں گے اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھاؤں گا لیکن اس کی نوہم نہیں آئی۔

رات کو باقاعدہ کھانا بھجوا دیا گیا تھا جو زیادہ بہتر تو نہیں تھا، لیکن ہر صورت غنیمت تھا۔ البتہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ کہیں کھانے میں کوئی ایسی چیز شامل نہ کر دی گئی ہو جسے کھا کے میں پھر بے ہوش ہو جاؤں اور یہ بیہوشی کسی مصیبت کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

لیکن مجبور تھا کیا کر سکتا تھا۔ کھانا تو رات کو کھانا ہی پڑا اور جب صبح کو آنکھ کھلی تو بڑی خوشی ہو تھی گویا کھانے میں مجھے کوئی ایسی چیز دینے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ہاں دوسرے دن دس بجے وہ کمرہ شروع ہو گیا جو میرے ذہن میں سرا بھار رہا تھا۔

آنے والی میرا ڈالسنگ ہی تھی اسے دیکھ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا ڈالسنگ بدستور

سجیدہ تھی۔

میں چھپ کر تمہارے پاس آئی ہوں۔" اس نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"اوہ میرا یہ تمہارے لئے مناسب نہیں تھا۔"

پھر جب میں خوب کھا چکا تب پیچھے ہٹا اور کرسی سے نکل کر گہری گہری سانس لینے لگا۔
”سر کی چوٹ کا کیا حال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”زیادہ بہتر نہیں ہے۔“

”پٹی بدل دوں؟“

”ضروری ہے؟“

”ہاں، مناسب ہوگا۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ ایک فرسٹ ایڈ بکس اٹھالائی۔ یہ انداز لگانے میں مجھے وقت نہیں ہوئی تھی کہ سیاہ فام عورت میرے بارے میں ساری تفصیل جانتی ہے۔ یقینی طور پر وہ جینگو کی ساتھی ہوگی۔ لیکن ایک بات تعجب خیز تھی۔ اس جہاز سے ان لوگوں کا کیا تعلق تھا۔ کیا ترلوکا کے ہاتھ مجرمانہ کارروائیوں کے لئے بھی پھیلے ہوئے تھے کسی مشن کو چلانا دوسری بات ہے لیکن اتنے وسیع اختیارات۔ کیا اس مشن کے پیچھے کوئی اور سازش بھی ہے۔ کیا پورا جہاز ترلوکا کے قبضے میں ہے۔

بہر حال ذہن زیادہ سوچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ عورت میرے سر کی پٹی کھولنے لگی۔ اور پھر اس نے نہایت مہارت سے میرے سر کی دوبارہ بند تاج کر دی۔

”اگر ذہن منتشر ہو تو انجکشن دے دوں؟“

”بے ہوش کرنا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہے، اور پھر انجکشن سے بے ہوش کرنے کا تجربہ تو ہمارا ہو چکا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”تمہاری معلومات لامحدود ہیں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں خود بھی لامحدود ہوں۔“

”ہاں اندازہ ہوتا ہے۔“

”بولو انجکشن لوگے، تمہاری طبیعت درست ہو جائے گی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا اور اس نے ایک انجکشن نکال لیا اور پھر اسے میرے بازو میں انجکٹ کر دیا۔

”چند ساعت کے لئے آنکھیں بند کر کے ذہن کو خالی کر لو، بیدار سکون محسوس کرو گے۔“ اس نے کہا اور میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا اور حقیقت انجکشن کا اثر لا جواب تھا۔ پورے بدن میں توانائی دوڑنے لگی تھی اور بڑا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تکلیف ہی نہ ہو، میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

”تمہارا شکر یہ خاتون۔“

میں نے چند ساعت تو آنکھیں کھولی رکھیں اور پھر اس قسم کا اظہار کرنا شروع کیا جیسے میری پلکیں ہلکی جا رہی ہوں۔ وہ لوگ بغور میرا جائزہ لے رہے تھے اور پھر چند ساعت کے بعد میں نے اپنی گردن دوسری طرف گرا دی۔ سانسوں کو میں نے اس طرح بے ترتیب کر لیا تھا جیسے وہ بے ہوشی کے دوران ہو جاتی ہیں گویا میں مکمل اداکاری کر رہا تھا۔

تب وہ لوگ میرے نزدیک آ گئے۔ ”مسٹر نواز۔“ ان میں سے ایک نے مجھے جھنجھوڑا۔

”مسٹر نواز۔۔۔۔۔“ دوسرے نے آواز دی۔ اور پھر تیسرے نے ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ کافی زوردار تھپڑ تھا۔ لیکن برداشت تو کرنا ہی تھا۔ میں نے اس پر بھی کوئی اظہار نہ کیا تو ان میں سے ایک نے کہا۔

”ٹھیک ہے، کام ہو چکا ہے۔“

”پھر اب؟“ دوسرے نے سوال کیا۔

”بس تیاریاں کرو۔ اب زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے اسٹیمر پہنچ جائے گا اور ہمارا سفر بھی اچھا خلاصا ہے۔“

”لو کے سر۔“ کسی نے جواب دیا اور پھر شاید ان میں سے ایک یا دو باہر نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایک اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ میں بدستور دم سلوے ہوئے پڑا تھا اور کچھ لوگ اسٹریچر کے گرد چل پڑے۔ اسٹریچر کو کسی بندوین میں رکھا گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ارد گرد کون کون ہے۔ اس لئے آنکھوں میں ہلکی سی جھری بھی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ آنکھیں بند کئے کئے سخت کوفت ہو رہی تھی۔

لیکن بہر حال برداشت کرنا تھا۔ لہذا وین میں اور وہ بھی چلتی ہوئی وین میں کوئی حرکت کرنا حماقت تھی۔ اس کے رک جانے کا انتظار ضروری تھا۔ چنانچہ میں دم سلوے پڑا رہا اور پھر میں نے اس کی رفتار سست ہوئی محسوس کی۔

وین رک گئی اور میں نے گہری سانس لی، یہ آخری موقع تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کیا پوزیشن ہو۔ میں ترلوکا تک پہنچنے کا خواہش مند ضرور تھا۔ لیکن ان لوگوں کا قیدی بن کر نہیں، بلکہ آزاد انسان کی حیثیت سے بیبیوں کے کسی قافلے کے ساتھ یہاں تک با آسانی پہنچا جاسکتا تھا۔ اس طرح تو میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا، کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال وہ سب نیچے اترنے لگے اور اسی وقت موقع تھا۔ آستین میں چھپا ہوا پستول نیچے سرک آیا اور میرے ہاتھ کو چھونے لگا۔ اب میں کسی بھی لمحے اسے نکال سکتا تھا نیچے اترنے کے بعد انہوں نے اسٹریچر اٹھایا اور پھر اسے دو آدمیوں نے پکڑ لیا اور وہاں سے چل پڑے۔ باہر آنے کے بعد سمندر کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔

اور یہی کاروائی کا وقت تھا۔ چنانچہ میں نے بازو تھوڑا سا ہلایا اور پستول میری مٹھی میں آگیا اور پھر دوسرے لمحے میں نے نئی تلی چھلانگ لگا دی۔ اسٹریچر خالی ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ آوازیں ابھریں۔ میں نے ایک لمحے میں ماحول کا جائزہ لے لیا۔ تقریباً سات آدمی تھے۔ کچھ کرنا ضروری تھا۔ اس لئے میں نے یونی اندھا دھند ایک فلائز جھونک دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک چیخ ابھری اور وہ سب زمین پر گر پڑے۔

”وہ فلائز کر رہا ہے۔“ کسی نے چیخ کر کہا۔

”اوہ۔ مارنا نہیں ہے، پکڑو۔“ کسی دوسرے نے کہا۔ لیکن اٹھنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی اور میں ان سے کافی دور نکل آیا۔ لیکن دوسرے لمحے مجھے غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے غلط سمت اختیار کی تھی۔ اس وقت دین کی طرف جانا مناسب تھا۔ دین ہی فرار کے لئے عمدہ ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ مجھے قتل نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن بہر حال مجھے پکڑنے کے لئے دشمنی ضرور کر سکتے تھے، اس لئے اپنا بچاؤ بھی ضروری تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں ان کی توجہ دین کی حفاظت کی طرف مبذول نہ ہو جائے۔

بہر حال میں نے ایک ریت کے ٹیلے کی آڑ لے لی اور پھر وہاں سے دو اور فلائز کر دیئے۔ آٹھ گولیاں تھیں، ان کا استعمال بھی نہایت احتیاط سے کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دوسری طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہ لوگ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے اور اب وہ اپنی پوزیشن بدل رہے تھے۔

میں نے دین کے پار سے اندازہ لگایا، اور پھر ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے اندھا دھند تین فلائز کئے اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ایک لمبی دوڑ لگا کر بالا خر میں دین کے نزدیک پہنچ گیا۔

اور دوسرے لمحے میں دین کے اندر تھا، میں دعا مانگ رہا تھا کہ چالی دین کے آگنیشن میں موجود ہو اور نہ جانے یہ دعا کس دل سے نکلی تھی چالی آگنیشن میں لگی ہوئی نظر آرہی تھی۔

دوسرے لمحے میں نے دین اشارت کر لی۔ لیکن اسی وقت عقب سے میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک ضرب، دوسری ضرب اور پھر تیسری اس کے بعد نہ جانے انہوں نے کھوپڑی کا کیا حشر کیا، مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ یکے بعد دیگرے تین ضربوں نے کام تمام کر دیا تھا۔

اپور، بے تک موت نہ آئے، ہوش آنا یقینی ہے۔ بعض لوگ ایسے سخت جان ہوتے ہیں کہ موت کو بھی کافی مشکلات پیش آتی ہیں۔ گو میرا سر شدید تکلیف کا شکار تھا لیکن ہوش آگیا۔

بدن کے نیچے آرام وہ بستر تھا اور چھت پر روشن فانوس در و دیوار کسی ہسپتال کے ہی معلوم ہوتے تھے، سرخیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن یہ ہلتا ہوا ہسپتال۔ ہاں زمین ہل رہی تھی۔ ذہن کو کچھ اور یکجا کیا، اور آوازوں کا اندازہ کیا۔ پھر کچھ اور ذہن صاف ہوا تو گزرے ہوئے واقعات یاد آئے، اور میں نے

”نہیں کوئی بات نہیں ہے۔“

”میں اب جاؤں؟“

”تمہاری مرضی پر منحصر ہے، دل چاہے تو بیٹھو۔ تمہا کیبن میں جا کر کیا کرو گے؟“

”تمہیں ناگوار تو نہیں ہو گا۔“

”اوہ۔ ہرگز نہیں، میں بھی اپنے کیبن میں تنہا ہی ہوں۔“

”تعارف ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں، میرا نام لویا ہے۔ مشرقی مٹی سے تعلق رکھتی ہوں۔ اور تمہارے بارے میں سب کچھ ہوں۔ تمہارا نام نواز احمد ہے۔“

”اوہ۔ چلو اچھا ہوا۔ اس طرح بہت سی باتیں صاف ہو گئیں۔“

”مثلاً؟“

”یہی کہ میرا پورا تعارف تم سے ہو گیا۔“

”ہاں۔“

”تو لوکا سے تمہارا بھی تعلق ہے۔“

”ہاں۔“

”کیا تم اس کی تعلیمات سے متاثر ہو؟“

”میں اس کی بیروکار ہوں۔“

”لیکن تم تو بالکل ہوشمند، میرا مطلب ہے کہ تہذیب کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔“

”ہاں میرے اوپر بیرونی ذمہ داریاں ہیں۔“

”بیرونی ذمہ داریوں سے کیا مراد ہے۔“

”کسی بھی مشن کو چلانے کے لئے ہر قسم کے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو لوکا نے بیرونی امور

لئے بھی مجھے ہدایات دی ہیں اس لئے۔۔۔۔۔“

”اوہ۔ تو تو لوکا کا کوئی مشن ہے؟“

”ہاں۔ ایک عظیم مشن۔“

”کمال ہے، اس کے بارے میں ہمیشہ ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں، آج تک تمہیں اس مشن کے بارے میں کسی نے نہیں بتایا۔“

”اسے ایک باقاعدہ مشن تو نہیں کہا جاسکتا۔“

”حالانکہ یہ ایک باقاعدہ مشن ہے۔“

”مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟“

”ہاں۔ یہ ہمارا فرض ہے، ممکن ہے مشر جینکو نے فلسفے کی زبان استعمال کی ہو جو تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو۔“

”ہاں۔ ممکن ہے۔“ میں نے مہری سانس لے کر کہا۔ میں اس لڑکی سے معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

”میں اس موضوع پر زیادہ نہیں بول سکتی۔ چند موٹی موٹی باتیں تمہیں بتا دیتی ہوں۔ یہ مشن انسانیت کی بھلائی کے لئے ہے۔ انسان پتھروں کے دور میں تھا، معصوم تھا، تہذیب نے اسے زندگی گزارنے کے لئے بہتر سہولتیں مہیا کیں لیکن اس کی تخریب کاری بڑھ گئی۔ آج ساری دنیا جنم کے دہانے پر کھڑی ہے۔ انسان نے انسان کو فنا کرنے کے لئے کیا کیا اسباب پیدا کئے ہیں ہر ذی ہوش کو معلوم ہے۔ ہیروشیما پر ایک معمولی سا تجربہ ہوا تھا۔ تم بتاؤ اب وہ تجربہ پہلے سے لاکھ گنا زیادہ ترقی یافتہ ہو گیا ہے۔ ترقی کی دیوانگی نے انسانی زندگی کو کس قدر ارزاں کر دیا۔ کیا ہم اس تہذیب سے نفرت نہ کریں انسان تو ایک معصوم مخلوق ہے جسے تہذیب کے عذاب نے گھیر لیا ہے۔ پتھروں کے دور میں بھی اپنے جیسوں کے خون بہانے کے لئے ایسی کبھی کوئی چھوٹی موٹی بدلت ہوئی، چھوٹے پیمانے پر ختم ہو گئی۔ جس نے برائی کی بات اسی تک رہی لیکن جنگوں میں کیا صرف گناہ گار مارے جاتے ہیں۔ پھر ہم اس تہذیب کا کیا کریں جس نے ہم سے ہمارا اعتماد چھین لیا ہے۔ آج جو ملک جتنا وحشی ہے اتنا ہی ترقی یافتہ کھلتا ہے۔ کیا ہم اسی ترقی کے گن گائیں۔ بیمار بچوں کا علاج دریافت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بیماریاں کہاں سے پیدا ہوئیں۔ عجیب ترقی ہے، عجیب دور ہے۔ پہلے فو روگ ایجنڈا کیا اور پھر اس کی دوا تلاش کرنے لگے۔ ترلوکا کی آواز اسی ترقی کے خلاف بلند ہوئی ہے۔“

”وہ کیا چاہتا ہے؟“

”اس کی خواہش ہے کہ انسان اتنا ہی معصوم ہو جائے جتنا تھا وہ منشیات کی غنودگی میں ڈوب کر سب کچھ بھول جائے۔ وہ ترقی کے اس دور کو۔۔۔۔۔ بدترین دور کو فراموش کر دے اور صرف انسانیت کی زندگی گزارے تاکہ اس کے بعد کی جو نسلیں آئیں وہ امن پسند ہوں۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”کیوں؟“

”جب تک انسانی نسل آتی رہے گی۔ تعمیر اور تہذیب کا عمل جاری رہے گا۔“

”ہم آنے والی نسلوں کو ہی سنوارنا چاہتے ہیں۔ جو نسلیں موجود ہیں وہ تو انتہائی دور تک جا رہی ہیں۔“

”اس طرح تو ترلوکا کا مشن بہت طویل ہے۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“

”کیا ترلوکا اس مشن کی تکمیل تک زندہ رہے گا؟“

”مشن ہمیشہ زندہ رہتا ہے، اس کے پیرو اس کی موت کے بعد اس کے نام کو لے کر آگے بڑھیں گے۔“ لویا نے جواب دیا۔

”لیکن اس مشن سے ترلوکا کو کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”فائدہ۔۔۔۔۔ ہر محب انسانیت کی اگر اپنی کسی کوشش سے دوسرے انسانوں کو بہتر زندگی حاصل جائے تو میں سمجھتی ہوں کہ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ ترلوکا یہ سب کچھ اپنے لئے تو نہیں کر سکتے۔ اسے آنے والی نسلوں کی بہتری کا خیال ہے۔“

”لیکن اسے مذاہب سے اختلاف کیوں ہے؟“

”اسے دنیا کے کسی خاص مذاہب سے کوئی اختلاف نہیں ہے، مذاہب ہر حال انسان کے لئے بہتر بات لے کر آئے۔ لیکن انہوں نے کچھ ایسی ذمہ داریاں عائد کیں جنہیں پورا کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اخلاق و تہذیب کے وہ بوجھ مذاہب نے ہی ان پر لا دیے جس سے بغاوت کا احساس انسان کے ذہن میں آتا ہے۔ تم مجھے بتاؤ دنیا کا کونسا مذاہب ایسا ہے جس کے ماننے والے دنیا کی ہر برائی سے تائب ہو گئے ہیں۔ جب یہ سب انسانوں کو برائیوں سے دور نہ کر سکے تو پھر انہیں تسلیم کیوں کیا جائے۔“

”لیکن ان میں مذاہب کا کیا قصور۔ یہ تو ماننے والوں کی غلطی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”مقصود یہی ہے کہ وہ ذمہ داریاں ان لوگوں پر ڈال دی گئیں جو مذاہب کو خلوص دل سے تسلیم کرتے ہیں لیکن انہیں کو بدلنے کے لئے کوئی ایسا موثر ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا جن سے مذاہب کی تعلیمات مٹ کر ہوتیں۔ اور ہم لوگ کوئی مذاہب نہیں بھیج رہے، ہم صرف ذہنوں سے وہ کسل وہ کمالت اور وہ ماس ختم کرنا چاہتے ہیں جو مختلف چیزوں نے پیدا کئے ہیں۔ اور یہی ہمارا مشن ہے۔ گویا ہم نفسیاتی طرز پر وہ انقلاب لانا چاہتے ہیں جو عالم انسانیت کی بقا کے لئے بہت ضروری ہے اور نسل انسانی کے لئے بہتر بات ہو گا۔ ہم صرف انسانیت پر چھائے ہوئے اس جہود کو توڑنا چاہتے ہیں جس نے انسان کی زندگی پر سب تقدس اور ذمہ داریوں کے لامحدود بوجھ ڈال رکھے ہیں۔“

”لیکن کیا اس طرح تم نسلوں کو تباہ نہیں کر رہے؟“ میں نے برے سے لہجے میں کہا۔

”یہ تو تہذیب کی سوچ ہے، آنے والی نسلیں ہمارے اس کارنامے کو سراہیں گی۔ جب وہ اپنے ایک اس خوف کا ماحول نہ دیکھیں گی تو ہمارے اس مشن کو سراہیں گی۔“

”یہ صرف تمہارا خیال ہے لویا۔ ہر دور اپنی علیحدہ سوچ لے کر آتا ہے اور وہ صرف اسی سوچ کے رے زندہ رہ سکتا ہے جو سوچ اسے وقت عطا کرتا ہے۔ اگر نسل انسانیت تمہاری دی ہوئی کمالت کا شکار نہ ہو تو پھر اس کی تباہی بالکل نزدیک آجائے گی۔ وہ دنیاوی آفات کا مقابلہ کرنے کے قائل نہیں رہے گی اور غنودگی اسے موت کے نزدیک پہنچا دے گی اور تمہاری دی ہوئی عقلیتیں لوگوں کو موت کے لئے گندی بنانے کی کوشش کریں گی۔ ان کے اعضاء مفلوج اور ذہن بے کار ہو کر رہ جائیں گے اور اگر تم اسے ہی نسل

عرشہ پر کچھ سمجھ نہیں آسکا۔ بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے یہ بات نہیں کہی جاسکتی تھی کہ وہ سب جینگو کے آدمی ہیں۔ پھر جینگو نے یہ رسک کیوں لیا تھا۔ مجھے اپنی منزل کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا لیکن یہاں تو میں کسی سے بھی پوچھ سکتا تھا یہ کوشش کروں یا نہ کروں؟ میں نے سوچا۔

مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک درمیانی عمر کا آدمی ریٹنگ سے ٹکا سمندر کی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

”ہیلو۔“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ لیکن بوڑھے نے مجھے لفٹ نہیں دی۔ تب میں نے اس کے شلے پر ہاتھ رکھ دیا وہ چونک کر پلٹا۔ ”آپ شاید ذہنی طور پر بہت مصروف تھے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام لو کیس پاسکل ہے۔“ بوڑھے نے جواب دیا۔

”میں ایشیائی ہوں اور میرا نام نواز اصغر ہے۔“ میں نے کہا۔

”گیارہ بج کر بیس منٹ۔“ بوڑھا گھڑی دیکھ کر بولا۔

”جی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔

”ہاں۔ واقعی وقت کا تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا، دراصل آسمان ابر آلود ہے۔“ بوڑھے نے گردن اوپر اٹھا کر کہا۔

”غالبا“ آپ اونچا سنتے ہیں۔“ میں نے اس بار کٹنی تیز لہجے میں کہا۔

”ممکن ہے ہو جائے۔ بظاہر تو بارش کے آثار نہیں۔ میں ماہر موسمیات ہوں۔“ بوڑھا خوش اخلاقی سے بولا۔

”بہت بہتر۔۔۔۔۔ شکر ہے۔“ میں جھلائے ہوئے انداز میں پلٹا اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ایک سریلی سی ہنسی میرے کانوں میں گونجی۔ ”بال بال بچ گئی۔“ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

”سوری“ میں نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔

”آپ غالبا“ جھلا گئے تھے۔ میں بیبا سے آپ کی گفتگو سن رہی تھی۔“

”لوہ۔ یہ آپ کے بیبا ہیں؟“

”جی ہاں۔ میں انہی کے پاس آرہی تھی۔ آپ کو ان سے مصروف گفتگو دیکھ کر رک گئی؟“

”بے چارے اونچا سنتے ہیں۔“ میں نے افسوس ظاہر کیا۔

”سنتے ہی کہاں ہیں۔ کچھ نہیں سنتے۔“

”لوہ۔ لیکن آپ انہیں آگہ سماعت کیوں نہیں استعمال کراتیں؟“

”ان کے لئے بیکار ہے۔“

”افسوس ہوا۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

”بیبا عجیب ازمن ہیں۔ انہیں بے گنے قسم کے ایڈوینچر پسند ہیں مجھے اس سفر کے بارے میں کچھ بتایا۔ بس پیرس سے جہاز میں سوار ہوئے ہیں اور مجھے کچھ نہیں بتایا گیا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ لیکن اب کٹ گئی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”آخر انسان کو معلوم تو ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟“

”تو آپ کو معلوم نہیں ہے۔“

”قطعاً نہیں۔“

”آپ نے کسی سے پوچھا بھی نہیں؟“

”پوچھوں گی بھی نہیں۔ میرے ذہن پر جھلٹا ہٹ سوار ہے۔“

”بہتر ہے آرام کریں۔“ میں جھلائے ہوئے انداز میں پلٹ پڑا۔

”ارے ارے سسر۔۔۔۔۔ سسر پلیز سنئے تو سہی“ میں آپ کے ساتھ۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اس کے

رے الفاظ بھی نہیں سنے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

سر میں درد ہونے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ دفعتاً ایک آدمی میرے قریب پہنچا۔

”سسر! آواز! آپ کا ناشتہ آپ کے کیبن میں موجود ہے۔“

”لوہ۔ تم کون ہو؟“

”آپ کا خلو م۔“ اس نے جواب دیا۔ وہ دیکھا پتا سا آدمی تھا۔

”ٹھیک ہے بھاگ جاؤ۔“

”سسر جینگو کی ہدایت ہے کہ آپ اپنے کیبن میں واپس جائیں۔“

”بھاگ جاؤ۔“ میں غرایا۔

”لیکن مجھے ہدایت ملی ہے کہ۔۔۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا لیکن دوسرے لمحے میں نے اس کا گریبان پکڑ

کر ایک گھونرہ اس کی ٹھوڑی پر جڑ دیا۔ اور وہ چاروں شلے چت جا پڑا اور پھر وہ جلدی سے اٹھ کر ایک

طرف دوڑتا چلا گیا۔

سر کا درد کچھ اور بڑھ گیا تھا لیکن میں کیبن میں واپس نہیں گیا۔ اور جہاز کے دوسرے حصوں کی سیر

کرنے لگا پھر آتا کر کیبن کی طرف چل پڑا اور دروازہ کھول کر اندر پہنچ گیا۔

ایک میز پر ناشتہ ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ بھنا ہوا گوشت اور کلنی۔ بہت عمدہ خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میرا دل

راغب ہو گیا۔ ان کے قبضے میں تھا۔ جو کچھ بھی چاہتے کامیاب ہو سکتے تھے اس لئے کسی چیز سے پرہیز مملکت

تھی۔ میں نے اطمینان سے ناشتہ کیا اور پھر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

نہ جانے یہ درد اس قدر کیوں بڑھ گیا تھا۔ ذہن بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ اور پھر جب اس تکلیف نے

انتہائی شدت اختیار کر لی تو میں پریشان ہو کر باہر نکل آیا۔ ایک بار پھر میں نے لویا کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ اور لویا نے مجھے دیکھ کر بڑے دلکش انداز میں ہونٹ سکڑ لئے۔ ”آؤ۔ اندر آجاؤ۔“

”سوری لویا۔ میں تمہیں ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔“

”آؤ۔ باہر کیوں کھڑے ہو۔“ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ ”بیٹھو۔“

اس نے میرے دونوں شانوں پر دباؤ ڈال کر مجھے بٹھالیا۔ ”ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔؟“

”سرکی چوٹ زیادہ دکھ رہی ہے۔ اس کے لیے کچھ کرو۔“

”ایک منٹ۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر اس نے اسی فرسٹ ایڈ بکس سے ایک انجکشن نکالا۔ سرنج میں کھینچ کر وہ میرے نزدیک آگئی اور اس نے انجکشن بڑے اطمینان سے میرے بازو میں انجکت کر دیا اس کے بعد اس نے ایک گولی مجھے کھانے کے لئے دی جسے میں نے بلا تعرض کھالیا۔

”لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر لیٹ جاؤ پر سکون ہو جاؤ گے۔“ اس نے کہا اور میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ بس نجانے کیوں کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اپنی سوچ سمجھ تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ سر کا درد بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

پھر جب آنکھ کھلی تو نجانے کیا وقت ہو رہا تھا۔ گھڑی تو میرے پاس تھی ہی نہیں۔ میں نے دیکھا لویا تھوڑے فاصلے پر ایک آرام کرسی پر دراز مطالعے میں مصروف تھی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر وہ بولی۔

”اوہ جاگ گئے نواز۔“ اس نے بدستور اسی انداز میں کہا جیسے وہ مجھ سے خاصی بے تکلف ہو۔

”ہاں۔“

”کیا کیفیت ہے اب؟“

”بالکل ٹھیک ہوں، لیکن وقت کیا ہوا ہے ابھی؟“ میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

”رات کے نو بجے ہیں۔“ اس نے جواب دیا اور میں چونک پڑا۔ اتنی دیر سویا تھا میں۔

”بڑی دیر سویا۔“ میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے لویا کو مخاطب کیا۔

”ہاں۔“

جماز کا سفر بدستور جاری تھی جس کا اندازہ یہاں پر بھی ہو جاتا تھا۔ ”سوری لویا تمہیں میری وجہ سے خاصی تکلیف اٹھانا پڑی۔“

”ہاں بہر صورت تم نے میری مدد کی ہے۔“

”کوئی مدد نہیں کی اور پھر تم غیر تھوڑی ہو۔“ اس نے کہا اور رسالہ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بھوک لگ رہی ہوگی۔“ وہ بولی۔

”ہاں لگ رہی ہے۔ میرا خیال نہیں۔ کھانا ہمیں آجائے گا۔ طبیعت درست نہیں ہو جاتی۔“

”اوہ، نہیں لویا، میں تمہیں اس قدر کہتے رہو کہتے رہو۔ جو دل چاہے۔“

”میں اس کے اس انداز پر غور کر رہا تھا۔“

”تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک ٹرے خود

”بیٹھو، میں نے بھی ابھی کھانا نہیں کھالیا۔“

”بہر صورت اب وہ اس قدر بے تکلفی پر آمادہ کرتے ہوئے بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ چنا

”لویا نے کھانے کے برتن اٹھائے اور باہر نکل گئی۔“

”خوش ذائقہ کافی پینے کے بعد اس نے میری جانب

”نواز کیا ضروری ہے کہ تم اس کیمین میں تنہا ہو۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے سر دھجے میں پوچھا۔

”یہیں رہو۔ میں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی۔“

”نہیں لویا جب میرا کیمین موجود ہے تو اس کی کیا ضرورت

”لیکن وہاں تم تنہا رہتے ہو۔“

”تو پھر؟“

”مجھے اجازت دو تو میں وہاں آ جاؤں؟“

”تمہیں تکلیف ہوگی لویا۔“

”پھر وہی تکلیف تکلیف۔ اس لفظ کو سنتے سنتے تو میرے گلن پک

”کر اس کی صورت دیکھنے لگا پھر اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔“

”نہیں لویا۔ میں یہاں نہیں سو سکتا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم انسانی فطرت میں تبدیلیاں کرنے کے خواہ

”تمہیں میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر اعتماد کرتے ہو تو یہ

”انداز میں یہ بات کہی کہ میں سے نفی نہیں کرتا۔ دیکھو“

”میں تمہیں ایک

”انجکشن لیتے لیتے نہیں توڑنا چاہتا۔“

”اس سے نہیں۔“ اس نے عاجزی سے

”میں سے ایک اور انجکشن

”سرکی سانس لے کر لیٹ

”غنودگی سی طاری رہی۔“

”لیکن خوفناک

”میں لیٹی ہوئی تھی۔“ اس نے اپنے ہاتھوں سے

”لویا کا اس

”دوسرے

”میں زندگی کی اس

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“

”دوسرے

”اگر وہ دیکھنے لگا

”دوسرے

”ہو گئے۔“

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

”نواز۔“ اسے پیچھے ہٹاتے

انداز میں یہ بات کہی کہ میں کچھ خاموش سا ہو گیا۔
 ”میں تمہیں ایک انجکشن دیئے دیتی ہوں۔ اس سے تم آرام کی نیند سو سکو گے۔“ اس نے کہا۔
 ”انجکشن لیتے لیتے بھی میری طبیعت بگڑتی جا رہی ہے لویا۔“ میں نے کہا۔
 ”اس سے نہیں بگڑے گی۔“ لویا اس بار اپنے سوٹ کیس کی جانب بڑھی تھی اور پھر اس نے اس
 میں سے ایک اور انجکشن نکل لیا۔ انجکشن سرنج میں کھینچ کر اس نے میرے بازو میں لگا دیا۔ اور میں ایک
 گہری سانس لے کر لیٹ گیا بلاشبہ میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں اور نجلانے کتنی دیر تک میرے ذہن پر
 غنودگی سی طاری رہی۔۔۔۔۔ پھر جب میری آنکھ کھلی تو نہ نجلانے کتنی رات گزر چکی تھی۔
 لیکن خوفناک صورتحال واضح ہوئی وہ میرے لئے شدید ذہنی جھٹکا بن گئی۔ لویا میرے نزدیک ہی بستر
 میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ اس کے بدن سے لپٹے ہوئے تھے۔
 لویا کا اس طرح میرے نزدیک لیٹ جانا ہر شب سے کو ختم کرتا تھا اور پھر اس کی اپنائیت کا انداز۔۔۔۔۔
 دوسرے لمحے لویا نے دونوں بازو میری گردن میں حائل کر دیئے۔
 ”نواز۔“ اس کی آواز میں خمار تھا۔
 ”نواز۔“ میرے ذہن میں اپنا نام گونجنا۔ اور ایک اور دھماکہ ہوا۔ میں نواز ہوں۔۔۔۔۔ راجہ نواز
 اصغر۔۔۔۔۔ وہ جو برائیوں کے راستے کا راہی تھا۔ لیکن جسے اب برائیوں سے نفرت ہو گئی تھی۔
 دوسرے لمحے میں ایک جھٹکے سے اس سے علیحدہ ہو گیا اور لویا کے چہرے پر حیرت کے نقوش ابھر
 ہو گئے۔
 ”نواز۔“ اس نے مجھے پکارا۔
 ”شکریہ لویا۔ اگر تم مجھے میرے نام سے نہ پکارتیں تو میں نہ جانے کہاں تک پہنچ جاتا۔ تم نے مجھے
 جگا دیا۔“
 ”کیا کہہ رہے ہو ڈارنگ۔“ اس کا انداز اس قدر پرکشش تھا کہ ذہن قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔
 لیکن میری نگاہوں میں جینگو کی مسکراہٹ ابھری جو میری فکست پر مسکرا رہا تھا۔
 ”ہاں لویا، میرا مذہب ناجائز قربت کی نفی کرتا ہے۔“
 ”ہر وہ چیز جو ہماری حاجت ہو جائے۔“
 ”تمہارے لئے، جینگو کے لئے۔۔۔۔۔ میرے لیے نہیں۔“
 ”نواز پلیز۔ میں عورت ہوں۔“
 ”نسوانیت کا وقار پیدا کرو۔“
 ”جس جوان ہوں نواز۔“ وہ کرائی۔
 ”جوانی کا خراج پاکیزگی سے ادا کرو۔“

”دیکھو نواز۔ میرا انگ انگ خوبصورت ہے۔ کوئی بھی مذہب عورت سے نفی نہیں کرتا۔ دیکھو“
 طرف دیکھو۔“
 ”نہیں لویا۔ میرے مذہب کے کچھ اصول ہیں اور اب میں ان اصولوں کو نہیں توڑنا چاہتا۔“
 ”میری توہین مت کرو، میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔“ اس نے عاجزی سے
 ”میں نے دوسرے راستوں کا انتخاب کیا ہے لویا۔ مجھے اجازت دو۔“
 ”میں اس وقت جینگو کے لئے نہیں اپنے لئے تمہیں مانگ رہی ہوں۔“
 ”اور میں اپنی ذات کی فلاح چاہتا ہوں۔“
 ”نواز پلیز۔۔۔۔۔ پلیز۔“ وہ میری طرف لپکی اور میں نے نہایت نرمی سے اسے اپنے ہاتھوں سے
 ”تم نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے لویا۔ میں اس کا ممنون ہوں۔ لیکن میں زندگی کی اس
 دوبارہ نہیں گرنا چاہتا۔ جس سے نہ جانے کونسا جذبہ مجھے نکل لایا ہے۔“ میں نے اسے پیچھے ہٹاتے
 ”فطرت کی طلب کو تم پستی سمجھتے ہو نواز۔“ لویا نے عجیب لہجے میں کہا اور میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
 ”ہاں لویا، میں مسلم ہوں اور میرے مذہب میں اس وقت تک کوئی عورت جائز نہیں ہے جب کہ
 بوی نہ ہو۔ لویا برے لوگوں کے درمیان ہونے کے باوجود میں نجلانے کیوں تمہیں ایک اچھی لڑکی
 لگا ہوں۔ میرے دل میں تمہاری عزت ہے کیونکہ تم نے بڑی اپنائیت سے مجھ سے گفتگو کی ہے۔
 دوست کی حیثیت سے میری چھوٹی سی خواہش کا احترام کرو۔ لویا میں کوئی پاک فطرت انسان نہیں
 کا آخری ہل گندگی اور غلاظت میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن اب میرے ذہن میں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔
 غلطوں سے نکلنے کا خواہشمند ہوں اور یہ تحریک میرے اندر جینگو ہی نے پیدا کی ہے۔“
 ”جینگو نے؟“ لویا حیرت سے بولی۔
 ”ہاں۔“
 ”کمر کیسے؟“
 ”اس نے میرے مقدس مذہب کا مذاق اڑایا تھا۔ اور میں جس نے ساری زندگی کبھی مذہب کے
 سوا کچھ نہیں کتب کر رہ گیا تھا۔ میرے اندر ایک روح بیدار ہو گئی تھی لویا جس نے مجھے سمجھایا
 کہ میں دنیا کے تمام سرد و گرم سے گزر چکا ہوں۔ کیوں نہ مذہب کی چاشنی سے بھی لطف اندوز
 کیا یہ احساس میری روح کی اس بے چینی کو دور کرتا ہے جس نے زندگی کے ہر لمحے میں میرا پیچھا

لیکن دروازہ باہر سے بند تھا اور میں متعجب رہ گیا۔ کوئی تبدیلی ہوئی ہے میں نے سوچا۔
دستک دینے پر چند ساعت کے بعد دروازہ کھلا۔ باہر چار آدمی موجود تھے۔

”کیا بات ہے؟“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”ہمیشہ ملے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ملے گا انتظار کرو۔“ اس شخص نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ لیکن میں

نے دروازے میں پاؤں اڑا دیا۔

”تمیز سے ہٹو کرو“ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ڈپٹ کر کہا اور وہ شخص ایک لمبے

کے لئے بوکھلا سا گیا۔

”کیا بات ہے؟“

”کیا مجھے قید کر دیا گیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں تم اس کیمین سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لئے کہ تم مسٹر جینگو کی مراعات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے ہو۔“ اس شخص نے کہا جسے میں

نے ڈانٹا تھا۔

”کیا فائدہ؟“

”مجازز فائدہ۔“

”کیا مطلب؟“

”کیوں کیا، کل تم نے کچھ لوگوں سے مل بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ تم اس سفر کے بارے میں

تفصیلات معلوم کرنا چاہتے تھے۔“

”تو کیا جینگو کے نزدیک یہ بہت بری بات تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں!“

”کیوں؟“

”اگر جینگو نہ چاہے تو تمہارے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے۔“ اسی شخص نے جواب دیا۔

”میں جینگو پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اس سے کہو کہ وہ آج تک اپنی ہر کوشش میں ناکام رہا ہے اور

آئندہ بھی ناکام رہے گا۔“ وہ چاروں غصیلے انداز میں میری شکل دیکھنے لگے تھے۔ پھر ان میں ایک نے مجھے

زور سے دھکا دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مجھے ان کی اس بد تمیزی پر سخت غصہ آ رہا تھا لیکن پھر مجھے

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

در اصل اس احساس نے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا دی تھی کہ جینگو میری طرف سے مایوس

بے بسی کا شکار ہو گیا ہے اور یہ میری کامیابی تھی کہ جینگو نے مجھے قید کر دیا تھا۔

لیکن میں تہیہ کر چکا تھا کہ کسی بھی صورت میں اس بد بخت کی بتائی ہوئی غلط راہوں پر نہیں چلوں

ب میرے دل میں ایک عزم جاگ اٹھا اور اس عزم نے مجھے بڑا سکون دیا تھا۔

وہ بے چینی اور وہ تردد جو میرے ذہن میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ اس عزم کے احساس کے ساتھ خود

ور ہو گیا۔ جب بھی میں اپنا تجزیہ کرتا مجھے ساری باتیں بے حد عجیب لگتیں۔

میں اس جہاز پر خوفناک ہنگامہ برپا کر سکتا تھا۔ ایسا ہنگامہ جس میں جینگو کو ناقابل برداشت نقصان

پڑتا۔ لیکن میں اس برے انسان کو برائیوں کی کامیابی کے سلسلے میں زچ کر دینا چاہتا تھا اور اس کے لئے

میں تھا کہ خاموشی سے سفر کیا جاتا۔

مجھے یقین تھا کہ جینگو مجھے زندہ رکھے گا۔ کیونکہ اس پر اپنے دعوے کو چھ کر دکھانے کا بہت سوار

چنانچہ فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

میں لیٹ گیا اور اس کے بعد میں نے تمام احساسات کو ذہن سے کھرچ پھینکا، ہاں اگر کوئی احساس تھا

میرے وطن کا، سردارے کا، ہرانا کا اور اس میرا ڈالسنگ کا، جس نے ان مشکل حالات میں اپنی جان کو

میں ڈال کر میری مدد کی تھی۔

ان لوگوں کا خیال میرے ذہن میں بار بار آ رہا تھا۔ سردارے نہ جانے کیا کر رہا ہو گا۔ ممکن ہے وہ

تلاش میں ہی کل کھڑا ہوا ہو۔ اگر اس نے ایسا کیا ہے تو یقینی طور پر بڑی احمقانہ حرکت ہوگی جسے میں

بھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ مجھ تک پہنچ گیا تو میں اسے اجنبی نگاہوں سے دیکھوں گا اور اگر میں اسے

درازا کر۔ نے میں ناکام رہا تو اسے مشورہ دوں گا کہ وہ بھی اب ان ساری باتوں کو چھوڑ کر زندگی کی اس حسین

حقیقت کی جانب آجائے کہ برائیاں کبھی روح کا سکون نہیں بن سکتیں۔ روح کا سکون درکار ہے تو

اس کی کانٹوں بھری راہوں پر قدم بڑھائے جائیں وہ راہیں جو تقدیر نے مجھے عطا کر دی تھیں۔ مصائب کی

دھوپ میں روح کو بالیدگی مل رہی تھی اور پھر ابھی مصائب شروع ہی کماں ہوئے تھے۔ ابھی تو ابتداء

صبح کا ناشتہ تو نہ ملا البتہ دوپہر کو کھانا آیا۔ میں کسی قسم کی شکایت یا تعرض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے

میں سے دوستی کا تصور ہی حماقت ہے۔ چنانچہ میں نے خندہ پیشانی سے کھانا وصول کر لیا اور جو کچھ تھا اسے

شکر سے کھایا۔ بہر صورت کھانا اتنا برا بھی نہیں تھا۔

خوب اچھی طرح شکم سیر ہونے کے بعد میں پھر بیٹھ گیا۔ ویسے اس بات کا مجھے احساس تھا کہ یہ قید

مجھے خاصی آکٹا دے گی اور اگر جہاز پر میں ایسی کوئی کوشش نہیں کرتا تو کم از کم آزادی تو حاصل تھی۔

اور دفعتاً میری آنکھوں کو غیند کے دہاؤ کا سا احساس ہوا اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

کم بخت لوگوں نے پھر کوئی چکر چلا دیا تھا۔ شاید نئی ناکامی کے تحت وہ کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے تھے۔

میں ہی رکھا گیا ہو۔ انہوں نے محسوس کیا ہو کہ میں ان کے لئے خطرہ بن سکتا ہوں۔ چنانچہ اس بات کا اندازہ لگانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ میری بے ہوشی کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ ہاں جسمانی طور پر اگر میں خود کو محسوس کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کیونکہ میرے اندر ذرا سی بھی کمزوری نہیں تھی۔

بے ہوشی کے دوران کھانے پینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن پھر بھی میرے بدن میں کئی کماں سے آئی اور اس بات کا میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا تھا۔

میں ہمت کر کے بستر سے اتر آیا۔ دیکھوں تو سہی پردے کے دوسری طرف کیا ہے۔ ممکن ہے اس کوئی اندازہ ہو سکے۔

لیکن پردے ہٹانے کی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ نہ جانے وہ کس طرح کھلتے تھے، میں انہیں غور سے دیکھ رہا تھا۔

پردے نہایت نفیس سٹم پر تھے۔ میرے کھولنے کی کوشش کارگر نہ ثابت ہوئی تب میری نگاہ اس بٹن پر پڑی جو پردوں کے نزدیک دیوار پر تھا۔ میں نے بٹن پر انگلی رکھ دی اور پردے کے دو حصے میوزک حسین آواز کے ساتھ دونوں طرف سرکنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سرلی آواز میں صبح کا گیت سنائی دینے لگا۔ خوبصورت آواز والی مغنیہ سورج کی کرنوں کا پیغام دے رہی تھی۔

اور باہر کا منظر اجاگر ہو گیا۔ پردے ہٹنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں تو بے پناہ بلندی پر ہوں۔ بالائی بلندیوں پر۔ بالائی عمارتیں نیچے نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف بلند و بالا عمارتوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔

اور عمارتوں کے اس عظیم الشان شہر کو دیکھتے ہی نیویارک کا تصور ذہن میں ابھرنا تھا۔ تو کیا میں نیو یارک پہنچ گیا ہوں۔ میں نے سوچا اور پھر کھرنڈ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں نے بے ہوشی کے عالم میں طویل سفر کیا ہے۔ کافی دیر تک میں اس بڑی کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ بس عجیب سا عالم تھا۔

پھر اچانک اپنے عقب میں مجھے آہٹ سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا، جینگو تھا۔ سبز رنگ کے لباس میں ملبوس، جو انتہائی چمکدار تھا۔ پیشانی پر سنہری رنگ کی ایک پٹی بندھی ہوئی جس کے درمیان میں پیش قیمت ہیرا جگمگا رہا تھا۔ میں نے اس کے عقب میں دیکھا۔ لیکن خود کار دروازہ بند ہو گیا تھا اور جینگو غائب ہو گیا تھا۔

”راجہ نواز امیر۔“ اس نے عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”خوابوں کا رانی جینگو۔“ میں نے بھی اسی انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”خوابوں کا نہیں بلکہ حقیقت کا سب سے بڑا پرستار۔“ جینگو گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے بولا۔

پھر آہستہ سے چلتا ہوا اس چوڑے صوفے کی جانب بڑھ گیا جو ایک طرف پڑا ہوا تھا۔

”حقیقت سے بھاگنے والے دوسرے کی نگاہوں سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں جینگو۔ بلا

تمہارا مشن برسرِ عام ہے لیکن بہر حال تم اس کے لئے وہ سارے بھی ضروری سمجھتے ہو جو غیر قانونی

نہیں کا دباؤ بڑھتا ہی گیا اور صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کھانے کی کسی چیز میں کوئی گڑبڑ تھی اور پھر احساس لئے میں آہستہ آہستہ بستر پر لیٹا چلا گیا اور چند ساعت کے بعد بے خبر ہو گیا۔

زندگی ایک مخصوص دائرے میں گھوم رہی تھی، جینگو اپنی سی ہر کوشش کر رہا تھا نجانے اس دیوار کو بھی کیا سوچتی تھی کہ مجھ جیسے آدمی سے ہیر لگا بیٹھا تھا۔ گو حالات ابھی تک اس کے حق میں تھے لیکن صرف اس حد تک کہ وہ مجھ پر قابو حاصل کئے ہوئے تھا۔

لیکن یہ بات شاید اس کے علم میں بھی نہ ہوگی کہ جب میں اس پر قابو پاؤں گا تو اسے اپنی زندگی سب سے بڑے خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ وہ یہ سوچے گا کہ مجھ سے ضد کر کے اس نے اچھا نہ کیا اگر ایک آدمی ترلوکا کے مشن میں اس کا ہم زبان نہ ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ لیکن جینگو ضد کا مظاہرہ کر رہا تھا اور ہر حال میں ضد کا نتیجہ تو برابری ہوتا ہے۔

میں ایک بار پھر جاگا اور میری کیفیات پہلے سے مختلف نہ رہیں۔ چند ساعت تو ذہن منتشر رہا اس کے بعد مجتمع ہو گیا تو میں نے گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچا نجانے اب کیا کیفیت ہے۔ ہمارا جہاز کہاں تک پہنچ چکا ہے۔

میں نے محسوس کرنے کی کوشش کی کہ جہاز کے اسی کیمین میں ہوں یا کیمین اور ہوں تو احساس یہ کہ جس جگہ میں موجود ہوں وہ کسی جہاز کا کیمین نہیں ہو سکتا۔ اتنا کشادہ اور حسین کیمین شاید دنیا کے کسی جہاز میں نہ ہو۔

یہ ایک آراستہ بیڈ روم تھا۔ انتہائی حسین بنانے پر آراستہ، جس بستر پر میں لیٹا ہوا تھا اس پر کم از کم دس آدمیوں کی گنجائش تھی۔ گدے اتنے نرم تھے اور اس پر بچے ہوئے پنگ پوش اتنے دھیر تھے کہ ان سے صرف تصور ہی کیا جاسکتا تھا۔ بڑے بڑے اونچے دروازوں پر قیمتی پردے لگے ہوئے تھے، ایک جانب ایک انتہائی حسین عورت کا مجسمہ سر پر روشنی کی گیند اٹھائے کھڑا تھا۔ اور گیند کے اس بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

دوسری طرف دیوار پر نیا گرا آبشار کی ایک حسین پینٹنگ آویزاں تھی ڈیکوریشن کا دوسرا سامان اس طویل و عریض بیڈ روم میں موجود تھا۔ چنانچہ اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ یہ عمارت کا بیڈ روم ہے۔

لیکن میں کہاں ہوں؟ چند ساعت میں سوچتا رہا۔ پھر ایک دم سر کے درد کا خیال آیا۔ ماتھے پر ہاتھ لے جا کر پٹیاں ٹٹولیں تو انہیں غائب پایا۔ دوسرے لمحے میں نے سر کی اس چوٹ کا اندازہ کیا اور یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ اب اس چوٹ کی جگہ کھرنڈ جما ہوا ہے۔ لیکن یہ سب اچانک؟

آہ۔۔۔۔۔ کاش میرے پاس گھڑی ہوتی، کیا میری بے ہوشی کچھ طویل ہو گئی تھی، اتنی طویل کہ کازخم کھرنڈ بن جائے، ان لوگوں سے کوئی بات بعید بھی نہیں تھی۔ ممکن ہے مجھے طویل عرصے تک

ہوتے ہیں۔“

”صرف اس لئے الزامات لگانا چاہتے ہو راجہ نواز اصغر کہ تم میرے اقدامات سے یا ہمارے مسلک سے مسلک نہیں ہو اس سے بڑھ کر یہ کہ تم ہمارے مسلک سے متفق نہیں ہو بہتر یہ ہے کہ تم دل کی ساری بھڑاس نکال لو اور اس کے بعد ٹھنڈے دل سے مجھ سے گفتگو کرو میں اب بھی تم سے مصالحت اور ٹھنڈے ذہن سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بات کرنا چاہتے ہو جینگو، تم میری باتوں سے لا جواب ہو گئے تھے تم نے یہ نظریہ پیش کیا تھا۔ اس میں وہ استدلال نہیں دے سکے تھے جو مجھے مطمئن کر دیتا۔ ہاں مجھ جیسے انسان کے ذہن میں مذہب سے بہت زیادہ عقیدت نہیں تھی اور اس بات کو تم بہتر طور سے جانتے ہو کیونکہ تم میرا ماضی کھنگال چکے ہو۔ لیکن تمہاری گفتگو سے میرے دل میں مذہب سے محبت اور عقیدت پیدا ہوئی۔ میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں اور جب انسان کے دل میں مذہب سے محبت اور عقیدت پیدا ہوتی ہے تو پھر اس کی آنکھوں پر کوئی دوسرا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اس بات کو مکمل طور پر ذہن میں رکھنا جینگو۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”میرے دوست یہاں بھی تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ میں تمہاری باتوں سے لا جواب ہو گیا تھا۔“

”ہاں بالکل۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی راجہ نواز اصغر، میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تمہیں سوچنے کا موقع دوں اور تم جو اچھے خاصے حقیقت کے راستے پر چلنے والے انسان تھے جس انداز میں بھٹک گئے ہو میری خواہش تھی کہ تم اپنے راستے پر واپس آ جاؤ۔“

”جینگو اگر تقدیر مجھے یہ راستہ عنایت کر دے جس پر میں اتفاقیہ طور پر بلکہ حادثاتی طور پر چلنے لگا ہوں تو تم یقین کرو کہ میں اپنی زندگی کی ہر سانس ان لمحات پر قربان کرنے کو تیار ہوں۔“

”گویا تمہاری آنکھوں پر تہذیب کی جو تہ چڑھی ہے اب اس کا اترنا مشکل ہے۔“

”ہاں جینگو، میں نے کہا تھا کہ میں اپنی ساری زندگی کو بے کار سمجھتا ہوں سوائے ان لمحات کے جب میری رگوں میں زندگی دوڑی ہے۔“

”بہر صورت میں نے کوشش کی بلکہ محنت بھی کی کہ تم صحیح راستے پر واپس آ جاؤ لیکن یوں لگتا ہے جیسے تمہاری واپسی ممکن نہیں ہے۔“

”میں ہر قیمت پر تمہارا یہ بھرم توڑنا چاہتا ہوں جینگو۔“

”تم میرا بھرم کیا توڑو گے نواز۔ میں خود تمہارا بھرم توڑ کے رکھ دوں گا کیونکہ یہ میری عزت کا سوال ہے۔“

”تم کس بھرم کی بات کر رہے ہو جینگو؟“

”اس بھرم کی جو تم نے خود پر ٹیکوں کی صورت میں چڑھایا ہوا ہے اور اس میں عورت سے اجتناب ہی شامل ہے۔“

”ہاں۔ کیونکہ میرا مذہب مجھے کسی غیر عورت کے ساتھ وقت گزارنے کی اجازت نہیں دیتا۔“

”لیکن میں تمہیں اس کے لئے مجبور کر دوں گا نواز۔ اس وقت کیا تم خود کشی کر لو گے؟“

”نہیں۔ لیکن تم مجھے مجبور نہیں کر سکو گے۔“ میں نے انتہائی ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ۔ کیا اسے بھی تمہاری غلط فہمی نہ کہا جائے۔“

”کہہ سکتے ہو صرف اس لئے کہ اپنے خیال میں تم نے مجھے قید کیا ہوا ہے۔ لیکن اپنے اقدامات پر میں قادر ہوں۔“

”میں تم سے مزید بحث نہیں پسند کروں گا۔ تم اس وقت نیویارک میں ہو۔ اس کے بعد تمہاری آخری منزل لاس اینجلس ہوگی۔ کیلی لاس کی سیاہ پہاڑیاں جو شہری آبادی سے بہت دور ہیں لیکن جو اس لئے مقدس ہیں کہ ترلو کا مسکن ہیں۔ وہاں تمہیں ترلو کا کے حضور پیش کیا جائے گا اور پھر تم زندگی بھر اس بات پر پہچھتاتے رہو گے کہ تم نے اپنے عظیم محسن جینگو سے اس ترش اور تند لہجے میں گفتگو کی تھی۔“

”وہ کیوں جینگو؟“

”ترلو کا کے قدموں میں تمہیں نروان ملے گا۔“

”کیا وہ نروان کا سوداگر ہے؟“

”ہاں اس کے پاس نروان ہی نروان ہے۔“

”میرا خیال مختلف ہے جینگو۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ ماحول کا مفروز ہے۔ تہذیب کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ اس لئے پہاڑیوں میں جا چھپا ہے۔“

”اس کا فیصلہ اس سے ملنے کے بعد ہی کر سکو گے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اس لئے اس کے سلسلہ میں بحث ملتوی۔“

”چلو ٹھیک ہے اب رہیں دوسری باتیں۔“

”وہ بھی کرو۔“

”یہ بات تم نے اب تک نہیں بتائی کہ پیرس میں اس وقت تمہاری مدد کس نے کی تھی جب تم پیسے پیسے کو محتاج تھے۔“

”میں نے اس وقت بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور اس وقت بھی یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”کیا میں اس سے یہ اندازہ قائم نہیں کر سکتا کہ تم بھوک سے مجبور ہو کر بھٹک گئے تھے۔“ جینگو نے کہا۔

حقیقی ثبوت کے ساتھ اس شخصیت کو منظر عام پر لایا ہوں جس نے میرے خلاف سازش کر کے اس وقت
ری مدد کی جب تم حالات کے ہاتھوں بھٹک کر واپس بھی آ سکتے تھے۔ اس طرح وہ میرے افکار سے باغی
یت قرار پائی۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ وہ خود بھی اس گروہ کی نمک خوار تھی اور میں چونک پڑا
اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ جینگو کا اشارہ میرا ڈالسننگ کی طرف ہی تھا مجھے شدید
ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا اور ایک تہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”نجانے تم نے کس
وقوف کو پھانس لیا۔“

”ملاقات کرو گے اس بے وقوف سے؟“ جینگو نے کھنڈرے انداز میں کہا۔
”ضرور بلاؤ۔“ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا اور جینگو نے ایک ہاتھ بلند کر دیا۔ میں نے اب
کے سرخ دستانے کو دیکھا جس کے پورے آگے سے چپے تھے اور ان میں سوراخ نظر آرہے تھے۔
یہ صرف میرا اندازہ تھا کہ جینگو اس وقت نہتا نہیں ہے بلکہ اپنے بچاؤ کا انتظام کر کے آیا ہے لیکن
ہاتھ اٹھانے سے اس کا مقصد حل ہو گیا گویا دیکھنے والے بھی موجود ہیں اور وہ اس کے کسی بھی
رے پر میرا بدن چھلی کر دیں گے۔

”جینگو۔“ میں نے اسے آواز دی۔

”ہوں۔“

”تمہارے دستانے خوب ہیں۔“

”اوہ۔ ہاں۔“ اس نے بے اختیار ہاتھ نیچے کر دیا۔

”گھبرا کیوں گئے؟“

”نہیں میں اعتراف کر چکا ہوں۔“

”کس بات کا۔“

”تمہاری حسین صلاحیتوں کا۔“

”کیا تمہیں داستانوں کی تعریف پسند آئی ہے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”نہیں تمہاری ذہانت۔“

”اس میں ذہانت کی کیا بات ہے۔“

”تم بے مقصد باتوں سے پرہیز کرتے ہو اور داستانوں کا ذکر بے مقصد ہی نہیں ہے۔“

”کیا ہے یہ؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”جدید ترین اسٹین گن جو ایک بیشری سے مسلک ہے اور ایک ہلکا سا بٹن دہانے سے یہ پانچوں

ہاتھ نچے نچے زہریلے تیراگل سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا تیراگر کسی کے بدن میں پیوست

ہلے تو اس کا پورا بدن بہہ جاتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”تم نے کسی ناجائز ذریعہ سے وہ رقم نہیں حاصل کی۔“

”پھر؟“

”جیب تراشی یا پھر جوا۔ دونوں آسان ترین طریقے ہیں جن کے ذریعہ دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔“

اور راجہ نواز اصغر کی تاریخ میرے ذہن میں ہے۔“

”ممکن ہے ایسی کوئی بات ہو جینگو لیکن کیا تمہیں بتانا ضروری ہے۔“

”ہاں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تمہارے درمیان ایک معاہدہ ہے میں نے تم سے کہا تھا کہ

نیک ذرائع سے انسان سکون نہیں پاسکتا۔ ضرورت پوری کرنے کے لئے برائیوں کا سہارا ضروری ہے۔“

”اپنا محاسب میں خود ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ضمیر کی جنگ ہار گیا تو تروکا کی پیروی کروں گا۔“

”بات معاہدے کی ہے تم اپنے محاسب نہیں ہو سکتے۔ بہت سے لوگ خود کو پوشیدہ رکھتے ہیں۔

میرا مطمئن ہونا ضروری ہے۔“

”میں ضروری نہیں سمجھتا تمہیں اعتماد کرنا ہو گا۔“

”چلو کر لیا۔ لیکن تم نے ایک بات اور بھی کہی تھی۔“

”وہ کیا؟“

”تم نے کہا تھا کہ اگر میں روشن ضمیر ہوں تو معلوم کر لوں کہ وہ رقم تم نے کہاں سے پائی تھی۔“

”ہاں مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا۔“

”تو شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہو کہ میں معلوم کر چکا ہوں۔ یوں بھی مجھے اس شخصیت کے بارے

میں مکمل معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ جس نے تمہیں سہارا دیا تھا اور جو شاید اس کے بعد بھی تمہیں سہارا

دیتا رہا ہے۔“ جینگو نے کہا اور ایک تخت میرا دل دھڑک اٹھا۔

کیا اس بد بخت کو بے چاری میرا ڈالسننگ کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ میں نے سوچا میں

اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ جینگو کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”کیا خیال ہے نواز۔ کیا وہ شخصیت تم سے مخلص تھی؟“

”میں نہیں جانتا۔ جینگو تم کس شخصیت کی بات کر رہے ہو۔ ممکن ہے یہ بھی تمہاری کوئی چال ہو

اور تم کسی کے سر کوئی الزام تھوپنا چاہتے ہو۔“

”دیکھو دوست جینگو میں بے شمار برائیاں ہیں۔ وہ برائیاں جو تہذیب اور معاشرے میں بری سمجھی

جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہارے معاشرے کے مطابق کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ میں شخصیتوں کا

گھیراؤ نہیں کرتا۔ مجھے اتنی قدرت حاصل ہے کہ جسے پسند کروں اسے موت کے گھاٹ اتار سکوں۔ ایسی

حالت میں ایک قادر شخص الزامات لگانے کی مذموم سی کوشش نہیں کر سکتا۔ میں نے کوئی الزام نہیں لگایا

”خوب۔ خوب۔ خوب۔ مائی ڈیئر جینگو تمہاری یہ کوشش تمہارے ذہن کے خوف کا اظہار کرتی ہے، تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم جن راستوں کے راہی ہو وہ غلط اور مجربانہ ہیں اور پھر تم اسی تہذیب و ترقی کی مخالفت کر رہے ہو جس کے ایک عطیے سے تم اپنی زندگی کی حفاظت کر کے آئے ہو۔“

”ہاں ہاں بالکل صحیح کہا تم نے، لیکن میرے دوست زہر کو زہر مارتا ہے، تمہاری اس ترقی کو تمہارے ہی ہاتھوں تباہ ہونا پڑے گا۔ ہم صرف زبان اور الفاظ سے اپنے مشن کو کامیاب بنائیں گے اور تمہیں تمہارے ہاتھوں سے ماریں گے تاکہ دکھی انسانیت سکون پذیر ہو سکے۔“

”اچھی منطق ہے، جان بچانے کی کوشش اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“ میں نے حقارت سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، اگر تم اس انداز میں سوچ رہے ہو تو یہی سہی لیکن ہمارا موضوع دوسرا تھا اس بارے میں پھر گفتگو کر لیں گے بلکہ میں تو تم سے گفتگو ہی نہیں چاہتا کیونکہ تمہارے الفاظ میں ترلو کا کی توہین ہوتی ہے ہاں اس شخصیت سے مل لو جس کے بارے میں ہم ابھی گفتگو کر رہے تھے۔“ جینگو نے ایک طرف اشارہ کیا اور کوئی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں..... ساکت و جاہل رہ گیا۔

یہ میرا ڈالسننگ تھی۔ اس لباس اور اس انداز میں وہ جس قدر حسین لگ رہی تھی۔ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اتنی حسین عورت بلاشبہ میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی میں اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹا سکا۔

پھر جینگو کی آواز نے ہی مجھے چونکایا تھا۔ ”بڑے تعجب سے دیکھ رہے ہو نواز، کیا تم اسے پہچان نہیں سکتے۔“

میں سنبھل گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میری یہ حرکت میرے لئے فائدہ مند ہی ثابت ہوگی۔ چنانچہ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں میں نہیں پہچان سکتا۔“

”اس طرح تم ایک برائی کے مرتکب ہو رہے ہو، تم اپنی محسن کو پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔“ مکار جینگو نے کہا۔

”میری محسن؟“

”میرا ڈالسننگ۔ وہ بد نصیب عورت جو ترلو کا کے قدموں تک پہنچنے سے قبل ملعون ہو گئی۔“

”لیکن یہ میری محسن کیسے ہو گئی۔“

”میرا۔“ جینگو نے اسے آواز دی۔

”بس مسٹر جینگو۔“

”تم اسے جانتی ہو؟“

”بس مسٹر جینگو۔“ میرا نے اسی انداز میں جواب دیا اور میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ میرا کی گردن سیدھی تھی۔ وہ صرف سامنے دیکھ رہی تھی اور اس کی حسین آنکھیں پتھرائی ہوئی سی لگ رہی

”کون ہے یہ؟“

”راجہ نواز اصغر۔“ میرا نے جواب دیا۔

”گو کیا تم اسے جانتی ہو؟“

”ہاں۔ بخوبی۔“

”کس طرح مس میرا ڈالسننگ؟“

”میں اس کی مدد کر چکی ہوں۔“

”کب اور کس طرح؟“ جینگو نے بدستور مکارانہ انداز میں پوچھا۔

”اس وقت جناب جب آپ نے اسے تنہا چھوڑ دیا تھا اور اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ میں نے اسے ہوٹل میں قیام کے لئے کچھ رقم دی تھی اور اس طرح یہ آپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔“

”خوب۔ خوب۔“ جینگو آہستہ سے ہنس پڑا۔ ”کیا خیال ہے مسٹر نواز اصغر۔“

”جینگو میں اس بات سے واقف ہوں کہ تم ہیناٹ ہو اور کسی کو ٹرانس میں لا کر تم اپنی پسند کے عمل کھلواتے ہو تو یہ زیادہ مشکل کام تو نہیں ہے۔“

”خیر اگر تم اس انداز میں محسوس کرتے ہو تو یہی سہی۔ لیکن اس نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے الفاظ میں ہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر طرح سے ثبوت مل چکا ہے۔“

”میں اس سلسلے میں تم سے مزید گفتگو کرنے کو تیار نہیں ہوں مسٹر جینگو اب بتاؤ کیا چاہتے ہو؟“

”وہی تو بتانے جا رہا ہوں میرے دوست، سنو یہ لڑکی کیسی لگتی ہے تمہیں؟“

”میرے خیال میں یہ ایک مظلوم لڑکی ہے جو تمہارے گندے اور فاسد مقاصد کے لئے مجبوراً کام کر رہی ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے میں اس سے ہمدردی رکھتا ہوں۔“

”خوب۔ خوب۔ تو یہ مظلوم لڑکی آج رات تمہاری خواب گاہ کی زینت بنے گی۔“

”جینگو تم بارہا مجھے آزما چکے ہو۔ کیا تم نے میرے کردار میں کوئی لچک پائی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو..... حماقتیں کیوں کر رہے ہو۔ تم جانتے ہو میں تمہیں ذرا بھی اہمیت نہیں دیتا۔“

”دو گے۔ ضرور دو گے۔ میں جانتا ہوں اس نے اس وقت تمہاری پوری پوری مدد کی تھی جب تم اس طرح حالات کا شکار ہو گئے تھے۔ اس نے تمہیں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا اور ہمیں اطلاع دے دی تاکہ اس کی پوزیشن بھی صاف رہے۔ اس طرح اس نے کافی چالاکی کا ثبوت دیا تھا اور ہم واقعی اس کے بارے میں سوچ سکے تھے۔ اور پھر دوسری خوفناک سازش اس نے اس وقت کی جب تمہیں بے ہوش کر کے لایا جا تھا۔ اس وقت اس نے تمہیں انجکشن دیا تھا لیکن وہ نہیں جو دیا جانا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے

تمہیں پستول بھی فراہم کیا جس سے ہمارا ایک آدمی ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔ ان واقعات کے بعد تم خود ہی بتاؤ راجہ نواز امیر کہ کیا یہ کسی رحم یا رعایت کی مستحق ہے؟“

”یہ سب نری بکواس ہے، سب میرے اپنے ذرائع تھے۔“

”ایک سفید جھوٹ۔“ جینگو مسکرایا۔

”بہر حال اس کے باوجود وہ نہیں ہو سکے گا جو تم چاہتے ہو۔“

”وہی ہو گا۔ وہی ہو گا۔ دراصل اس لڑکی کے لئے سزائے موت تجویز کی گئی ہے۔ اور اگر آخری بار تم انکار کرو گے تو اسے تمہاری نگاہوں کے سامنے ہی گولی مار دی جائے گی۔“ جینگو نے کہا اور میرے بدن میں سرسراہٹیں دوڑنے لگیں۔ میرا اب بھی اسی طرح کھڑی تھی۔

مجھے اس پر شدید رحم آیا۔ بے چاری مظلوم لڑکی جو ساری زندگی کسی کے لئے اپنے آپ کو مارتی رہی۔ اور بالآخر میری وجہ سے موت کا شکار ہو رہی تھی۔ میں نے پریشان نگاہوں سے جینگو کو دیکھا۔

”لیکن ایک حل ہے۔“ چلاک جینگو جلدی سے بولا۔ ”اگر تم اسے اپنی عورت کی حیثیت سے قبول کرلو۔ اگر تم اس کو اپنا لو تو تمہارے لئے اس کی جاں بخشی کی جاسکتی ہے۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی ترکیب نہیں ہے۔ جینگو۔“

”ہرگز نہیں۔“

”لیکن ایک بات تو بتاؤ جینگو۔“

”ضرور پوچھو میرے دوست۔“

”تم مجھے اس طرف راغب کر کے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔“

”تمہارے اس احساس کو توڑنا چاہتا ہوں کہ تم کوئی پارسا انسان ہو۔ میں کہہ چکا ہوں کہ بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے وہ سب کچھ نہیں کرتا جس سے وہ بچنا چاہتا ہے کیونکہ وہ مختلف کمزوریوں کا مجموعہ ہے اور اسے مجبور ہونا پڑتا ہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”کیوں۔ کیوں نہ ہوئی۔“

”تم مجھے سخت طریقے سے مجبور کر رہے ہو۔ یہاں بھی ایک مذہبی بچت ہے اگر کسی کی زندگی بچانے کے لئے ایک برائی کرنی پڑ رہی ہے تو مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔“

”کوئی راستہ اختیار کرلو۔ میں صرف تمہارا غور توڑنا چاہتا ہوں۔“ جینگو نے کہا اور پھر خشک لہجے میں بولا۔ ”اب جواب دو، کیا ارادہ ہے۔ کیا میں اشارہ کروں کہ اس لڑکی کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے۔“

”نہیں۔“ میں نے بھاری لہجے میں جواب دیا اور جینگو کے ہونٹوں پر وہی مکارانہ مسکراہٹ جاگ

”گویا تم تیار ہو۔“

”ہاں۔“ میں نے گہری سانس لی۔

”کوئی مکاری نہیں چلے گی۔ ہم بہت باخبر ہیں۔ تمہاری ایک ایک حرکت ہماری نگاہ میں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے جینگو، لیکن میں تم سے اس بے بسی کا انتقام لوں گا۔ اس بات کو یاد رکھنا۔“

”یاد رکھوں گا وعدہ کرتا ہوں۔ آنے والا وقت دیکھو، وہ کیا کہانی سناتا ہے۔“ جینگو نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا یہ بدستور تمہارے ٹرانس میں رہے گی؟“ میں نے پوچھا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر لطف ہی کیا آئے گا۔ یہ تو باہمی تعاون کا معاملہ ہے۔ ممکن ہے وہ تم تعاون نہ کرے۔“

میرے حلق سے غراہٹیں نکلنے لگیں اور جینگو قہقہے لگاتا ہوا اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میری کسی کیفیت تھی۔ میرا ڈالسننگ اس قدر حسین نظر آرہی تھی کہ دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اس وجود اندر سے ایک آواز اٹھ رہی تھی۔ یہ گناہ ہے۔ گناہ گار زندگی میں ایک اور گناہ کا اضافہ نہ کیا جائے۔ لیکن جینگو اس بے گناہ لڑکی کو ہلاک کر دے گا۔

ایک لمحہ میرا کے منہ سے ایک خوفزدہ سی آواز نکلی۔ اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف لگی۔ اور پھر اس کی نگاہیں مجھ پر آئیں۔

”نواز۔“ اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکلی۔

”بٹھو میرا۔“ میں نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور وہ چند قدم آگے بڑھی پھر اس نے اپنے لباس کو

”سوری نواز۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”کس میں؟“

”یہ لباس میری پسند نہیں ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”کبخت۔۔۔۔۔ کبخت جینگو کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اس مومن میں شیطان چھپا ہوا ہے۔ اس نے میری قوت ارادی سلب کر لی، اور میری زبان نے سب کچھ

”مجھے معلوم ہے میرا، بٹھو۔“ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور ہر جھکا کر صوفے پر بیٹھ

”میرا مذہب قبول کرلو۔“ میں نے کہا اور میرا عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی حتمیت کھیل رہی تھی اس کا سارا وجود گلابی ہو گیا تھا۔

”تم مجھے اپنے مذہب کے قاتل پاتے ہو نواز۔“

”تمہارے اندر اگر کوئی کمی ہے تو میرا مذہب قبول کرنے کے بعد پوری ہو جائے گی۔“

”آہ کیا واقعی میں اس سعادت کے قابل ہوں۔“

”کیا تم اس بات پر تیار ہو میرا؟“

”اگر تم مجھے اس قتل سمجھو تو۔ میری اس سے زیادہ خوش بختی اور کیا ہوگی۔ آہ میں کتنی خوش
 ہوں۔“

”غیب ہوں۔“

”تو اٹھو، آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے کہا اور وہ اٹھ گئی۔ میں اسے ہاتھ روم میں لایا۔ میرے سینے میں محبت کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں عجیب سی آوازیں گونج رہی تھیں جیسے چڑیاں صبح کا گیت گارہی ہوں۔ جیسے جیسے.....

اور پھر میں نے میرا کو وضو کرنے کا طریقہ بتایا اور اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ پھر میں نے خود وضو کیا اور اس کے بعد ہم دونوں باہر آگئے۔ تب میں نے اسے کلمہ پڑھایا۔ اور میرا نے خلوص دل سے بار کلمہ پڑھ کر خدا کی وحدانیت اور رسول کے برحق ہونے کا اعتراف کیا اور مسلمان ہو گئی۔

”میں تمہارا اسلامی نام زیب النساء تجویز کرتا ہوں۔۔۔۔۔ زیب۔“ میں نے کہا اور اس کی ہنسی خوشی سے چمکنے لگیں۔

”خدا مجھے یہ نام اس لئے۔“

”زیب النساء میں خلوص دل سے تمہیں اپنے نکاح میں قبول کرتا ہوں۔ قبول کرتا ہوں۔ قبول کرتا ہوں۔“

میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میرا“ اب تم میری بیوی ہو۔“

”آہ نواز۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔“ میرا قرط مسرت سے رو پڑی۔ اور میرے سینے میں منہ چھپا کر سکنے میں نے اسے بازوؤں کے حلقے میں کس لیا تھا۔ ”آہ کس قدر خوش نصیب ہوں میں مجھے اتنا بڑا مقام مل گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”خوش نصیب تو میں بھی ہوں زمیں۔ مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا

دیر تک ہم خوشیوں میں ڈوبے رہے اور پھر میں نے کہا۔ ”زہی مذہب کے کچھ ارکان ہوتے

”مجھے بتاؤ۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”اگر تم انہیں قبول کرو گے تو میری اس سے زیادہ خوش سختی اور کیا ہوگی۔“

”ابھی تو ہمیں بہت سے کٹھن مراحل سے گزرنا ہے میرا۔ ابھی تو میں تم سے تمہاری محبت کی بہت

بڑی قیمت وصول کروں گا۔"

”میں اپنے بدن کی کھال اتار کر تمہیں دے دوں گی نواز۔ آہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری تقدیر یوں اچانک بن جائے گی۔ اس ایک لمحے کے تصور سے تو میں سو بار زندگی پا کر مرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”تو پھر میرے بارے میں بھی سن لو میرا۔ خدا کی قسم‘ جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اس میں ایک نکتہ بھی جھوٹا نہیں ہوگا۔ سچائی کی قسم میرا جو کچھ کہوں گاج کہوں گا۔ میں پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے سرائے عالمگیر کا باشندہ ہوں۔ ایک کسان کا بیٹا جسے اس کی زمین نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ زمین مجھ سے ناراض ہو گئی تھی میرا۔ تب میں نے خود کشی کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن وہاں سے نواز کے اندر شیطان نے دخول کر لیا۔ پانی کے قریب ایک نئے نواز نے جنم لیا اور میں منشیات کا ایک اسمگلر بن گیا۔ میں نے سفر شروع کر دیا میرا۔ اور اس سفر میں بے شمار لوگ میرے ہاتھوں موت کی نیند سو گئے۔ میں نے لاتعداد جوانیوں کو پاہل کیا۔ اور آج بھی میری ابروؤں روپے کی دولت بیٹکوں میں جمع ہے۔ لیکن میرے ضمیر نے کبھی سکون نہیں پایا۔ یہ سرکش ہمیشہ میری نئی ذات کا باغی رہا۔ یہاں تک کہ ایک بار پھر اس نے مجھے صاف راستوں پر لاکھڑا کیا۔ میرے دل میں مذہب کے پیار نے جنم لیا۔ میں نے اپنی ساری دولت خود پر حرام کر لی اور آوارہ گرد بن گیا اور یہی آوارہ گردی مجھے جینگو تک لے آئی۔ یہ میں ہوں میرا۔ اور اس میں سرمو جھوٹ نہیں ہے۔“

”آہ نواز۔ میرادل گواہی دیتا تھا کہ تم کوئی بڑے انسان ہو۔ تمہارا کردار معنی خیز ہے۔ میرادل گواہی دیتا تھا۔“ میرا دفور انبساط سے بے خود ہو کر بولی۔

”نواز خود کو گندی ٹالی کا کیزا سمجھتا تھا میرا۔ لیکن جس دن سے اس کے دل میں خدا جاگا اس نے خود کو بہت قیمتی تصور کیا۔ اور اب جب میں اپنی ذات کو تمہاری تحویل میں دے رہا ہوں۔ میں اپنی ذات کی قیمت وصول کروں گا میرا۔ ایک ایسی قیمت جو تمہارے تصور سے باہر ہوگی۔“

”یہ قیمت تم مجھ سے وصول کرو گے نواز۔“

”ہاں میرا تم سے۔“

”مجھے اس قاتل پاتے ہو؟“

”ہاں۔ تم وہ قیمت مجھے ادا کر سکتی ہو۔“

”تو بتاؤ کیا ہے وہ قیمت؟“

”نماز۔“

”یہ کیا ہوتی ہے؟“

”عبادت۔“

”اوہ۔ تو پھر؟“

”بد بختی سے میں نماز سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ لیکن آؤ اسے یاد کریں، اس نے ہماری کتنی بڑی مشکل حل کر دی ہے۔ تم میری پیروی کرو۔“ اور ہم دونوں قبلہ رو ہو بیٹھے جس کا تعین میں نے خود کر لیا تھا۔

اور میرے ذہن کے در پیچے کھل گئے۔ دریائے جہلم میں جس مسجد کا عکس نظر آتا ہے اس میں میں نے کئی بار نماز پڑھی تھی۔ میرے ذہن میں اس مسجد کا تصور جاگ اٹھا تھا۔ اور وہ قرآنی آیات مجھے یاد آتی چلی گئیں۔ میرا میری پیروی کر رہی تھی۔ اس طرح ہم نے شکرانے کے نفل ادا کئے اور پھر میں میرا کو لے کر جگہ عروسی میں آگیا جسے ہمارے دوست جینگو نے ترتیب دیا تھا اور اب کوئی جھجک نہیں تھی۔ حسین زہی اب میری بیوی تھی اور ان لمحات میں جو سکون تھا، جو تقدس تھا۔ وہ مجھے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ زہی بھی پر سکون تھی اور اب میرے اندر ایک نئی ذمہ داری کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔

”نواز۔“ زہی نے مجھے پکارا۔

”میری زندگی۔“ میں نے اسے خود میں جذب کر لیا۔

”اب کیا سوچا ہے نواز۔“

”بہت کچھ سوچیں گے زہی پریشان نہ ہو۔“

”نواز۔ مجھے اچانک زندگی سے محبت ہو گئی ہے، اب میرے خواب کوئی اور رخ اختیار کر گئے ہیں۔

جینگو میرا بدترین دشمن بن گیا ہے، مجھے کیا کرنا چاہئے نواز؟“

”تمہارا قیام کہاں ہے زہی؟“

”اسی عمارت میں۔“

”عمارت کی تفصیل مجھے بتاؤ۔“

”رہائشی عمارت ہے، یہ فلور پورا ان کے پاس ہے۔“

”یہ نیویارک ہے نا؟“

”ہاں۔“

”زہی! بظاہر ہمارے پاس اپنی بچت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے لیکن بہت سے معاملات خدا پر چھوڑ

جاتے ہیں۔ ہمیں حالات کا انتظار کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، میں ان کے درمیان رہوں۔“

”زہی، اس کے بعد تمہارے ساتھ کیا سلوک ہو گا؟“

”میں نہیں جانتی۔“

”کیا تم نیویارک میں کہیں روپوش ہو سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اگر چاہوں زہی تو میں بھرپور جدوجہد کر سکتا ہوں اور ان لوگوں کے زخموں سے نکل بھی سکتا۔ لیکن میں ترلوکا کو فنا کرنے کا خواہشمند ہوں۔ اور یہ جذبہ میرے ذہن میں شدید ہے۔ اس لئے ابھی عرصہ میں ان لوگوں کی قید میں رہوں گا۔“

”لیکن تم ان کے درمیان مجبور ہو نواز۔“

”میں تمہیں اپنے بارے میں بتا چکا ہوں زہی، بہر حال اتنا مجبور بھی نہیں ہوں۔ بس خود کو حالات ہمارے چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن اب میں تنہا نہیں ہوں۔“ میں نے پیار سے اسے دیکھا اور زہی مسکرا

”پھر کیا کرو گے نواز؟“

”مجھے میری بات کا جواب دو۔“

”کون سی بات؟“

”تم کسی بھی طرح چالاکی سے ان کے درمیان سے نکل جاؤ اور خود کو کہیں روپوش کر لو میں ان

”لیکن میں تمہاری طرف سے فکر مند رہوں گی۔“

”میں نے تمہیں عبادت کا طریقہ بتایا ہے۔“

”ہاں۔“

”بس عبادت کر کے میری سلامتی مانگتی رہنا۔“

”کیا تم لاس اینجلس تک جاؤ گے؟“

”ہاں جاؤں گا۔“

”اور اگر تمہیں کوئی حادثہ پیش آگیا۔۔۔۔۔؟“

”ایک سال تک میرا انتظار کرنا زہی۔ زندہ رہا تو اس دور ان ضرور لوٹ آؤں گا اور اگر اپنی اس میں کام آگیا۔ تو زہی ہمارے مذہب میں ایک گنجائش بھی ہے۔ ایک سال کے بعد تم چار ماہ اور دس دن موت کے سوگ میں گزارنا اور اس کے بعد اپنی زندگی کے لئے کوئی بہتر ذریعہ تلاش کر لینا۔ تم نکاح کر سکتی ہو۔“ میں نے کہا اور زہی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہو نواز۔“

”دراصل زہی ہمیں کبھی حقیقت کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کرنی چاہئیں۔ میں تنہا ہوں اور

میرے ساتھ صرف میرے ایمان کی قوت ہے۔ جبکہ ترلوکا کے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہو۔ لیکن میرا عزم اس وقت تک مجھے سکون سے نہ بیٹھنے دے گا جب تک کہ میں ترلوکا کو فنا نہ کروں یا خود فنا نہ ہو جاؤں۔“

”افسوس نواز میں تمہیں اس کلم سے روک بھی نہیں سکتی۔ وہ دنیا میں جس طرح بد امنی پھیلا رہا ہے جس طرح غلامتوں کو ابھار رہا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکی تباہی میں سمجھتی ہوں ہر اچھے انسان کا فرض ہے، لیکن تمہاری تنہائی کا تصور کر کے وحشت بھی ہوتی ہے۔“

”میں نے کمانا زہی تم میری فکر نہ کرو۔ یوں بھی میرا آخری فیصلہ ہے اور میں تمہیں ایک شوہر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ میری ہدایت پر عمل کرنا۔“

زہی رونے لگی اور میں دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اس نے آنسو خشک کر لئے۔ رات اپنی آخری منازل طے کر رہی تھی۔ جب سورج کی روشنی نمودار ہوئی تو اس نے مجھ سے جانے کی اجازت چاہی۔

”جینگو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صبح کو واپس اس کے پاس پہنچ جاؤں۔“ اس نے کہا۔
”ٹھیک ہے زہی تم جاؤ۔ لیکن اب تمہاری انتہائی کوشش یہی ہوگی کہ تم یہاں سے نکل کر روپوش ہو جاؤ۔“

”جب تم واپس آؤ گے نواز تو میں تمہیں کیسے تلاش کروں گی۔“
”خود تمہیں تلاش کر لوں گا۔ میں یہاں کے اخبارات میں اعلان کراؤں گا اور تم مجھ تک پہنچ جاؤ۔ لیکن زہی اب تمہیں اپنا خیال میرے لئے رکھنا ہوگا۔ تم اس انداز میں روپوش ہونا کہ کسی بھی صورت تم ان کے ہاتھ نہ لگو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

”میری جانب سے تم بے فکر رہنا نواز اور نہ ہی مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔ ہاں اگر تمہیں کوئی خطرہ محسوس ہو تو تم اپنے طور پر کوئی کارروائی کر سکتے ہو۔“

”بالکل ٹھیک، میں تم سے اسی مدد کا طالب ہوں زہی۔“ میں نے جواب دیا اور زیب النساء دیر تک آنسو بہاتی رہی۔
”افسوس نواز۔ افسوس یہ خوشی یہ بے پایاں خوشی ملی بھی تو کس قدر مختصر سے وقت کے لئے۔“

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔
”نہیں زہی یہ الفاظ اوانہ کرو بلکہ خدا سے دعا کرو یہ الفاظ مختصر نہ ہوں۔ ہاں ان میں ایک دفعہ ضرور آ رہا ہے لیکن زہی وقفے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔“

”ٹھیک ہے نواز مجھے بھروسہ ہے سچائی اتنی آسانی سے نہیں مرتی۔“ اس نے کہا اور پھر اپنا ہاتھ درست کرنے لگی۔ ”میری طرف سے مطمئن رہنا نواز اب میری زندگی کا محور صرف تم ہو۔ میں زندہ

ہوں گی تو تمہارے لئے باقی ساری باتیں میں ذہن سے فراموش کر چکی ہوں اور اب تمہارے علاوہ: میں کوئی اور احساس باقی نہیں ہے۔“

”تمہارے یہ الفاظ مجھے ہمیشہ تقویت بخشیں گے زہی۔ خدا حافظ۔“ میں نے کہا اور وہ بھی مجھے بے ہی انداز میں خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک عجیب و غریب احساس کا شکار ہو گیا۔ اچانک ہی یہ کیا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار لڑکیوں کو ٹھکرا دیا تھا جو بلاشبہ رحم کی مستحق تھیں اور انہوں نے دل سے میرے قرب کی تمنا کی تھی۔ لیکن میں تو دنیا میں کسی پر اعتبار ہی نہیں کرتا تھا اور اب جب میرے ذہن میں ایک اعتبار جاگا تھا، ایک اعتماد جاگا تھا جو مذہب کہلاتا ہے تو مذہب نے میرے اوپر ایک اور ذمہ کی سوئچ دی تھی۔ کیسی انوکھی ذمہ داری تھی وہ۔ بھلا میں اور شادی۔ یہ تصور میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی کبھی کسی منزل تک پہنچنے کی کوشش کرے گی۔

لیکن ایک منزل مل گئی تھی اور یہ منزل ایسی تھی جسے میں نے کسی مجبوری کے تحت نہیں اپنایا تھا۔ میں چاہتا تو اپنی بات پر اڑا رہتا۔ ٹھیک ہے زیب النساء نے میری مدد کی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا وجہ سے خطرے میں ڈالی تھی لیکن ہر صورت ایسی تو بے شمار لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں۔ لیکن نے کبھی کسی کی پذیرائی نہیں کی۔ میں اس کی موت بھی گوارا کر لیتا۔ لیکن اس بدلی ہوئی زندگی کو نئے نئے کی تلاش تھی اور میرے ذہن میں کچھ نئے تصورات جاگے تھے۔ ان تصورات کے سارے زندگی انداز میں گزرتی ہے یہ دیکھنا تھا۔

کافی دیر گزر گئی۔ میں انہی خیالات میں غلط و صحیح تھا کہ اس خوبصورت کمرے کا دروازہ کھلا اور بی اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی ہاتھ میں ٹرے لئے ہوئے تھا۔ خلاف معمول وہ لوگ میرے ساتھ بڑے اچھے انداز میں پیش آئے۔

”ناشتہ کیجئے جناب۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔
”شکریہ۔ جینگو کہاں ہے۔“

”موجود ہیں اور ناشتے کے بعد آپ سے ملاقات کے خواہشمند ہیں۔“ اس شخص نے جواب دیا۔
”لیکن میں اس سے کہاں مل سکتا ہوں۔“

”آپ ناشتہ کر کے تیار ہو جائیں۔ مسٹر جینگو اسی عمارت میں موجود ہیں میں آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی دیکھتے رہے پھر باہر نکل گئے۔

پھر جونہی میں ناشتے سے فارغ ہوا وہ دوبارہ پہنچ گئے۔ ”کیا آپ تیار ہیں مسٹر جینگو آپ سے ملاقات

”یہ تم نے بہت اچھا کیا جینگو۔ کیا میری ایک درخواست قبول کر لو گے؟“

”ہاں ہاں کو، میں تم سے بہت خوش ہوں۔“

”چند لمحات کے لئے میرا کو بلوادیو۔ میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تھوڑی دیر کے بعد سہی، کیا وہ بہت پسند آئی ہے تمہیں؟“

”ہاں۔“

”وہ لڑکی جنسی معاملات میں صفر تھی۔ نہ جانے کس طرح تم نے اسے بیدار کر لیا۔ بہر حال میں

میں مہار کھا دیتا ہوں۔“

”شکریہ، لیکن اسے۔۔۔۔۔“

”بلوادیو گاہ۔“

”ابھی۔ اس کے بعد ہم گفتگو کریں گے۔“

”اچھا ایک منٹ۔“ جینگو نے کہا اور پھر کرسی پر لگا ہوا ایک ٹن دبا دیا۔ چند ساعت کے بعد ایک

وازا ابھری۔

”میں مسٹر جینگو۔“

”میرا ڈالسنگ کو بھیج دو۔“

”اوکے سر۔“ جواب ملا اور جینگو نے سوئچ آف کر دیا۔ پھر وہ مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”معاشرے کا بہت کب تک تمہارے ذہن سے اتر جائے گا۔“

”جس وقت تم مجھے قائل کر دو گے۔“

”یہ کام اب ترلو کا خود کرے گا۔ میں بہت جلد تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔ اپنا کام میں انجام

دے چکا ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے، اس وقت تک کے لئے اس موضوع کو جانے دو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے

جواب دیا۔ اور اسی وقت پھر ایک کلک کی آواز سنائی دی اور جینگو نے سوئچ آن کر دیا۔ جو اس نے پہلے دبایا

تھا۔

”مسٹر جینگو۔“

”ہاں کو، کیا بات ہے۔“

”مس میرا ابھی تھوڑی دیر قبل کارلے کر کہیں گئی ہیں۔ کیا کسی کو ان کی تلاش میں بھیجا جائے۔“

”نہیں۔ جب واپس آجائیں تو ان سے کتنا مسٹر نواز سے مل لیں۔“

”بہتر جناب۔“ جواب ملا اور میرے ذہن نے خوشی کا نعروں لگایا۔ زبانی ان کے زرخے سے نکل گئی۔

میرا چہرہ مسرت سے سرخ ہو گیا تھا۔

میرا خواہش مند ہیں۔“

”چلو۔“ میں نے کہا اور ان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرے اندر بڑا اعتماد تھا اور میں اب ہر خطہ

ہممول لینے کے لئے تیار تھا۔ عمارت بے حد خوبصورت تھی۔ ہر حصہ قیمتی چیزوں سے آراستہ تھا۔

جس کمرے میں جینگو نے مجھ سے ملاقات کی وہ حسن میں بے مثل تھا وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں

بھی مسکرانے لگا۔ ویسے جینگو اپنے اسی لباس میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری جانب سے غافل تو نہیں ہو گا۔

”ہیلو نواز۔“ اس نے میرا خیر مقدم کیا۔

”ہیلو جینگو۔“

”تمہارے انداز میں نرمی نظر آرہی ہے نواز۔ بہر حال تم نے ایک اچھا فیصلہ کیا اور میں نے اس

وقت تمہیں دوستانہ ماحول میں ہی بلایا ہے۔“

”شکریہ جینگو۔“

”ہینو نواز۔“ اس نے کہا وہ ایک ایسی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس میں بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔

میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ویسے میری نگاہیں اس سسٹم کا جائزہ لے رہی تھیں جس کے تحت وہ

گولیاں برسا سکتا تھا۔ وہ سرخ دستاں اب بھی اس کے ہاتھ میں تھے جن کے دہانے اسٹین گن کی نال تھے۔

جینگو کے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھکڑوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ کافی مستعد نظر آ رہا تھا۔

”اب بھی تمہارے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی نواز۔“

”کیا مطلب؟“

”کیا تمہیں اس کا بات کا یقین نہیں ہوا کہ معاشرے کے سارے اصول فرسودہ ہیں۔ اور انسان اپنی

مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”معاشرہ اپنی جگہ درست ہے جینگو، رہی انسان کی بات تو اسکی کمزوری کے اعتراف سے مجھے انکار

نہیں۔“

”بے مقصد ضد ہے نواز، اور خاص طور سے اب تم نے مجبور ہو کر وہ سب کچھ نہیں کیا جو تم نہیں

کرنا چاہتے تھے۔“

”اب بھی وہی باتیں دہراؤ گے جینگو، کیوں نہ ان ساری باتوں کو ہمیں چھوڑ دو۔“

”چھوڑ دوں گا۔ بس یہ میری ضد تھی جو پوری ہو گئی اور اب مجھے تم سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔“

”اور میرا ڈالسنگ سے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے سارے قصور معاف کر دیئے گئے۔ میں اسی قسم کا آدمی ہوں۔ حالانکہ اس نے میرا

اعتماد کو دھوکہ دیا، لیکن وہ کام کر کے جس کی مجھے شدت سے خواہش تھی اس نے اپنے گناہ دھو دیئے ہیں

میں نے اسے خلوص دل سے معاف کر دیا۔“

”بہر حال مسٹر نواز‘ میں آپ کے اندر بہت سی تبدیلیاں پارہا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ میری کوشش کارگر رہی۔ میرا پیشہ کے لئے آپ کو دے دی گئی آپ اسے اپنے تصرف میں رکھیں۔ دراصل ہم ہر قیمت پر آپ کو چاہتے ہیں۔“

”آپ کا خیال غلط ہے مسٹر جینگو‘ میں آج بھی آپ سے‘ آپ کے مسلک سے نفرت کرتا ہوں اور آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”میرا کے سلسلہ میں۔“

”ہاں۔ اسی کا ذکر کر رہا ہوں۔“

”اوہ مسٹر نواز‘ کیا آپ اس بات سے انکار کریں گے کہ آپ نے میرا کو اس حیثیت سے قبول نہیں کیا۔“

”انکار کروں تو؟“

”اس کا انتظام بھی کر لیا گیا ہے‘ سامنے دیکھئے۔“ جینگو نے کہا اور دو سراہن دبایا اور سامنے لگے ہوئے اسکرین پر روشنی پڑنے لگی اور پھر اس روشنی میں کچھ تصویریں نظر آئیں۔ غالباً کوئی پرو جیکٹر چل رہا تھا۔ اور پھر زمینی اور میں نمایاں ہو گئے۔ ہماری ساری حرکات کی ایک خاموش فلم تیار کر لی گئی تھی۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فلم ختم ہو گئی۔ اور جینگو نے ٹھن بند کر کے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا۔

”اس فلم کی موجودگی میں تم اس بات سے انکار کرو گے۔“ اس نے سوال کیا۔

جینگو تم انتہائی احمق انسان ہو‘ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں اور تم نے میری غلطی کی جو فلم تیار کی ہے یہ بھی ایک گھناؤنا جرم ہے۔ تمہاری حماقت کا اظہار تمہاری اس مسرت سے ہوتا ہے۔ تم ایک بار پھر اس فلم کو دیکھو اور بتاؤ کیا تم دنیا کے سب سے بڑے احمق نہیں ہو۔ میں نے یہاں بھی تمہیں شکست دی ہے‘ جینگو یہاں بھی تم نے میرے ہاتھوں شکست کھائی ہے۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ جینگو کسی قدر بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

”ہاں۔ تم نے اس فلم میں میری اور میرا کی حرکات پر غور نہیں کیا یا پھر میرے مذہب کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے۔ میرا اب میرا ڈالسنگ نہیں بلکہ اب اس کا نام زیب النساء ہے‘ اور وہ میری بیوی ہے اور ہمارے مذہب میں صرف بیوی حلال ہوتی ہے اس نے میرا مذہب قبول کیا جس کا مظاہرہ تم دیکھ چکے ہو‘ اس کے بعد اس نے عہدوت کی۔ چنانچہ میں اپنے مسلک پر سختی سے کاربند ہوں اور تم نے یہاں ایک بدترین شکست کھائی ہے۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ جینگو دھاڑتا ہوا دونوں ہاتھ اپنی کرسی کے ہتھکڑیوں پر بٹخ کر بولا۔

”اور تمہیں کبھی اس کی اجازت نہیں دوں گا جینگو کہ تم میری بیوی کی کوئی ایسی فلم تیار کرو۔“

”تمہیں یہ فلم تباہ کرنا ہوگی۔“

”بکو اس مت کرو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں تم دونوں کے چیتھڑے اڑا دوں گا۔“ جینگو نے خونخوار انداز میں کہا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی کرسی کے ہتھکڑیوں پر رکھے ہوئے تھے اور بدن میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ شاید وہ بے پناہ غصے کا شکار تھا۔ اور یہی وقت تھا جب میں اپنی آخری کوشش پر عمل کرتا۔

دوسرے لمحے میں نے بیٹھے بیٹھے جینگو پر چھلانگ لگائی اور سب سے پہلے میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی کلائیوں پر جمادیئے تاکہ وہ کرسی کے ہتھکڑیوں پر ہی جھے رہیں اور اس کے بعد میں نے جمناسٹک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے جسم کو اوپر اٹھایا اور قلابازی کے سے انداز میں پلٹا۔ پھر نے اپنی دونوں ٹانگوں سے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ جینگو کرسی پر بیٹھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کی کلائیوں پر رکھے تھے اور ان کا پورا وزن جینگو کے ہاتھوں پر تھا۔ تب میں نے اپنے بدن کو دوسری جانب گردا دیا اور اپنی ٹانگوں سے جینگو کی گردن میں قہنچی بٹلی۔ جینگو کے ہاتھ میرے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں تھے اور میں دونوں ٹانگوں سے اس کی گردن دبا رہا تھا۔

جینگو انتہائی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ آزاد ہو جائے تو وہ اس بیٹھری کا سوچ آن کر دے جس سے اسٹین گن استعمال ہو سکتی تھی۔ لیکن میری یہی کوشش تھی کہ میں اسے آزاد نہ ہونے دوں۔

میری رائیں انتہائی سختی سے اس کی گردن دبا رہی تھیں اور یہ میری زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تھا جو میں انتہائی نامساعد حالات میں انجام دے رہا تھا۔ لیکن میرے اندر جو ایک روحانی قوت پیدا ہو گئی تھی بلاشبہ وہ میری معاون تھی۔

جینگو حالانکہ ایک تندرست و توانا آدمی تھا۔ لیکن اس وقت وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں سے یا اپنی گردن کو میری رائوں سے بچا نہیں پارہا تھا۔ حالانکہ اگر وہ ذرا سی بھی کوشش کرتا تو اپنے آپ کو بچا سکتا تھا۔ لیکن بہر حال یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی اور وہ صرف اپنی گردن کو جھٹکنے اور ہاتھوں کو نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں اپنی رائوں سے اس کی گردن رگڑ رہا تھا اور چند ساعت کے بعد میں نے محسوس کیا کہ جینگو کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی ہے۔

پھر جب میں نے اس کی شکل دیکھی تو خود بھی حیران رہ گیا۔ جینگو کی زبان باہر لٹک رہی تھی اور اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ میری رائوں کی گرفت میں اس نے دم توڑ دیا تھا۔ انسانیت کو آزادی دلانے والا ایک بدترین شخص موت کا شکار ہو گیا تھا۔ معاشرے کا دشمن بالآخر میرے ہاتھوں فنا ہو گیا تھا۔ میرا دل خوشی سے ٹپٹپٹا لگا۔

مجھے یقین تھا کہ ابھی تک اس کے ساتھیوں کو اس جدوجہد کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا۔ اس لئے نکل جانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن یہ فلم‘ یہ پرو جیکٹر بھی میں یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس فلم

”چوٹ لگ گئی تھی“ جواب ملا اور میں نے عجیب سے انداز میں سوچا۔ اگر کوئی میرے نزدیک ہی دو ہے تو مجھ سے بے خبر کیوں ہے۔ یا پھر۔۔۔۔۔ یا پھر اوہ۔ ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور اس نے میرے ذہن میں سنسنی سی دوڑا دی۔

کسیں ایسا تو نہیں میری بیٹائی کھو گئی ہو۔ میں اندھا تو نہیں ہو گیا۔ اس بھیاںک خیال کے ساتھ ہی بے بدن میں جھرجھری سی آگئی اور میں نے اسی زمین کا سہارا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کسیں ایسا تو نہیں میری بیٹائی کھو گئی ہو۔ میں اندھا تو نہیں ہو گیا۔ اس بھیاںک خیال کے ساتھ ہی بے بدن میں جھرجھری سی آگئی اور میں نے اسی زمین کا سہارا لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا اور آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا میں اندھا نہیں ہوں۔ کیونکہ جب آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کی علوی ہو گئیں تو مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگیں۔

خاصی کشادہ جگہ تھی جہاں میں موجود تھا۔ لیکن اس جگہ کے خدوخال واضح نہیں تھے۔ تب پھر میں آنکھیں بند ہو گئیں۔

انتہائی تیز روشنی پھیل گئی تھی۔ بالکل ایسی جیسے چھپے ہوئے سورج کو عریاں کر دیا گیا ہو اور یہ روشنی بے بائیں سمت سے آرہی تھی۔ مجھ سے ایک مخصوص فاصلے پر بے شمار لوگ موجود تھے۔

بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں۔۔۔۔۔ ایک سے ایک حسین شکل و صورت کا مالک۔ ان میں بھانت کے لوگ شامل تھے۔ ان کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں تھا لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ شاید پوری جگہ لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سب کے سب برہنہ بدستیوں میں مصروف تھے۔ چرس اور بری منشیات کا دھواں بلند ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ ان کی بوجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی رنگین فلم کا منظر نمایاں ہو گیا ہو لیکن وہ تصویریں نہیں تھیں جیتے جاگتے لوگ تھے۔ مجھ سے ان کا مخصوص فاصلہ کیوں ہے؟ میں نے سوچا۔ ان مناظر سے اب اتنا اجتناب تو نہیں برت سکتا اپنی جگہ سحرزدہ ہو کر رہ جاتا۔ یہ سب کچھ غیر اخلاقی تھا۔ لیکن اندازہ تو لگنا چاہیے۔ میں اپنی جگہ سے ان کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں ان میں۔۔۔۔۔ شامل تو نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھنے کا منہ ضرور تھا کہ مجھے دیکھ کر ان پر کیا رد عمل ہوتا ہے۔

لیکن دفعتاً میں کسی چیز سے ٹکرایا اور گرتے گرتے پچا۔ کوئی ٹھنڈی دیوار تھی۔ میں نے تھیر خیز میں اسے ٹولا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرے اور ان کے درمیان موٹے شیشے کی دیوار

روشنی میں میں نے اس دیوار کو دیکھا۔ اوپر چھت تک چلی گئی تھی اور خاصی لمبی چوڑی تھی۔ بڑا منظر تھا۔ دوسری طرف ہونے والی بدستیاں بڑی پہچان خیز تھیں۔ ہر عمر کے لوگ موجود تھے لیکن یوں ناچیسے وہ سب بیٹائی سے محروم ہوں۔ کسی کو کسی سے اجتناب نہیں تھا بلکہ وہ ایسی ایسی گھٹاؤنی حرکتیں کر

میں نے کرسی کے ہتھوں پر لگے ہوئے بنوں کو دیکھا۔ اس بن کا اندازہ نہ ہسکا جس سے پرو بیکٹر آن ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یکے بعد دیگرے سارے بن دبا دیے اور دیوار میں ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور بے شمار شعلے لپکے۔ شاید کچھ غلط بن دب گئے تھے۔ دوسرے لمحے ریشمی پردے نے آگ پکڑ لی۔ اور پھر یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ پورا کمرہ جنم بن گیا۔ میں اس جنم سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ شعلوں کی تپش مجھے جلائے دے رہی تھی پھر ہوا کا ایک جھوٹکا آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بے شمار خوفزدہ بے شمار شعلے لپکے۔ شاید کچھ غلط بن دب گئے تھے۔ دوسرے لمحے ریشمی پردے نے آگ پکڑ لی۔ اور پھر یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ پورا کمرہ جنم بن گیا۔ میں اس جنم سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ شعلوں کی تپش مجھے جلائے دے رہی تھی پھر ہوا کا ایک جھوٹکا آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بے شمار خوفزدہ آوازیں بھی۔

”آگ۔۔۔۔۔ آگ لگ گئی۔ مسٹر جینکو یہیں ہیں۔“ کسی نے کہا اور اس سے قبل کہ میں دروازے کے سامنے سے ہٹا بہت سے لوگ چیختے ہوئے میرے اوپر آ پڑے۔

☆ ☆ ☆

دھواں گہرا سیاہ دھواں میرے حلق میں بھر رہا تھا۔ لیکن میں ہوش میں تھا کسی کے ہاتھ میری ٹانگ آگئی اور وہ مجھے گھسیٹتا ہوا باہر کھینچ لے گیا۔ خوفناک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ نہ جانے کس طرح کسی کی ٹھوکر میرے سر پر پڑی اور میرے حواس تاریکیوں میں جاسوئے۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

زندگی تھی تو ہوش بھی آتا ہی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں لیکن لیکن چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ شاید رات ہے گہری سیاہ رات۔ لیکن میرے احساسات جاگ رہے تھے۔ ذہن بھی کسی لذت کا شکار نہیں تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ میں ان کے جل سے نکل نہیں سکتا تھا۔

پھر کچھ اور محسوس کیا تو اندازہ ہوا کہ اس بار۔۔۔۔۔ میرے بدن کے نیچے کوئی نرم بستر نہیں ہے بلکہ کھردری سخت زمین تھی جو خاصی ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے چاروں سمت ٹٹولا، کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن یہ سیاہ رات۔

دفعتاً مجھے ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا اور میں چونک پڑا۔ کوئی نزدیک ہی موجود تھا۔ پھر کچھ بے ہنگم مردانہ قہقہے اور اس کے بعد ایک آواز۔

”ڈارلنگ تم کتنی خوبصورت ہو“

”اوہ تم بھی تو“

”یہ ساری دنیا ہی خوبصورت ہے۔“

”ہم اس دنیا میں حسن سمیٹنے آئے ہیں۔ آؤ میرے نزدیک آ جاؤ ڈارلنگ“ مستی میں ڈوبی ہوئی آواز اور اس کے بعد کچھ اور عجیب سی آوازیں۔ کیا تاریکی میں میرے نزدیک کوئی اور بھی موجود ہے۔ میں ٹٹول ٹٹول کر اوپر اوپر دیکھنے لگا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔

رہے تھے کہ انسانیت شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر دیوار کی جانب سے توجہ ہٹا کر اپنے قید خانے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک بار پھر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ قید خانہ ایک غار کی شکل میں تھا۔ چاروں طرف ناہموار کھردری سنگین دیواریں تھیں۔ سخت پتھریلی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔

کیا یہ کارخانہ کسی پہاڑی غار میں تراشا گیا ہے، یا پھر کسی عمارت کو یہ حالت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن چٹانیں جس انداز میں بکھری ہوئی تھیں اور غار جس قدر کشادہ تھا اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ انسانی ہاتھوں کی کارگیری نہیں ہے۔ ایک بار پھر میں نے دیوار کے دوسری طرف دیکھا۔ دوسری طرف کا حصہ بھی غار ہی تھا۔ گویا اس غار میں درمیان سے شیشے کی دیوار کا حصہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہ روشنی میں نے جائزہ لیا۔ روشنی قدرتی نہیں تھی لیکن ایسی جگہوں سے پھوٹ رہی تھی جو نگاہوں سے پوشیدہ تھی۔ یہی روشنی شیشے کی دیوار سے چھن کر اسی جانب آرہی تھی۔ لیکن شیشے کی دیوار کے پیچھے کا یہ منظر اتنا گھناؤنا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے اغراض و مقاصد اور ان کے خیالات سے تو میں پہلے ہی سے واقف تھا۔ چند ایسی جگہوں پر ان کی بدکاریوں کے وہ نمونے دیکھ چکا تھا جو بہر صورت مہذب کمالاتی تھیں۔ چنانچہ جو کچھ نہ ہوتا، کم تھا۔

میں نے اس جانب سے منہ پھیر لیا۔ یہ مناظر تو میرے لیے اس وقت دلکش تھے جب میں عمل کی اس زندگی میں نہیں آیا تھا۔

چند ساعت میں وہیں کھڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ بھی مجھے دیکھ رہے ہوں گے کیونکہ شیشے کی دیوار سے روشنی چھن کر اس جگہ کو بھی منور کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں آگے بڑھ گیا۔

سوچا یہ تھا کہ ذرا اندازہ تو لگاؤں کہ میں نیویارک کے کون سے حصے میں ہوں۔ اس طویل و عریض غار کا کوئی دروازہ تو ہو گا اور دوسری بات یہ کہ یہ پہاڑیاں کس جگہ واقع ہیں۔ چنانچہ میں اس وسیع غار کے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جہاں کسی قدر تاریکی نظر آرہی تھی۔ چنانچہ میں اس حصے کے نزدیک پہنچ گیا اور میرا اندازہ درست تھا۔

وہ غار کا دہانہ ہی تھا۔ میں بے تکان اس دہانے میں داخل ہو گیا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے لیکن یہ دہانہ کہیں باہر نہیں نکلتا تھا بلکہ ایک لمبی سی سرنگ تھی جو دور تک چلی گئی تھی۔ میں اس سرنگ میں آگے بڑھتا رہا اور سرنگ خاصی لمبی ثابت ہوئی اور جس جگہ اس کا اختتام ہوا اسے دیکھ کر بھی میں حیران رہ گیا۔

ایک چوکور ہال تھا جس میں گول گول دروازے لگے ہوئے تھے اور دروازوں سے غالباً دوسری جانب جایا جاسکتا تھا۔ ہال میں چاروں طرف صوفوں کا ایک سیٹ لگا ہوا تھا۔ درمیان میں قیمتی قالین بھی بچھا ہوا تھا اور ان صوفوں پر پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھیں۔ دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک غالباً جاپانی تھا۔ تین کسی سفید ملک کے باشندے معلوم ہوتے تھے اور دو افریقی تھے۔ یہ پانچوں کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر انہوں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ بڑی قنوطیت تھی ان کی نگاہوں میں حیران میں سے جاپانی نے مسکرا کر مجھے خوش آمدید کہا۔ آئیے۔ تشریف رکھئے۔

میں نے تعجب سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر میں آہستہ سے ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ ”تشریف رکھئے۔ تکلف کیا؟“ جاپانی نے ایک بار پھر کہا اور دوسرے لوگ بھی اسی انداز میں سمٹ گئے تھے جیسے کسی مہمان کی آمد پر پذیرائی کے طور پر کیا جاتا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے الجھا پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”بد قسمتی سے ہم لوگ آپس میں متعارف نہیں ہیں“ ایک شخص نے کہا اور دوسروں نے اس کی تائید کی۔

”میں آپ لوگوں سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہم تین آسٹریلیا کے باشندے ہیں۔ یہ ہمارے دوست ہیں جن کا تعلق افریقہ سے ہے اور یہ ایشیائی ہیں۔ یعنی جاپان کے باشندے۔ میرا خیال ہے، ناموں کے بارے میں گفتگو بے سود ہے۔ ویسے آپ کا تعلق کہاں سے ہے۔“

”میں بھی ایشیائی ہوں“ میں نے جواب دیا۔

”خوب، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ تشریف رکھئے، میں ان لوگوں کے اس رویے سے حیران ہوں۔ مجھے دیکھ کر ان لوگوں کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ میں بھی بے فکری سے ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔“

”سگریٹ پیش کیا جائے؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”چرس بھرا سگریٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اوہ۔ ہم لوگوں میں سے کوئی چرس نہیں پیتا۔“

”ارے کیوں؟“ میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”ہم لوگ اپنی عمر کی وجہ سے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔“

”خوب۔ لیکن میں آپ لوگوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”ضرور۔“

”آپ لوگ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”تجسس ایک فطری چیز ہے۔ انسان ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان لینے کا خواہاں ہوتا

ہے۔ میرا نام ہلورڈ ہے۔ تیرا سا یونیورسٹی میں سے ہا پروڈیوسر ہوں۔ اور میں نے مسٹر ہلورڈ کی اس بات کو دیکھا ہے۔

جو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

”تب پھر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں مسٹر ہلورڈ؟“

”اپنا سارا فلسفہ ڈبوئے آیا ہوں اور اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اول درجے کا گدھا ہوں۔“

”خوب، کیا؟“

”اپنا سارا فلسفہ ڈبوئے آیا ہوں اور اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے آیا ہوں کہ میں اول درجے کا گدھا ہوں۔“

”خوب، کیوں؟“

”اس لیے کہ فلسفے کی تصانیف میں میں نے دنیا کو جو کچھ بتایا ہے، اس عظیم فلسفی کے چند الفاظ کے آگے پیچ ہو گیا ہے، جس کا نام ترلو کا ہے۔“

”خوب، تو آپ نے اس کی پیروی اختیار کر لی ہے؟“

”ہاں، میرے عزیز۔ انسان کو کسی فلسفے کی ضرورت کیوں نہیں ہے۔ اس کے ننھے سے ذہن کو الجھا دینا حماقت ہے۔“

”اور تہذیب کے اقدار؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس کے بارے میں ڈاکٹر ڈنہام تمہیں بتائیں گے“ اس نے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا، جو ایک معمر اور سنجیدہ شکل کا انسان تھا۔

”میرا خیال ہے مسٹر آپ کا بھی کوئی نام تو ہو گا؟“ اس نے میری جانب دیکھا۔ ”ہاں! میرا نام نواز“

”لیکن آپ کو نام کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ذہنوں کو پیچھے لے جانے میں وقت لگے گا۔“

”وقتوں کا احساس نہیں ہے؟“ میں نے جبہننے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ ساری الجھنیں خود بخود فنا ہو جائیں گی۔“

”یہاں میرا نام نواز اصغر ہے۔“

”تو میں کہہ رہا تھا کہ آئیے آپ کو عملی تجربہ کرایا جائے، آئیے“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دوسرے درجے کے بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ ایک دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس دروازے سے بھی ایک سرنگ دور تک چلی گئی تھی اور سرنگ کے دہانے پر ہوا کے سرد جھونکے ہمارے استقبال کے لیے تیار تھے۔

دہانے سے باہر ایک چھوٹا سا درہ نظر آ رہا تھا۔ جہاں عجیب و غریب جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ ان جھونپڑوں کے درمیان تنگ دھڑنگ لوگ چل پھر رہے تھے۔ ان کی داڑھیاں اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ عورتیں بھی لباس سے عاری تھیں اور خاموشی سے اپنے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف تھیں۔ کوئی کسی طرف پڑا ہوا تھا کوئی کسی طرف۔ وہ سب عامیہ انداز میں چلتے ہوئے آگے بڑھ آئے اور پھر ان میں سے

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”نام۔۔۔۔۔ میں اپنا نام بھول چکا ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے، یہی بتا دو تم اپنی عملی زندگی میں کیا تھے؟“ پروفیسر ہلورڈ نے کہا۔

”عملی زندگی میں۔۔۔۔۔ میں ایک ملک کا وزیر داخلہ تھا“ اس شخص نے جواب دیا اور میں چونک اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”چلو ٹھیک ہے، یہی بتا دو تم اپنی عملی زندگی میں کیا تھے؟“ پروفیسر ہلورڈ نے کہا۔

”عملی زندگی میں۔۔۔۔۔ میں ایک ملک کا وزیر داخلہ تھا“ اس شخص نے جواب دیا اور میں چونک اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”کیا تم نے ملک کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا تھا؟“

”یہ بات تو آپ خود سوچ سکتے ہیں جناب کہ وزیر داخلہ کے کیا فرائض ہوتے ہیں؟“

”لیکن تم نے اپنے خیالات و افکار چھوڑ کر یہ زندگی کیوں اپنائی؟“

”اس لیے کہ مجھے جو کچھ کرنا پڑا، جب میں نے اس کا تجزیہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں نے بلا وجہ ذات پر بے شمار بوجھ لاد رکھے ہیں۔ حالانکہ زندگی ختم ہو جانے کے لیے ہے۔ اگر میں بہت سارے بوجھ پر اٹھائے مرجاتا تو دنیا مجھے کیا دیتی۔ میں نے اپنا تجزیہ کیا تو محسوس ہوا کہ بہت سارے لوگ میرے اس رے کی وجہ سے تکلیف کا شکار ہوئے۔ جہی میں نے سوچا کہ کچھ نہیں ہے۔ زندگی اتنی ہی آزاد ہونی چاہیے۔ اب جب ہم خود کو پتھروں کے دور میں محسوس کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بے شمار بوجھ

ہم نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ روح کی آزادی بے حد ضروری ہے۔“

”مجھے مسٹر نواز؟“ ہلورڈ نے میری جانب دیکھ کر سوال کیا اور میں ہنس پڑا۔

”خوب یہ تو تمہارے پڑھائے ہوئے طوطے ہیں۔“

”یہ بات نہیں، میرے دوست۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”ان میں سے ہر شخص حقیقت کا متلاشی تھا اور بالآخر اس وادی میں آکر انہوں نے حقیقت پائی۔“

”گویا حقیقت اسی وادی تک محدود ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں۔ آج اس وادی میں ہے، کل پوری دنیا نروان پالے گی۔“

”آپ لوگوں نے نروان پالیا ہے؟“

”ہاں۔ آؤ آگے آؤ“ ہلورڈ نے کہا اور میں اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ یہاں میرا ذہن شدید الجھ

لیکن بہر حال میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کارخانہ کتنے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ویسے میرے ذہن میں ایک

اور تھا۔ وہ یہ کہ اب میں نیویارک میں نہیں ہوں اور راستے میں میں نے ہلورڈ سے سوال کر ہی دیا۔

”مسٹر ہلورڈ، یہ کون سا علاقہ ہے؟“

”کیلی لاس“

”ترلو کا کی جنت؟“

”ہاں۔ تم نے خود ہی اسے نام دے دیا۔ جنت کا تصور مذہب نے دیا ہے۔ لیکن اس تصور کی گہرائیوں میں دنیاوی بوجھ سے آزادی کا احساس پنہاں ہے اور جسموں کی آزادی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ہر انسان روح کا تابع ہے چنانچہ اس کی طلب روح کی آزادی ہے۔ چنانچہ ترلو کا نے اس وادی میں روح کو آزادی دی ہے۔“

”خوب۔ یہ برہنگی روح کی آزادی کی تشبیہ ہے۔“

”ہاں میرے دوست یہ سب دنیاوی بوجھ سے آزاد ہیں۔ ہماری تحریک کسی کے خلاف نہیں ہے۔ ہم تو صرف روح کو دعوت دیتے ہیں اور اگر رو میں ہم سے متاثر ہوتی ہیں تو ہم میں آلتی ہیں ورنہ نہیں۔۔۔۔۔ اس کے تو ہم خلاف ہیں۔“

وہ ایک اور غار کے نزدیک رک گیا اور پھر اس نے اشارے سے سب کو اندر آنے کے لیے کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اسی ہل میں کھڑے تھے جس کا منظر تھوڑی دیر قبل میں نے دیکھا تھا۔ فضا منشیات کے دھوئیں سے لٹی ہوئی تھی۔ جو چہرے یہاں نظر آرہے تھے وہ اتنے غیر سنجیدہ نہیں تھے لیکن اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے انہوں نے سب کچھ بھلا دیا ہو۔ تہذیب و اخلاق کی جو بے حرمتی یہاں ہو رہی تھی روح اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ایسے ایسے گھٹاؤں نے مناظر دیکھے کہ دنگ برا لگا۔ بوڑھے مفکر میرے ساتھ تھے اور اپنی دانست میں مجھے متاثر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے رک کر دو چار آدمیوں سے سوالات بھی کیے اور جو جواب ملے وہ اتنے شرمناک تھے کہ میں بیان نہیں کر سکا۔ بہر صورت میری طبیعت اندر سے متلا رہی تھی۔ میں انسانیت کی اس بے حرمتی کو برداشت نہیں کر رہا تھا اور میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات آرہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس پورے کارخانے کو آگ لگا دوں، تباہ کر دوں اس پورے ماحول کو جہاں یہ انسانیت سوز ماحول ہے۔

بہر صورت کلنی دیر تک ان لوگوں کے درمیان گھومنے پھرنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ لوگ مجھے ایک عجوبہ سمجھ کر دیکھ رہے تھے۔

”مسٹر ہارڈ۔ اس جگہ موجود لوگوں کی کیا حیثیت ہے؟“

”کوئی حیثیت نہیں۔ تم سب آزاد ہو۔ بھوک لگے تو کھانا کھاؤ۔ یہاں خوراک کا معقول بندوبست ہے۔ یہاں کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جس جگہ چاہو گھومو پھرو اور جہاں نیند آئے پڑ کر سو رہو۔ یعنی وہ تمام تر زندگی تمہارے لیے موجود ہے جو پتھروں کے دور میں تھی۔ ترلو کا کی طرف سے یہاں آنے والے کو شخص پر کسی بھی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک۔۔۔۔۔ تو کیا اس آزادی سے بد عنوانیاں نہیں پھیلتیں؟“

”پھیلتی ہیں۔ حادثے بھی ہوتے ہیں، لیکن ان حادثوں کی روک تھام بھی لوگ خود ہی کر لیتے ہیں۔ کسی کے لیے کچھ نہیں کرتا اور کیوں کرے۔ پرانے وقت کا انسان ان پابندیوں سے آزاد تھا اور آج کا انسان۔۔۔۔۔“

”لیکن دوسرے لمحے میں نے اچھل کر ہارڈ کی گردن پکڑ لی اور ہارڈ چونک پڑا۔“

”اگر یہ بات ہے ہارڈ تو اس بدلے ہوئے وقت کا لطف اٹھاؤ“ میں نے اسے شہانے پر رکھ کر زمین پر دیا اور پھر میں نے اس کی پنڈلی پر ایک خوفناک ٹھوک ماری۔ ہارڈ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ درد سے اپنے لگا۔ دوسرے لوگ بری طرح بھاگے تھے۔ میں کمر پر ہاتھ رکھے ہوئے کھڑا تھا۔

ہارڈ اپنی چیخیں نہ روک پا رہا تھا۔ وہ بے بسی سے زمین پر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ”میں اس پورے خانے کو اس کی حماقتوں کی بھٹی میں جھونک دوں گا ہارڈ۔ محسوس کرو تہذیب نے ہر شخص کے لیے کچھ نیاں ترتیب دی ہیں۔ دوسری شکل یہ ہے جو تمہارے سامنے ہے“ میں نے نفرت سے کہا اور وہاں سے لے بڑھ گیا۔

میری پریشانیاں عروج پر تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ایسا پر اسرار ماحول تھا کہ حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ میں آگے بڑھتا رہا۔ نہ جانے یہ پہاڑیاں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

بہر حال میں ان کے درمیان بھٹکتا پھرا۔ سورج چمک رہا تھا اور تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن بول کے چپے چپے میں بیسی پھیلے ہوئے تھے۔ جس کا جودل چاہتا تھا کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ لباسوں میں تھے، بہت سے لباس سے عاری۔ کوئی کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

”پھر میں نے چار نوجوانوں کو دیکھا۔ وہ آگ جلائے بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ چند ساعت تک وہ اسی طرح بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کیے کیے گے بڑھائے اور آگ میں ڈال دیے۔ لیکن جو ہونا تھا وہی ہوا تھا۔ ان چاروں کی دہشت زدہ چیخیں تھیں۔ پھر وہ دہشت سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنے اپنے ہاتھوں کو سہارا رہے تھے۔ پھر وہ ایک لے کی شکل دیکھنے لگے۔ مجھے ان کی حماقت پر ہنسی آرہی تھی۔

”کیا ہو رہا ہے بھائی؟“ میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

”کیوں تم کون ہو پوچھنے والے؟“

”جاننا چاہتا ہوں کہ کیا کر رہے تھے؟“

”کالا جادو سیکھ رہے تھے“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

”اوہ خوب۔ سیکھو۔۔۔۔۔ میں نے کہا اور وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

اب تو واقعی زندگی پر بے زاری طاری ہونے لگی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ یہاں تو

جو کچھ بھی دیکھ رہا تھا، وہ انوکھا تھا۔ ترلوکا نے اتنے اعلیٰ پیمانے پر یہ سب کچھ کیا ہوگا۔ اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

بیبیوں کی بے پناہ تعداد یہاں موجود تھی اور میں ان کے درمیان بھٹکتا پھر رہا تھا۔ سورج اب ڈھلوان پر تھا۔ ایک جگہ میں نے پھلوں اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کے انبار دیکھے۔ قرب و جوار میں کوئی نہیں تھا۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی چنانچہ میں ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہاں سے کچھ پھل اٹھا کر میں نے پیٹ کا دونخ بھرا اور وہاں سے تھوڑے فاصلے پر موجود ایک چھوٹی سی جھاڑی کے پاس جا بیٹھا۔

چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ لباس چیتھڑوں کی شکل میں بدن پر جھول رہا تھا اور چہرہ گرد آلود تھا۔ البتہ اس کے خدو خال خاصے حسین تھے۔

”ایکس ہے میرا نام“ وہ دھم سے میرے نزدیک بیٹھ گئی۔

”کیا چاہتی ہو؟“

”بدن میں اینٹھن ہو رہی ہے۔ لباس کاٹنے کو دوڑ رہا ہے۔ آہ“ اس نے اپنے بدن کا مختصر لباس

نوج کر پھینک دیا۔

”غیر مناسب جگہ آئی ہو، بھاگ جاؤ۔“

”کیوں میں ناپسند ہوں؟“

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے، کوئی اور سہی۔ ضرورت تو پوری کرنی ہی ہے“ وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ گئی۔

جنس۔ عورت، ضرورت اگر یہ شکل اختیار کر جائے تو کیا انسان جی سکتا ہے۔ درحقیقت یہ موت کو بے اثر

کرنے کی ایک سازش ہے۔ جب زندگی کی آرزو ہی مٹ جائے تو پھر موت یا زندگی کیا حیثیت رکھے گی۔

بڑے خوفناک عزائم تھے ان لوگوں کے۔

لیکن اس منحوس ماحول میں رہ کر کیا ذہن کی چولیس نہیں مل جائیں گی۔ آخر مجھے یہاں لانے کا کوئی

مقصد تو ہوگا۔ میں نے ترلوکا کے نائب کو قتل کر دیا ہے۔ کچھ تو انتقام لیا جائے گا مجھ سے۔ میں اپنے ذہن کی

اس اذیت کا کیا کروں۔

کچھ کرنا ہوگا۔ میں نے پروفیسر باورڈ کے پاؤں توڑ دیے تھے۔ اس کے لیے بھی کوئی رد عمل نہ ہوا

بڑی عجیب بات تھی۔ چنانچہ کچھ اور۔۔۔۔۔ کچھ اور۔۔۔۔۔ اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک

پھر میں نے انہی غاروں کا رخ کیا تھا۔

کسی سمت یا راستے کا تعین تو فضول تھا۔ یونہی چلتا رہا اور نہ جانے کہاں پہنچ گیا۔ پھر چند منڈ

لوہ ایک میز کے گرد بیٹھے دیکھ کر میں رک گیا اور چند ساعت کے بعد ان کے قریب پہنچ گیا۔

وہ لوگ کسی گفتگو میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر لباس بھی تھے اور وہ صاف ستھرے نظر آ رہے تھے۔

”مسٹر پلیز“ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کیا۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ چار عورتیں اور مرد تھے۔ لڑکیاں چہروں سے نفاست پسند نظر آرہی تھیں۔ ان کے چہرے بھی نرم اور صاف ستھرے

تھے۔

”جی فرمائیے“ میں نے اس شخص کو جواب دیا جس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔

”ذرا ایک مسئلہ الجھ گیا ہے، پلیز بیٹھ جائیے“ اس نے کہا اور ایک کرسی میری طرف کھسکادی۔ میں

ان سے بیٹھ گیا۔

”بات جنس پر ہو رہی تھی۔ مسٹر یا کن کا کہنا ہے کہ جنس کے لیے کچھ مخصوص محرکات درکار ہوتے

لیکن میرا خیال اس سے کچھ مختلف ہے۔ ہم اسی بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ کیا آپ ہماری راہنمائی کر

ہیں؟“

”میں نہیں سمجھا؟“

”مقصد یہ ہے کہ تہذیب کا عطیہ یعنی اخلاقی قد ریں انسان کی ترتیب دی ہوئی ہیں اور لوگوں کا خیال

بلکہ میرے چند ساتھیوں کا خیال ہے کہ جنس لباس میں دلکش ہوتی ہے اور بعض مخصوص لمحات میں

اس کی طلب محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ بھوک چاہے کسی قسم کی ہو، یکساں ہوتی ہے

جب انسان بھوکا ہو تو کسی بھی جگہ بیٹھ کر کھانا کھا سکتا ہے۔“

”میں کہتی ہوں یہ ممکن نہیں ہے“ ایک لڑکی نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

”دیکھو بیٹا، بحث نہ کرو۔ میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں۔“

”ٹھہرو“ اس نے کہا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے اپنا لباس اتار دیا اور

ان میں پڑی ہوئی میز پر لیٹ گئی۔ اس نے اس انداز میں اپنے ہاتھ پاؤں کو جنبش دی کہ بلاشبہ اگر کوئی

ت ہوتی تو ذہن پر قابو پانا مشکل تھا اور پھر وہ ایک ایک کی شکل دیکھنے لگی۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے سب کو

سو گئے گیا ہو۔ وہ سب اس کی جانب دیکھنے سے احتراز کر رہے تھے۔ تب ٹینا نے میری جانب دیکھا اور

قی ہوئی میرے قریب پہنچ گئی۔ پھر اس نے دونوں بازو آگے بڑھا دیے۔

لیکن میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور ٹینا کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی،

”آہ وہ واپس جا رہا ہے۔“

”تم ہار گئیں ٹینا“ دوسرے مرد نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔

”نہیں وہ جیت گئی۔ آہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں“ ایک نوجوان بدحواسی سے بولا اور وہ ٹینا پر ٹوٹ پڑا۔

دوسرے لوگ ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میرا دماغ بھنا گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ چیخا ہوا یہاں سے بھاگ نکلوں۔ اس وحشت خیز ماحول میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔
”خدا یا یہ کون ہیں؟ یہ کون سی نسل ہے؟ انسان اگر اس حد تک پہنچ جائے تو اس کے بعد..... اس کے بعد؟“

میں تیزی سے دوڑنے لگا۔ غاروں میں میرے دوڑنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اور پھر میں ایک دوسرے دہانے سے باہر نکل گیا۔ وہی سیاہ پہاڑیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں۔ میں وحشت زدہ دوڑتا رہا۔۔۔۔۔ دوڑتا رہا۔ نہ جانے کتنے دور نکل آیا۔ قرب وجوار میں کوئی نہیں تھا۔ میں کسی کتے کی مانند ہانپنے لگا اور پھر میں ایک جگہ زمین پر بیٹھ گیا۔

میرا سینہ دھونکنی بنا ہوا تھا۔ ذہن پھٹا جا رہا تھا۔ اگر میری کیفیت پہلے سے مختلف نہ ہوتی تو اس ماحول کو۔۔۔۔۔ اس ماحول کو میں دلکش ترین ماحول سمجھتا۔ ایک ایسی جگہ جہاں انسان زندگی کی آخری سانس بھی گزار دے لیکن اب میری ذہنی حالت بدل چکی تھی۔ اور اب یہ سب کچھ مجھے زہر مند لہجہ ہو رہا تھا۔ میں اس وحشت زدہ ماحول سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

نہ جانے کب تک میں اسی طرح نڈھال پڑا رہا اور پھر میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔ کوئی انسان ہی تھا۔ پالتی مارے دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بدن کیے بیٹھا تھا۔ میں نے اور غور سے دیکھا۔

اس کے بدن پر انتہائی مختصر لباس تھا۔ صرف نچلا بدن ڈھکا ہوا تھا۔ اوپری بدن پر ہنہ تھا۔ نزدیک ہی آگ جل رہی تھی اور وہ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ تب میں آہستہ آہستہ اٹھا اور اس شخص کی طرف چل پڑا۔

وہ اپنے گیان میں اتنا مصروف تھا کہ اسے میری آہٹ بھی محسوس نہ ہوئی۔ چند ساعت کے بعد اس نے اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھنے لگا۔ بڑا نرم چہرہ تھا۔ بے حد دلکش جدو خال۔ قد بھی خاصا ہو گا۔ چہرے پر جلال تھا۔

چند ساعت وہ مجھے دیکھتا رہا اور اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات نظر آتے رہے جیسے وہ مجھے پیار سے دیکھ رہا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ میری آمد سے بے حد مسرور ہو۔

”آؤ بیٹھو“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ بڑی پرکشش آواز تھی اس کی۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
”تھک گئے نا؟“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ہاں میں تھک گیا ہوں لیکن تم کون ہو؟“
”ایک تھکا ہوا انسان جو خاموشی کی پنہا لیے ہوئے ہے۔“

”کیا تم ہندو ہو؟“
”میں انسان ہوں۔ اور ہر انسان تھکا ہوا ہے۔ ہم اس تھکن کو کہاں لے جائیں کچھ سمجھ میں نہیں

آتا۔“

”میں نے تم سے تمہارے دھرم کے بارے میں پوچھا ہے۔“

”ہری کرشنا۔ ہری رام۔ یہی سمجھ لو۔“

”کیا تم بھی ترلوکا کے پجاری ہو؟“

”ترلوکا۔۔۔۔۔ وہ مورکھ کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ سنسار سے اکٹا گیا تو پہاڑوں میں آگھا اور اب کونہ جانے کہاں لے جا رہا ہے۔“

”اوہ تو تم اس کے مخالف ہو؟“

”ہاں میں چاہتا ہوں کہ اس پاپی کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ آگ میں بھسم کر دیا سے“ وہ دانت پیٹ کر بولا۔

”پھر تم یہاں کیوں ہو؟“

”ہری کرشنا۔ ہری رام“ اس نے غمزہ انداز میں گردن جھکالی۔

”لیکن مہاراج آپ ترلوکا کے دشمن کیوں ہیں؟“

”ارے اس نے سنسار کو دیا ہی کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہ کر سکا پاپی کسی کے لیے۔ پاپی باتیں اتنی بڑی کرتا ہے اور عمل کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایسے مورکھ کو کتے کی موت مار دینے کا حامی ہوں۔ جو سنسار میں کچھ نہ دے سکے۔ ارے ٹھیک ہے اپنا جیون ہے ہی کیا؟ سنسار نے اس جیون پر اتنے بوجھ لاد رکھے

تھیں کہ اتنا پریشان کر دیا ہے کہ من چاہتا ہے ساری دنیا بھسم ہو جائے مگر انسانوں پر سے کشت تو ہٹ انسان بے چارہ انسان۔ نجانے کب سے ظلم کی اس چکی میں پس رہا ہے۔ آہ۔۔۔۔۔ میں اس زخمی

ت کے لیے کیا کروں؟“
”لیکن ترلوکا کے بھی تو یہی افکار ہیں“ میں نے کہا۔

”ہاں افکار تو یہی ہیں۔ مگر وہ مورکھ بھی کسی کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ سارے سنسار سے لڑنا تو اس کی بات نہیں ہے۔“

”تمہاری کیفیت عجیب ہے پنڈت جی مہاراج۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا اور اس نے

نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولا:
”کیا کرو گے میرا نام پوچھ کر؟ اپنی سوچو؟ تم یہاں کیوں آئے ہو اور اب اس ماحول میں تمہارے ذہن

مالت ہے؟“
”میں تمہارا نام جانتا چاہتا ہوں۔“

”میرا نام ترلوکا ہے“ پنڈت نے جواب دیا اور میرے پورے بدن میں جیسے کرنٹ چھو گیا۔۔۔۔۔

ترلوکا ہے۔ مکاروں کا مکار ترلوکا۔۔۔۔۔ اوپر سے باتیں کیسی بنا رہا ہے۔ اس طرح اچانک اس سے

ن کر حیرت بھی ہوئی تھی اور خوشی بھی اور چند ساعت اسے گہری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ایک

خونخوار غراہٹ کے ساتھ کہا:

”ہوں۔ تو اسی لیے تم اپنی برائیاں کر رہے تھے۔“

”ہاں بالکل میں ہوں ہی اس قاتل۔ مجھے شدت سے احساس ہے کہ میں نے سنسار کو صرف کشت دیا ہے۔ کسی کے لیے بھی تو کچھ نہیں کر سکا اس سنسار میں پھر مجھے بتا میرے جینے کا فائدہ؟“

”کوئی فائدہ نہیں ہے ترلو کا لیکن تم نے جو یہ سب چکر پھیلا رکھا ہے یہ مناسب نہیں ہے۔ ہاں بتا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟“

”ہاں تو مسلا ہے۔ تیرا نام نواز اصغر ہے۔“

”ٹھیک پہچانا ترلو کا اور میں وہی ہوں جس نے جینگو کو ہلاک کر دیا تھا“ میں نے کہا۔

”موت آئی تھی سرے کی تیرے ہاتھوں مر گیا۔ جیون مرن تو ہے ہی اس سنسار میں۔ کون جانتا

کب مر جائے۔“

”میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں ترلو کا۔“

”کرو۔ ضرور کرو۔ مگر ٹھہرو۔ کیا تم میرے ساتھ میری گھما میں چلو گے؟“

”ضرور چلوں گا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔“

”تب پھر آؤ“ وہ اٹھ گیا۔ خاصا دراز قامت انسان تھا اور بڑے تو مند جسم کا مالک۔ اس کا بدن

تھا لیکن ورزشی اور گٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ میرے ساتھ اس طرح چلا

جیسے میری وہ حیثیت ہی نہ سمجھتا ہو۔ اور پھر وہ ایک وزنی چٹان کے سامنے رک گیا۔

”اسے ہٹاؤ“ اس نے کہا اور میں نے تعجب سے اس چٹان کو دیکھا جو کافی وزنی تھی اور اسے ہٹانا

از کم ایک انسان کا کام نہیں تھا۔ میں نے چونک کر ترلو کا کی طرف دیکھا۔

”دیکھ کیا رہے ہو ہٹاؤ اسے“ اس نے کہا اور میں نے چٹان پر قوت آزمائی کی لیکن چٹان ٹس

مس نہیں ہوئی تھی۔ ترلو کا ہنسنے لگا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ ”ہٹاؤ“ اب زور لگاؤ

نے ایک بار پھر کوشش کی اور چٹان آسانی سے کھسک گئی۔

اس کے عقب میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا تھا۔ لیکن اس بات پر میں سخت حیران ہوا تھا کہ ترلو

نے جو نہی میرے شانے پر ہاتھ رکھا، چٹان اپنی جگہ سے کس طرح کھسک گئی۔ میری جگہ کوئی عام اور

ذہن کا آدمی ہوتا تو بری طرح حیران ہو گیا ہوتا اور ممکن ہے وہ ترلو کا عقیدت مند بن جاتا لیکن میں نے

بھی کوئی تکنیک سمجھا تھا اور اس سے قطعی متاثر نہ ہوا۔

”ترلو کا دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ بھی ایک پتلی سی سرنگ تھی جس کے سرے پر ایک

پتھر لگا ہوا تھا۔ ترلو کا نے اس دوسرے پتھر کو خود ہی ہٹایا اور اندر سے تیز روشنی پھوٹ پڑی۔ غارتھے کہ

جتنی بھی تعریف کی جاتی، کم تھی۔ قیمتی قالینوں سے آراستہ، آرائشی سلمان کی بہتات تھی لیکن جو چیز

پہلے مجھے نظر آئی، وہ عجیب و غریب تھی۔

یہ ایک بت تھا جس کی ٹانگیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور سر نیچے تھا۔ اس کے نیچے ایک تختی پڑی

تھی اور ایک ہندو لوٹار کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں ٹھٹھک گیا اور ترلو کا ہنس پڑا۔

”یہ ہندوؤں کے بھگوان ہیں“ اس نے مسکھکہ خیز انداز میں کہا اور میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

اتنے شکل و صورت سے نام سے اور اپنے انداز سے وہ بھی ہندو نظر آ رہا تھا۔

”آؤ۔ آگے آؤ“ اس نے کہا اور پھر مجھے ایک اسٹینچو کے پاس پہنچ گیا۔ اس میں کچھ عجیب و غریب

یورینی ہوئی تھیں۔ جنہیں میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

”یہ بائبل کا ایک پاٹ ہے“ اس نے کہا اور میرے بدن میں چنگاریاں سی دوڑ گئیں۔ بلاشبہ اس میں

مل کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اور پھر دوسری کتابوں کی تشریحات پتھروں کی شکل میں کی گئی تھیں۔ لیکن ہر کتاب کا اور ہر بزرگ

کی کا مذاق اڑایا گیا تھا اور ایک جگہ میں شدت غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ میں نے ایک ایسی چیز دیکھی کہ

اس کی روح لرز اٹھی تھی۔ میں خونی انداز میں اس کی جانب بڑھا۔

”ترلو کا یہ کیا ہے؟“

”مذہب اور شاید تمہارا مذہب“ اس نے کہا اور میں غصے سے دیوانہ ہو گیا۔

”میں تجھے قتل کر دوں گا کتے۔ میں تجھے کتے ہی کی موت مار ڈالوں گا“ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے

میری قوت سے اس کے سینے پر ٹکرماری اور اس بھرپور وار سے ترلو کا کا حساب کتاب درست ہو جانا چاہیے

لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک چٹان کی طرح اپنی جگہ جما ہوا کھڑا ہے۔ پھر میں نے اس پر گھونسلوں کی

ش کردی جس قدر مار سکتا تھا میں نے اسے چاروں طرف سے مارا لیکن ترلو کا کے قدم اپنی جگہ جمنے ہوئے

۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلاتھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی چٹان سے تراشا ہوا مجسمہ اپنی جگہ کھڑا ہو۔

اپنے ہاتھوں کے درد کا احساس نہیں تھا۔ بس میں دیوانوں کی طرح اسے مار رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں

سے مارتے مارتے تھک گیا۔ پھر میں نے اس..... کے بدن سے لپٹ کر اسے گرانے کی کوشش کی لیکن بھلا

میں مجتہد بھی کہیں اپنی جگہ سے ہٹتے ہیں۔ ایک جذبہ، ایک جوش تھا جس نے مجھے اس وقت سوچ سمجھ سے

نہ کر دیا تھا اور میں بہت ساری باتیں نہیں سوچ سکتا تھا۔ بس میرا دل یہی چاہ رہا تھا کہ میں ترلو کا کو فٹا کر

لیں۔ لیکن بظاہر یہ کام آسان نہیں تھا۔

”اگر کسی مذہب کو تسلیم کرتے ہو تو میں تمہیں اس کا نام بتاؤں۔۔۔۔۔ اس کا نام ہے طاقت۔

ان ازل سے اس کا غلام چلا آیا ہے۔ جس کے بدن میں زیادہ قوت ہوئی، اس نے اپنے مقابل کو زیر کیا۔

مخرو اور حکمران رہا۔ لیکن یہ طاقت اس جیسے ہی کسی انسان کے خلاف استعمال ہو اس کا درس تہذیب اور

مذہب ہی دے سکتے ہیں۔ ہمارا اپنا ایک خیال ہے۔ وہ یہ کہ انسان کچھ بھی ہو، اسے اپنی فطرت میں آزاد

رہنے کا حق حاصل ہے اور تمام جذبے اس کی کمزوریوں کا مظہر ہوتے ہیں۔ ”آؤ میرے ساتھ آؤ“ اس نے کہا۔

لیکن میں نے نفرت سے اسے دیکھا۔

”راجہ نواز اصغر جوش و جذبات میں دیوانوں کی سی حرکتیں نہ کرو جو کچھ دیکھ چکے ہو اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرو“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں تجھے فنا کر دوں گا“ میرے منہ سے جھاگ اڑ رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کسی چیز سے کچل دیتا۔

”کرو۔۔۔۔۔ میں نے تجھے کب منع کیا ہے۔ لیکن اس وقت یہ بات کہنا جب تم یہ سب کچھ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ یوں بھی انسان کو پہلے عمل کی راہیں اختیار کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد دعوے۔ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر چکے ہو۔ اگر مزید کی خواہش ہے تو آؤ میں کھڑا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاؤں گا۔ تمہارے اندر جتنی قوتیں ہیں انہیں استعمال کرو۔ اور جب تھک جاؤ تو مجھے بتا دینا تاکہ میں تمہیں سچی اور سیدھی راہیں دکھانے کے لیے لے جاؤں۔“

”مجھے ان راہوں سے نفرت ہے ترلوکا۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں“ میں نے حقارت سے کہا۔

”نہیں میرے دوست تم واپس نہیں جاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

ترلوکا نے نرم لہجے میں کہا اور میرا ذہن دھواں دھواں ہو گیا۔

میں طاقت کے ذریعے اس شخص پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ مجھے حیرت تھی حالانکہ اس کی جسامت اتنی غیر معمولی تھی کہ میری جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوتا لیکن کم بخت نے کون سی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ میں اسے اپنی بھرپور کوشش کے باوجود ٹس سے مس نہیں کر سکا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس وقت جو صورت حال ہے اس کے تحت تھوڑی سی مکاری سے کام لینا ہو گا۔ یعنی پسپائی کا انداز اختیار کیا جائے اور اس کے بعد وقت کی تلاش میں رہا جائے۔ چنانچہ میں نے گردن جھکا دی۔ ترلوکا میرا بازو تھپتھپاتا رہا تھا۔ تب اس نے کہا:

”جذباتی نہ بنو نواز۔ آؤ بیٹھ کر باتیں کریں“ ممکن ہے ہم اپنے مسائل کا کوئی حل تلاش کر لیں۔“

”میں نے ایک گہری سانس لی۔ میرا ذہن اس کے خلاف نفرت کے لاوے سے اٹل رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ صرف جذبات ہی ہر چیز میں معاون ثابت نہیں ہوتے۔ میرے ذہن میں جو جذبہ تھا اسے بھلا کون مٹا سکتا تھا۔ لیکن اگر تھوڑی سی مصلحت سے کام لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

جو کچھ میں نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا تھا۔ میں ان سانپوں پر لعنت بھیج رہا تھا جو مذہب کی یہ توہین دیکھ کر بھی میرے سینے میں سلائی ہوئی تھیں لیکن میں خود کشی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر کچھ الفاظ میرے ذہن میں ابھر آئے۔

نمرود۔۔۔۔۔ فرعون۔ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے ایسے عظیم الشان مظاہرے کیے تھے

کہ انسانیت کانپ اٹھی تھی لیکن انہیں مہلت دی گئی تھی۔ پھر جب خدا نے ان کی رسی کھینچی تو وہ منہ کے بل پڑے ہوئے تھے۔

ممکن ہے ابھی اس کی رسی دراز ہو۔ اس لیے وقت کا انتظار کیا جائے۔ مجھے آمادہ پا کر ترلوکا کا ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”بعض فیصلے دیر سے کیے جاتے ہیں لیکن وہ مستحکم اور دیرپا ہوتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ آؤ“ اور میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”کیلی لاس کی ان پہاڑیوں میں ترلوکا نے جو جال پھیلا رکھا تھا اس کا تذکرہ تو اب طویل ہو جائے گا۔ ان پہاڑوں کو اس نے جدید ترین ملکوں کے آرائشی ایوانوں سے زیادہ سجا رکھا تھا اور ہر چیز یہاں میا تھی۔ بہر حال وہ مجھے غار کے ایک ایسے حصے میں لے گیا جو اپنی نظیر آپ تھا۔ اس قدر قیمتی ساز و سامان یہاں موجود تھا کہ دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی تھیں۔“

”بیٹھو“ اس نے ایک آرام دہ نشست کی طرف اشارہ کیا اور میں بیٹھ گیا۔ میرے انداز میں تھکن تھی۔

اس کے باوجود کہ تم جسمانی طور پر میرے مقابل نہیں ہو لیکن تمہیں تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی ایک انسان مجھے زیر نہیں کر سکتا لیکن تم میرے نزدیک میرے نائب جینگو سے بہتر ہو۔ جسے تم نے قتل کر دیا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”راجہ نواز اصغر وہ لوگ جو میرے لیے دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں میری پسند کے ہوتے ہیں میرے سامنے عیاں بھی ہوتے ہیں جیسے تمہارا ماضی۔ میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ کیا تم ان کی تصدیق کرو گے؟“

”کیا؟“ میں نے سوال کیا۔

”زیادہ طوالت میں نہیں جاؤں گا۔ تم منشیات کے اسمگلر رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”اس ضمن میں تم نروان کے تلاشی آوارہ گردوں کے درمیان بھی رہے ہو گے؟“

”ہاں۔ میں ان میں رہا ہوں۔“

”ان کے اغراض و مقاصد سے بھی واقف ہو گے۔“

”ہاں۔ لیکن ان میں سے ہر راستہ تمہاری جانب آتا ہے۔ لاس اینجلس سے کھٹمنڈو تک تمہاری لکیر

کھینچی ہوئی ہے۔“

”پھر بھی مجھے داد نہ دو گے؟“ ترلوکا نے فخر سے کہا۔

”اس لیے کہ میرے مذہب کی رو سے تم شیطان ہو“ تم نے میرے مذہب کی توہین کی ہے۔ ہم انسان کے دشمن کو معاف کر سکتے ہیں، مذہب کے دشمن کو نہیں۔“

”اس کے باوجود کہ انسان مذہب کے راستے نجات کی منزل پر نہیں پہنچ سکا۔“

”میں مسلمان ہوں ترلوکا۔ میرے مذہب میں سکون ہی سکون ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم لوگ مذہب کی تعلیمات کو فراموش کیے ہوئے ہیں۔“

”یہ ایک اندھا عقیدہ ہے اور یہ دور آنکھیں بند کرنے کا نہیں ہے“ ترلوکا نے کہا۔

”بہر حال ترلوکا۔ تم نے میرے سامنے جو مناظر پیش کیے ہیں، ان کے تحت یہ بات میرے اوپر فرض ہو گئی ہے کہ تمہیں سزا دوں۔“

ہاں۔ میں تمہارے مشن کو فنا کروں گا۔ میں اس سے منحرف نہیں ہوں کہ تمہارے سینے میں ایک محب کا جذبہ موجزن ہے۔ لیکن مذہب کی توہین کرنے والے کی حیثیت سے تم قتل کے مستحق ہو اور۔۔۔۔۔ میں تمہیں قتل کروں گا۔“

”پاگل کتے ہو“ صرف پاگل کتے۔ جاؤ۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ۔ ان پہاڑیوں میں بھٹکتے رہو۔ میں تم جیسے گندے چوہوں کو قید کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ تم اس قاتل نہیں ہو لیکن اگر اس دوران عقل آجائے تو میرے پاس چلے آنا۔ میں ایک مخصوص وقت تک تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔ لیکن اپنے دشمنوں کو میں اپنے درمیان زیادہ عرصہ تک زندہ بھی نہیں رکھوں گا۔“

”میں تم سے کسی رعایت کا طلب گار نہیں ہوں ترلوکا۔“

”فکر مت کرو۔ میں اپنے پروگرام خود منتخب کرتا ہوں۔ میں دیکھوں گا تمہاری مذہبی دیوانگی تمہیں کیا دیتی ہے۔“

”ارے طلب تو ساری پوری ہو چکی ہے۔ اب تو صرف جنت درکار ہے“ میں نے مستانہ انداز میں کہا۔ میرے ذہن میں عجیب روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور میری روح پر نور ہو رہی تھی۔ ایک ایسی بے خودی آری تھی میری ذات پر کہ بیان نہیں کر سکتا۔

”تمہیں جنت درکار ہے۔ ٹھیک ہے آؤ۔ میں تمہیں جنت میں پہنچا دوں“ ترلوکا نے کہا اور میری طرف بڑھا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ سامنے کیے اور اچانک اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے ایک سردی شعلہ نکلا اور مجھے اپنے بدن کے گرد سرد لہریں محسوس ہوئیں۔ دوسرے لمحے میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆ ☆ ☆

”ڈارلنگ جاگ بھی جاؤ۔ کب تک سوتے رہو گے۔ اٹھو بھی“ آیا۔ نسوانی آواز میرے کانوں کی گونجی اور میں چونک پڑا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی لمبی مخروطی انگلیوں کا لمس مجھے اپنے بالوں کی محسوس ہو رہا تھا اور پھر اس کا حسین آتشیں چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس کے لمبے سیاہ بال کھلے

”میں تمہیں وہی بتانے جا رہا ہوں نواز۔ ترلوکا کا بھی ایک مشن ہے۔ وہ مذہب پرست نہیں ہے لیکن محب وطن ہے۔ اسے ایشیا سے محبت ہے۔ مظلوم ایشیا جو ہمیشہ یورپ کی چکی میں پستا رہا ہے۔ غور کر نواز۔ کیا ان لوگوں نے کیا تمام یورپی اقوام نے ایشیا کو تباہ و برباد نہیں کیا ہے، کیا انہوں نے ہمیں کتوں سے زیادہ اہمیت دی ہے، کیا انہوں نے ہمیشہ ہم پر حکومت نہیں کی ہے، کیا انہوں نے ایشیا کو کھڑے ہونے کا موقع دیا ہے، یہ اقوام ہمیشہ ہم پر کاری ضرب لگاتی رہی ہیں۔ جب بھی ہم نے کھڑے ہونے کی کوشش کی، انہوں نے کبھی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر کے ہمارے گھٹنوں پر ضرب لگائی، کبھی اسرائیل تخلیق کر کے۔ نواز جو کام پورے ایشیا کو کرنا چاہیے تھا، وہ میں تمہا ان کے سینے پر بیٹھ کر انجام دے رہا ہوں۔ ہاں دیکھو، میں اپنا وطن چھوڑ کر امریکہ میں موجود ہوں۔ ان کے دل میں بیٹھ کر ان کے دماغ میں سوراخ کر رہا ہوں۔ مجھے داد نہ دو گے۔ میں اس قوم کے پاؤں توڑ رہا ہوں، میں اسے منشیات کا مریض بنا رہا ہوں۔ میں نے انہیں چرس اور گانجے کے ہتھیار سے مارا ہے۔ میں ان کے ایٹم بم ناکارہ کر رہا ہوں۔ نسلوں ہر قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ میں اس قوم میں فقیروں کی نسل پیدا کر رہا ہوں۔ سارا یورپ میری لپیٹ میں ہے۔ سفید نسلوں کے نوجوان ہری کرشنا ہری رام کے نعرے لگا رہے ہیں۔ انہیں مذہب سے نفرت ہے۔ وہ جنگلوں میں غاروں کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ بتاؤ۔ کیا یہ میرا کارنامہ نہیں ہے؟“ ترلوکا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

میں دنگ رہ گیا تھا۔ اگر صورت حال پر غور کیا جاتا تو اس کے الفاظ غلط نہیں تھے لیکن میرے سینے کا وہ سوراخ بند نہیں ہو سکتا تھا جو میرے مذہب کی توہین پر میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔

”جواب دو نواز، کیا میں پوجا کرنے کے قاتل نہیں ہوں۔ کیا میں ایشیا کا خدا نہیں ہوں؟“

”ترلوکا، اگر تم یہ جذبہ لے کر میدان میں آتے تو یہ جذبہ قاتل ستائش تھا لیکن مذہب کی توہین کا درس تو کسی مذہب نے نہیں دیا۔“

”مذہب۔ ان مذاہب نے کیا دیا ہے انسان کو۔ سوائے چند پابندیوں کے۔ ہم ان پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ہمیں ان کی افادیت کا بھی تو پتہ چلے۔“

”ہمیں تم غلط ہو۔“

”ہاں میں غلط ہوں۔ لیکن میرا یہی جذبہ میرے لیے قاتل فخر ہے۔ اگر میں بھی مذہب کے جال میں پھنس جاتا تو اپنے کام کو اس آزادی اور بے فکری سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ میں دنیا کے کسی مذہب کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ کوئی بھی مذہب نیا نہیں ہے۔ اگر مذہب اتنے ہی جامع ہوتے تو اب تک وہ انسان کو اپنے رنگ میں کیونکر نہ رنگ لیتے۔ انسان پر سکون کیوں نہ ہوتا۔ اتنے اضطراب کا شکار کیوں ہوتا؟“

”کیونکہ ہر دور میں تمہارے جیسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں ترلوکا۔ اور انسان بہر حال کمزور ذہن کا مالک ہے۔“

”ان تفصیلات کے بعد بھی تم مجھے برا انسان سمجھتے ہو؟“

تو مند آدمی جو آنکھوں ہی سے منشیات کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ ایک حور کے باہوا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کے

تھی۔ غالباً "ترلوکانے اس جنت میں جمع کرنے کے لیے یا حور بنانے کے
سر صورت یہ ساری کوششیں اس کے الجھے ہوئے ذہن کا پتہ دیتی تھیں
: ر حور سے کہنے لگا:

کیا لیکن لڑکی بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔

بہر میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے اٹھاتے ہوئے بولا:

”کیوں میں کون ہوں“ میں نے کہا۔ اس نے مجھ سے اپنا گریبان
ن اُس کے منہ پر رسید کر دیا تھا۔

بل پکڑ کر باہر آنے کے لیے کہا اور لنگور نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو کر میری اسے غار سے باہر نکال لایا۔ باہر نکالنے کے بعد میں نے

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

میں نے
 ں مار رہے ہیں۔ کیا جنت میں بھی اس قسم کے ہنگامے

میں پلٹ پڑا۔
 سر ہمیں اسنہ پر رسید کر دیا اور وہ بے اختیار الٹ گیا۔ دوسرے

نہ لیکن میں تو چاہتا ہی یہ تھا۔ میں نے ان کی مرمت
 رنج میں خوب خوب شور مچ رہا تھا۔

وہ خود فرس کوہ مسلح تھے اور ان میں سے دو نے پستول میری روکی کو چھوڑ کر اس کوہ مسلح تھے اور ان میں سے دو نے پستول میری

افرشے بھی پستول چلاتے ہیں " میں نے ہنستے

”سناؤ“ میں رکتا ہوا
”دکھی کی خلوت میں جانا
”جنت میں“

”تو کوئی۔“ کیا اور؟ کون کے ذہنوں کو ناکارہ کر رہا ہے۔ اس
”جس نے“ میں نے

میں نے بھی حسن جواب دیا۔

ہوئے تھے جن کے درمیان اس کا چہرہ کسی ٹکینے کی طرح جگمگا رہا تھا۔

پھر اس کے نرم بدن کا احساس ہوا اور میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا

ایک جگہ گاتا ہوا گول کمرہ تھا جس میں رنگیں روشنیاں متحرک تھیں

زہن سو رہا تھا لیکن صورت حال مختلف تھی۔ چنانچہ میں نے ک

سازوں کی حسین آویزیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے پریشان

جھونکے کی طرح آگے بڑھ آئی۔

”تمہاری پریشانی کی ممکن تمہارے ذہنی تردد کا پتہ دیتی ہے“ لڑکی

انھی تھیں۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”بولو اجنبی۔ کیوں پریشان ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”کون سی جگہ ہے یہ؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”جنت“۔

”اور تم حور ہوگی“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”جو کچھ بھی ہوں، تمہارے لیے ہوں۔“

”شکریہ، میں آپ کو پسند نہیں کرتا۔“

”لیکن میں تو تمہاری تقدیر میں لکھی گئی ہوں۔ چاہے تم پسند کرو یا نہ کرو۔“

”مالک کا غلط“

”کیوں؟“

”تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بالکل بھی پسند نہیں کرتا“ میں نے کہا اور لڑکی

جیسا کہ مسکراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

چہرے کی سکرابٹ اہستہ اہستہ م ہوں
 ”کس نام، اتنے ہی رے ہوں؟“

”لیا میں اسے“

”ٹھیک ہے۔ بھر میں چلی جاتی ہوں“ اس نے کہا اور عجیب سے انداز میں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”ٹھیک ہے۔ پھر میں پتی جاتی ہوں اس کے ہاں اور بیاب کے لیے ریس میں میں بہت سے

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قدم اگے نہ بڑھا رہی ہو بلکہ اس کا بدن کی جڑیں دریا سے جڑی ہوئی تھیں۔

کھسک رہا ہوں اور اب اس جنت میں میں سہارا نہ لے سکتا۔

میں چند ساعت اپنی جگہ ٹھہرا سوچا رہا۔ چرمیل کے سوچا کہ اس بات سے باہر اس دروازے پر

ہے۔ چنانچہ میں دروازے سے باہر آیا۔ مین باہر قدم رکھے ہی میں

کھڑی تھی۔

ہوئے تھے جن کے درمیان اس کا چہرہ کسی ٹکینے کی طرح جگمگا رہا تھا۔

پھر اس کے نرم بدن کا احساس ہوا اور میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک جگمگاتا ہوا گول کمرہ تھا جس میں رنگیں روشنیاں متحرک تھیں۔ حسین ترین ماحول تھا اور اس ماحول میں ذہن سو رہا تھا لیکن صورت حال مختلف تھی۔ چنانچہ میں نے ذہن جھٹکا اور میرے سر کی جنبش کے ساتھ سازوں کی حسین آوازیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔

لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے پریشان نگاہوں سے اسے دیکھا اور وہ ہوا کے جھونکے کی طرح آگے بڑھ آئی۔

”تمہاری پریشانی کی شمن تمہارے ذہنی تردد کا پتہ دیتی ہے“ لڑکی کی آواز میں نفرتی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”بولو اجنبی۔ کیوں پریشان ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”کون سی جگہ ہے یہ؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”جنت۔“

”اور تم حور ہوگی“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”جو کچھ بھی ہوں تمہارے لیے ہوں۔“

”شکریہ“ میں آپ کو پسند نہیں کرتا۔“

”لیکن میں تو تمہاری تقدیر میں لکھی گئی ہوں۔ چاہے تم پسند کرو یا نہ کرو۔“

”بالکل غلط“

”کیوں؟“

”تمہارے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بالکل بھی پسند نہیں کرتا“ میں نے کہا اور لڑکی کے

چہرے کی مسکراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔

”کیا میں اتنی ہی بری ہوں؟“

”ہاں۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر میں چلی جاتی ہوں“ اس نے کہا اور عجیب سے انداز میں چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ قدم آگے نہ بڑھا رہی ہو بلکہ اس کا بدن کسی مشینی ذریعے سے خود بخود آگے کی طرف

کھسک رہا ہوں اور اب اس جنت میں میں تمہارہ گیا تھا۔

میں چند ساعت اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس جنت کے باہر بھی تو دیکھا جائے کیا

ہے۔ چنانچہ میں دروازے سے باہر آ گیا۔ لیکن باہر قدم نکالتے ہی میں ٹھٹھک گیا۔ وہی خوبصورت لڑکی باہر

کھڑی تھی۔

لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی اور میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ شاید مجھ پر نگاہ رکھنا اس کی ڈیوٹی تھی۔

میں نے اس جنت کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ ترلوکانے یہاں بھی خاصی محنت کی تھی اور اس جگہ کو حسین تر بنانے کی کوششوں میں اس نے نجانے کیا کچھ خرچ کیا تھا۔ غالباً ”یہ پہاڑی علاقے میں یاد رہے میں کوئی ایسی جگہ تھی جو عام نگاہوں سے قطعی محفوظ تھی۔ ورنہ امریکہ جیسی جدید حکومت میں ایسی جگہ کا تعمیر کر لینا اور خاص طور سے اس شکل میں کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو، خاصا مشکل تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ حکومت نے اس جگہ کو آوارہ گردوں کی رہائش گاہ سمجھ کر نظر انداز ہی کر دیا ہو۔

بہر حال کافی محنت کی تھی ترلوکانے۔ ایسے دوسرے غار بھی نظر آ رہے تھے جس سے میں باہر نکلا تھا کی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر چل رہی تھی۔ پھر میں رک گیا۔

”سنو“ میں نے اسے آواز دی اور وہ منہ پھلائے میرے نزدیک آ گئی۔

”کب سے یہاں ہو؟“

”تقریباً تین سال سے۔“

”اپنی مرضی سے نہیں آئیں شاید۔“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”اغوا کر کے لایا گیا تھا۔“

”کیوں؟“

”یہ نہیں معلوم۔“

”تب میں سمجھ گیا۔“

”کیا سمجھ گئے؟“

”تمہارا حسن تمہارے لیے مصیبت بن گیا۔ غالباً یہاں فٹے میں ڈوبے ہوئے بیسیوں کو بھیجا جاتا ہے۔ وہ جو اس کے منکر ہوتے ہوں گے اور جنت و جہنم کے فلسفے میں پھنسے ہوں گے، یہاں بھیج کر انہیں ت کا یقین دلایا جاتا ہو گا کہ اگر وہ جنت کے طلب گار ہیں تو وہ جنت میں موجود ہے۔“

”بالکل یہی بات ہے، تمہیں کیسے معلوم؟“ لڑکی نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

”ٹھیک ہے، لیکن ترلوکا واقعی تمہارا اسحق بھی ہے۔ اسے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے تھی کہ

ڈوبے ہوئے بیسیوں اور مجھ میں فرق ہے“ میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

”آخر ہو کون تم؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”جب تم نے اپنے بارے میں مجھے کوئی تفصیل نہیں بتائی تو پھر میرے بارے میں جان کر کیا کرو

تھا۔ اور اس جنت میں ایک جنتی ایک حور کے ساتھ موجود تھا۔

لبی داڑھی والا ایک تنومند آدمی جو آنکھوں ہی سے منشیات کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ ایک حور کے پہلو میں لنگور کی حیثیت سے بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر اضطراب کے آثار ابھر آئے۔

”یہ لڑکی بھی خاصی حسین تھی۔ غالباً“ ترلوکا نے اس جنت میں جمع کرنے کے لیے یا حور بنانے کے لیے حسین لڑکیوں کو اغواء کیا ہو گا۔ ہر صورت یہ ساری کوششیں اس کے الجھے ہوئے ذہن کا پتہ دیتی تھیں لیکن لنگور مجھے دیکھ کر بے چین ہو گیا اور حور سے کہنے لگا:

”یہ کون ہے؟“ اس نے سوال کیا لیکن لڑکی بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔

میں اس کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے اٹھاتے ہوئے بولا:

”آؤ باہر آؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں میں کون ہوں“ میں نے کہا۔ اس نے مجھ سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں نے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا تھا۔

”باہر آؤ“ میں نے اس کے سر کے بال پکڑ کر باہر آنے کے لیے کہا اور لنگور نہ جانے کیوں خوفزدہ ہو گیا۔ وہ دروازے کی جانب چل پڑا تھا اور پھر میں اسے غار سے باہر نکال لایا۔ باہر نکالنے کے بعد میں نے اس کی مرمت شروع کر دی۔ لنگور بری طرح چیخ رہا تھا۔ تب دوسرے غاروں سے بھی چند دوسرے لوگ باہر نکل آئے۔ وہ سب لنگور کو پٹتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ تب ایک کونے سے ایک آدمی آگے بڑھا۔

”کیا بات ہو گئی ہے جناب۔ آپ اسے کیوں مار رہے ہیں۔ کیا جنت میں بھی اس قسم کے ہنگامے ہوتے ہیں“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور میں پلٹ پڑا۔

”جو اس مت کرو“ میں نے الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دیا اور وہ بے اختیار الٹ گیا۔ دوسرے لوگوں کو شاید غصہ آ گیا تھا۔ وہ سب مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن میں تو چاہتا ہی یہ تھا۔ میں نے ان کی مرمت شروع کر دی۔ میں اپنے سارے داؤ بیچ استعمال کر رہا تھا اور خوب خوب شور مچ رہا تھا۔ تب چند آدمی دوڑتے ہوئے اس طرف آئے۔ وہ مسلح تھے اور ان میں سے دو نے پستول میری طرف تین دیے اور دھاڑے۔

”رک جاؤ ورنہ ہم تمہیں گولی مار دیں گے۔“

”سنا بھائیو۔ تم خود کو جنت میں تصور کر رہے تھے۔ کیا فرشتے بھی پستول چلاتے ہیں“ میں نے ہنستے ہوئے انہیں مخاطب کیا جو میرے ہاتھوں سے پٹے تھے۔

”آگے بڑھو، چلو یہاں سے“ پستول والے غرائے۔

”میں تم لوگوں کو یہی بتانا چاہتا تھا۔ ترلوکا فراڈ ہے۔ وہ تم لوگوں کے ذہنوں کو ناکارہ کر رہا ہے۔ اس

گی۔ ہر صورت میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میں ترلوکا کا دشمن ہوں۔ جبکہ تم ترلوکا سے ڈرتی ہو۔ بلکہ خوفزدہ ہو۔ تم اس کے خوف سے اپنے بارے میں تفصیل بتانے سے گریز کرتی رہی ہو۔ لیکن مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ میں ترلوکا کو ختم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ بالآخر اسے قتل کر دوں گا۔“

”لیکن کیوں“ تم اس کے دشمن کیوں بن گئے ہو؟“

”اس لیے کہ وہ مذہب اور انسانیت کا دشمن ہے۔“

”دشمن“ لڑکی تعجب سے بولی۔

”ہاں کیوں“ تمہارا کیا خیال ہے اس سلسلے میں؟“

”وہ تو اپنے آپ کو سب سے بڑا محب انسانیت کہتا ہے۔“

”وہ خود جو کچھ کہتا ہے، خود بھی اس سے مطمئن نہیں ہے۔ اس نے دوسروں کو رجھانے کے لیے

جو ناک کھیلے ہیں، وہ اس کے کمزور ذہن کی دلیل ہیں۔“

”بس میں اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو نہیں کروں گی۔“

”میں اس جنت میں کب تک رہوں گا لڑکی؟“

”جب تک چاہو۔“

”اس کے بعد کہاں جاؤں گا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور لڑکی مجھ سے

نکالیں چرانے لگی۔

”مجھے کیا معلوم؟“

”خیر۔ میں تم سے پوچھ کر تمہیں اس کے عتاب کا شکار بنانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ لیکن اب

کچھ میں کروں گا، وہ مجبوری ہے۔“

”کیا کرو گے“ وہ خوفزدہ لہجے میں بولی لیکن میں نے اسے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں

ایک غار کو تاڑا اور لڑکی کو چھوڑ کر اس کی جانب بڑھ گیا۔ لڑکی پر اضطراب انداز میں تیزی سے آگے بڑھ

تھی۔

”سنو تو۔۔۔۔۔ سنو تو سہی۔“

”سناؤ“ میں رک گیا۔

”کسی کی خلوت میں جانا گناہ ہے۔“

”ترلوکا کی جنت میں گناہ ثواب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تم جا کر اسے بتا دو کہ ہلا کو خان اس کی جنت

آگھا ہے“ میں نے کہا اور تیزی سے اس سوراخ کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ جگہ بھی اس کمرے سے

نہیں تھی۔

وہی حسن سجاوٹ اور خوبصورت چیزیں یہاں بھی موجود تھیں۔ غالباً یہ بھی جنت ہی کا ایک

کی باتوں میں نہ آؤ۔
 ”چلو“ وہ سب مجھ پر پل پڑے۔ البتہ میں نے ان سے مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور پھر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ لیکن عجیب ذہن ہو رہا تھا۔ موت کا کوئی خوف نہیں تھا۔ بس مرجانے ہی کو جی چاہتا تھا اور میں سب کچھ کرنے پر آمادہ تھا۔
 ”کہاں لے جا رہے ہو تم مجھے؟“
 ”جنم میں۔“

”اوہ۔ لیکن میں ابھی چند روز جنت میں رہنا چاہتا ہوں۔“
 ”تمہارے لیے جنم ہی بہتر ہے“ وہ دانت پیس کر بولے اور میں رک گیا۔
 ”اور اگر میں نہ جانا چاہوں؟“

”تب پھر۔۔۔۔۔“ ان میں سے ایک اچانک آگے بڑھا اور اس نے میرے سر کی پشت پر پستول کے دتے سے زوردار ضرب لگائی اور میرے سر میں ستارے ٹاچ گئے۔

”جنم میں لے جانے کا یہی طریقہ سب سے عمدہ ہے“ میں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”اور اس کے بعد وہی بے نام خاموشی“ جس کے بعد ہوش آنا ضروری تھا۔ خوب آنکھ پھولی ہو رہی تھی میرے ساتھ اور اس بار بھی جب آنکھ کھلی تو ایک نیا ماحول اور نیا منظر تھا۔ بہر حال یہ سب میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

سیاہ رنگ کی بنجر پہاڑیاں جن کے کسی رخنے میں کوئی کوئل تک نہیں تھی۔ جگہ جگہ چلے ہوئے کوئلہ نما پتھر نظر آرہے تھے۔ اس سیاہی کی وجہ سے دن کی روشنی بھی تاریک تاریک سی لگ رہی تھی۔ جس جگہ میں پڑا ہوا تھا وہاں بھی کھر دے پتھروں کی زمین تھی جو میرے بدن میں جگہ جگہ گڑ گڑے تھے اور ان میں سوزش ہو رہی تھی۔ ایسی تکلیف وہ تکلیف تھی کہ میں خوفزدہ ہو کر اٹھ گیا۔ میں نے دہشت زدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔

چاروں طرف اونچے اونچے سیاہ ٹیلے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً یہ عتاب کی زمین تھی اور اب میں جنت کے بعد جنم کا نمونہ دیکھ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ترلوکا نے امریکہ کا ایک اتنا بڑا حصہ حاصل کیا ہوا تھا اور وہ وہاں اپنی من مانی حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن حکومت امریکہ اس کی جانب سے نگاہیں بند کیے ہوئے تھی۔ آخر کیوں؟

حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ خود امریکی حکومت چرس اور دیگر منشیات کی روک تھام کے لیے ایک بہت بڑا سرمایہ خرچ کر رہی تھی۔ کروڑوں روپے کی ناجائز منشیات کے ذخائر خرید کر تباہ کر دیے جاتے تھے۔ ایک طرف تو یہ کوششیں اور دوسری طرف اس کے سینے پر ترلوکا بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنی من مانی قائم کر

رکھی تھی۔ اس من مانی کے بارے میں حکومت امریکہ کو کہاں تک علم تھا؟ میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا اور۔۔۔۔۔ میں جان کر کرتا بھی کیا۔ لیکن جب۔۔۔۔۔ ترلوکا کے افکار کے بارے میں میں سوچتا تو ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔

اس شخص نے جو کہانی سنائی تھی وہ متاثر کرتی تھی۔ اگر اس نے یورپ کی نسلی برتری کو تباہ کرنے کی مہم شروع کی تھی تو یہ کوئی۔۔۔۔۔ بری بات نہیں تھی۔ بہر حال یورپین ممالک نے ایشیا پر بہت زیادتیاں کی تھیں اور ایک ایشیائی ہونے کی حیثیت سے میں اس نظریے کو تسلیم کرتا تھا۔

”لیکن ایک مذہب پرست کی حیثیت سے اس حسن بن صباح کا خاتمہ ضروری تھا۔ اس نے مذہب کی جو توہین کی تھی اس کے لیے میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ رہی مغربی نسلوں کی بات تو میرا مذہب کہتا تھا کہ برائی کو برائی سے ختم کرنا ایک بدتر نظریہ ہے۔ برائی کو اچھائی سے ختم کیا جانا چاہیے۔ مغربی ممالک میں اسلامی تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور بے شمار لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ضروری تو نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان کے لیے ہونے کی سزا دوسرے انسان کو دی جائے۔ انسان کشی کی تو مذہب میں کہیں اجازت نہیں تھی۔“

اس لیے میں ترلوکا کے نظریے کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔ وہ ایک مضبوط انسان تھا۔ ہر لحاظ سے مضبوط۔ میں تو اس کی اس جسمانی قوت سے بھی بے حد متاثر تھا۔ کبجیت فولاد کا بنا معلوم ہوتا تھا۔

ایسے وقت میں مجھے ہر اتنا یاد آیا۔ کاش وہ بھی میرے ساتھ ہوتا۔ اس انوکھے شہزادے کو میں زندگی کے کسی دور میں نہیں بھول سکتا تھا۔ ہو رہی شو کو اس نے جس انداز میں قتل کیا تھا وہ مجھے آج تک یاد تھا۔ دیر ان پہاڑوں میں مجھے بے شمار یادیں ستاتی رہیں اور پھر میں نے بڑے خلوص سے اپنے خدا سے دعا مانگی۔

”میرے معبود! میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں گناہوں کا ایک ایسا بوجھ ہوں جس سے زمین شرماتی ہوگی۔ جنت اس لیے نہیں مانگ سکتا کہ اپنی زبان کو اس قابل نہیں سمجھتا لیکن جو جذبہ میرے سینے میں ابھرا ہے اسے پورا کرنے میں میری مدد کر۔ میں اپنی زندگی کا طلب گار نہیں ہوں جو کچھ کر چکا ہوں اس کے بعد زندہ رہ کر کروں گا بھی کیا۔ حالانکہ ایک ذات میری زندگی سے اس انداز میں منسلک ہو گئی تھی کہ اس کی ذمہ داریاں بھی مجھ پر آ پڑی ہیں لیکن میں کسی کے لیے بھی اپنی زندگی مانگنا نہیں چاہتا۔ ہاں اس جذبے کو ضرور پورا ہونا چاہیے۔ مجھے اتنی زندگی چاہیے کہ موت کے بعد میں یہ سوچوں کہ زندگی میں کوئی ایک کام تو ایسا کیا اس سے دوسروں کو بھی فائدہ ہو سکتا ہے۔“

یہ سوچ اور یہ احساسات عجیب سے انداز میں میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ پھر میں خاموشی سے

ویران پہاڑوں میں خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تب میں نے ان پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ پتھر جس انداز میں نظر آ رہے تھے، وہ کچھ عجیب سا تھا۔ کوئلہ نما پہاڑیاں تھیں۔ ممکن ہے یہ کوئلہ کے پہاڑ ہوں۔ لیکن کوئلہ کی تو کانیں ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا اور پھر میں نے ایک پتھر کو کھرچا۔ سیاہ پتھر زیادہ سخت بھی نہیں تھے۔ تب ایک اور احساس میرے ذہن میں بیدار ہوا۔ شاید قرب وجوار میں کوئی آتش فشاں موجود ہے جس سے کبھی لاوا بہا ہو گا اور یوں یہ لاوا ٹھنڈا ہو کر یہ شکل اختیار کر گیا ہے۔ بہر صورت اس جغرافیائی مسئلہ سے مجھے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ یہ پہاڑیاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور اس بار مجھے یہاں تک لانے کا مقصد کیا ہے۔ چنانچہ میں سخت اور کھردرے پتھروں کے درمیان بھٹکنے لگا۔

بہت دیر تک میں گھومتا رہا۔ پہاڑی ٹیلے خشک لاد بے آب و گیاہ تھے۔ جہاں گھاس یا کسی دوسری چیز کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ دیکھنا یہ تھا کہ اس سرزمین پر لانے کے بعد ترلو کا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ میری جانب سے اب بھی بے خبر نہیں ہو گا۔ پھر جب شام جھک آئی تو یہ پہاڑیاں اور بھی ڈراؤنی ہو گئیں۔ اتنی خوفناک کہ انسان ان کے درمیان زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ان پہاڑیوں سے کوئی خوف تو نہیں محسوس ہو رہا تھا لیکن ایک عجیب سا احساس ضرور تھا۔ رات تو یہاں بڑی ہی خوفناک تھی۔ اتنا سخت اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی لیکن موسم سرد نہیں تھا۔ پتھروں سے ہوا کی رگڑ خوفناک آوازیں پیدا کر رہی تھی اور سناتے میں یہ آوازیں بے حد ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔

میں نے ایک قدرے ہموار جگہ کو منتخب کیا اور لیٹ گیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ حلق بھی سوکھ رہا تھا لیکن دن ہی میں میں..... اس صورت حال کا اندازہ لگا رہا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اب بھوک اور پیاس کا دور شروع ہو گا اور میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ یہ اذیتیں تو روح کو نکھارتی ہیں۔

اور رات کے آخری حصے میں جب بے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے ذہن کو کرید اور مجھے بہت سی قرآنی آیات یاد آ گئیں۔ میں نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میں سجدے پہ سجدے کیے جا رہا تھا۔

اور رات کی طنائیں کھنچ گئیں۔ روشنی اس تیزی سے آئی کہ میں حیران رہ گیا۔ یہ روشنی میری بند پلکوں میں در آئی تھی۔ تب میں نے آنکھیں کھول دیں اور سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر پڑی، وہ ایک سیاہ غار کا دہانہ تھا۔ ان پہاڑیوں میں یہ پہلا غار مجھے نظر آیا تھا۔

چند لمحات میں سوچتا رہا اور پھر آہستہ قدموں سے غار کی طرف چل پڑا۔ قدموں کی آوازیں سناتے میں گونج رہی تھیں اور مجھے یہ آوازیں عجیب لگ رہی تھیں۔ پھر میں غار کے دہانے پر پہنچا ہی تھا کہ اندر سے کوئی آواز ابھری۔ اور میں ٹھٹھک گیا۔ دوسرے لمحے غار سے ایک عجیب الخلقت آدمی نکل آیا۔ اس کا قدر چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ لیکن بدن کا پھیلاؤ بہت کافی تھا۔ رنگ کوئلے کی مانند سیاہ تھا اور آنکھیں سفید

اور ڈراؤنی۔ اس کے جسم پر چھ پتھرے جھول رہے تھے۔ غالباً پتلون ہی تھی جو بدن پر جھول رہی تھی اور اوپری بدن پر اس نے اونٹی کبیل کا سا کوئی لباس پہنا ہوا تھا۔ سب سے تعجب خیز چیز جو اس کے ہاتھ میں تھی، وہ پتھر کا بنا ہوا ایک ہتھیار تھا۔ ایک ٹوک دار ہتھیار، جیسا کہ انتہائی قدیم دور میں غاروں میں رہنے والے اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی اور دوسرے لمحے وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس عجیب و غریب مخلوق کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا لیکن بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ چند ساعت کے بعد اس کے ساتھ ایک ویسا ہی سیاہ فام نکل آیا لیکن اس کے لباس اور جسم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ عورت ہے لیکن اس کا پھیلاؤ بھی ویسا ہی خطرناک تھا جیسا پہلے وحشی کا تھا۔ دونوں کے چروں سے وحشت کا اظہار ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے ان دونوں نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور ایک بھیانک آواز کے ساتھ وہ دونوں نوکدار ہتھیار لے کر مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

بچاؤ کی کوشش تو ایک فطری امر ہے۔ میں ان دونوں ہتھیاروں کے وار سے بچا اور ان کے ہتھیار آپس میں ٹکرائے۔ چنگاریاں سی ٹپکیں اور عورت کے ہاتھ سے اس کا ہتھیار چھوٹ گیا۔ لیکن مرد انتہائی مضبوط تھا۔ اس نے ہتھیار سنبھال لیا اور پھر اتنی لمبی چھلانگ لگائی کہ میں حیران رہ گیا۔ اتنی موٹی جسامت کے ساتھ یہ چھلانگ اتنی خوفناک تھی۔

میں نے بڑی مشکل سے خود کو بچایا تھا اور پتھر کا وہ ہتھیار ایک چٹان پر پڑا۔ چٹان کا بہت سا حصہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس سے مرد کی خوفناک قوت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس اثناء میں عورت بھی اپنا ہتھیار سنبھال چکی تھی۔ وحشی جس قدر خوفناک نظر آ رہے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چند ہی ساعت کے بعد میری رگوں کا سرمہ بنادیں گے۔

زندگی اور موت کی یہ جنگ بے حد بھیانک تھی۔ ان لوگوں کے وجود کے بارے میں سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سب سے پہلے ان سے بچاؤ بہت ضروری تھا۔ وہ اچھل اچھل کر میرے اوپر حملہ کر رہے تھے اور میں اپنی زندگی میں سب سے زیادہ پھرتی کا اظہار کر رہا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر میں نے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا تو وہ آسانی سے میرے اوپر قابو پالیں گے۔ ابھی تک میں صرف مدافعت کر رہا تھا۔ مجھے خود کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن پیچھے پیچھے ہٹنے اچانک میری نگاہ چند پتھروں پر پڑی۔

سیاہ پتھروں میں ایک پتھر میرا ہتھیار بن گیا۔ میں ان سے دوسری طرف ہٹ گیا تاکہ وحشی میری حرکت کو سمجھ نہ پائیں اور وہ اسی طرف دوڑے لیکن میں نے انہیں لمبا چکر دیا اور جھکائی دے کر اچانک غروں کی طرف دوڑا۔ وہ بدستور میرے پیچھے تھے۔

لیکن مجھے موقع مل گیا تھا۔ میں پھرتی سے جھکا اور ایک پتھر اٹھا لیا اور پھر وہ پتھر برق رفتاری سے میرے ہاتھ سے نکلا اور عورت کے شانے پر پڑا۔ عورت کے حلق سے کسی ریچھنسی کی طرح چٹکھار نکلی

اور مرد رک گیا۔ عورت کے ہاتھ سے اس کا ہتھیار نکل گیا اور وہ اپنا شانہ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اب وہ برابر کراہ رہی تھی۔

مرد کا جوش و خروش ختم ہو گیا۔ اب وہ گوگو کے عالم میں تھا لیکن میری طرف سے غافل بھی نہیں تھا۔ جونہی میں نے دوسرا پتھر اٹھایا اس نے عورت کے قریب سے چھلانگ لگا دی۔

میرا نشانہ خالی گیا تھا اور پھر مرد نے اپنا ہتھیار پوری قوت سے مجھ پر کھینچ مارا۔ میں بھی اس کے وار سے بچ گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے اس ہتھیار پر قبضہ کر لیا۔ تقریباً پندرہ بیس سیروزنی پتھر سے بنا ہوا تھا۔

مرد اب مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اور پھر شاید اس کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ اس نے عورت کا گرا ہوا ہتھیار اٹھالیا تھا۔

دوسری طرف میں بھی اس کے مقابل آنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ چنانچہ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ میرا ذہن کسی خوف کے جذبے سے خالی تھا۔ بس ایک عجیب سا تاثر ذہن میں تھا۔ ہاں میں ایک عمدہ جنگ کے لیے تیار تھا۔

مرد نے اپنا ہتھیار سنبھال لیا اور پینترے بدلنے لگا۔ میری نگاہ اس پر جمی ہوئی تھی۔ دھننا وہ چیخا اور اس نے ہاتھ گھما دیا۔ میں نے اسے جھکائی دی اور خود بھی اس پر حملہ کر دیا۔

پتھروں کے دور کی یہ تصویر جدید طریقہ جنگ سے ناواقف تھی اس لیے میری موگری اس کی کمر چھو گئی اور اس کے حلق سے ایک دھاڑ نکلی۔ لیکن اب وہ زخمی گینڈا بن گیا تھا اس نے بل کھا کر ایک بھر پور وار کیا لیکن مجھے اس کا وار خالی دینے میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور اس بار میرا وار بے حد کاری تھا۔ میری موگری اس کی گردن پر پڑی تھی اور وہ دور تک دوڑا چلا گیا۔ پھر نیچے گر پڑا۔ اس کا ہتھیار بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دو جاگرا تھا۔

میرا سینہ دھوکنی بنا ہوا تھا۔ اس بار مجھے جتنی محنت کرنی پڑی تھی شاید میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ بڑی خوفناک جنگ تھی۔

لیکن اب اس جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ عورت کے شانے کی ضرب بھی شدید تھی اور وہ شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں نے پہلے مرد کے قریب جا کر دیکھا پھر عورت۔ کو۔ دونوں بے ہوش تھے۔ ایک لمحے کے لیے دل میں خیال آیا کہ ان دونوں کو انہی کے ہتھیاروں سے ہلاک کر دوں۔ ان کے سر پھیل دوں کیونکہ دوسری بار میں خود کو اس تجربے کے قاتل نہیں پاتا تھا۔

لیکن پھر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ بہر حال وہ انسان ہیں اور اپنی انا کی تسکین کے لیے دو انسانوں کو قتل کرنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے ان پر قابو پالیا تھا اور اب تھوڑی دیر کے لیے میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ میں یہاں سے نکل جاتا۔ ہاں یہ دوسری بات تھی کہ وہ لوگ مجھے تلاش

کرنے کی کوشش کرتے اور مجھ تک پہنچ جاتے لیکن اس کے بعد جو کچھ بھی ہوتا دیکھا جاتا۔ میں نے ان پر آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ ہیں کون اور آخر اس غار میں اور ان ویران پہاڑیوں میں کیا کر رہے تھے۔ دھننا "میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔

اگر وہ اسی غار میں رہتے ہیں تو بھوکے پیاسے تو زندہ نہ رہتے ہوں گے۔ یہ خیال میرے لیے بڑا دل خوش کن تھا۔ بھوک بہت زور کی لگ رہی تھی۔ چنانچہ اگر اسی سلسلے میں کوشش کر لی جائے تو اس میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ میں واپس اس غار کی جانب چل پڑا۔ جہاں سے یہ دونوں نکلے تھے لیکن غار کے دہانے پر پہنچ کر ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔

ممکن ہے ان جیسے کچھ اور دوسرے بھی غار میں موجود ہوں۔ خطرہ مول لیا جائے یا نہیں؟ لیکن بھوک پیاس سے بچنے کا ایک ذریعہ نظر آیا تھا تو کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھاتا۔ اگر کچھ اور لوگ بھی اندر ہوتے تو دیکھا جائے گا۔ زندگی اور موت کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے غار کے دہانے پر پہنچ کر خلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالیں۔ مقصد یہی تھا کہ اگر اندر کوئی ہو تو باہر نکل آئے۔

لیکن خاصی دیر گزر گئی اور کوئی باہر نہ آیا۔ تب میں غار کے دہانے سے اندر داخل ہو گیا۔ غار اندر سے کافی کشادہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ اندر موجود تھا۔ غار کے اندر کچھ پھل اور گوشت کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ ساری چیزیں زمین پر اس انداز میں پڑی ہوئی تھیں جیسے کسی جانور کی گھما میں ہوں لیکن بہر صورت غذا تھی۔ وہ غذا جو اس وقت میرے لیے بڑی حیثیت رکھتی تھی۔

اندر ایک بڑے برتن میں پانی بھی رکھا ہوا تھا۔ گویا ان کی زندگی کے لیے یہاں سلمان فراہم تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں ترلوکانے پالا ہو گا۔ لیکن یہ انسان نما جانور اس کے ہاتھ کہاں سے لگے اور کس طرح اس نے انہیں حاصل کیا۔ بہر حال یہ ساری چیزیں بعد میں سوچنے کی تھیں۔

گوشت کے ٹکڑے کچے تھے جو میں نہیں کھا سکتا تھا۔ البتہ پھل میں نے اٹھا لیے۔ یہ پھل بالکل تازہ نہیں تھے۔ دو تین دن پرانے معلوم ہوتے تھے لیکن اس قاتل تھے کہ انہیں کھایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں اٹھا کر کپڑوں سے صاف کیا اور کھانے لگا۔

پھل کھانے کے بعد میں نے پانی پیا۔ حالانکہ یہ ساری چیزیں میرا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا لیکن بھوک بہت بری چیز ہوتی ہے۔ میں نے پانی پینے کے بعد خدا کا شکر ادا کیا۔ بہر صورت کسی بھی انداز میں سہی لیکن اس نے میری زندگی کا ایک سلمان فراہم کیا تھا۔

ان دونوں چیزوں سے فارغ ہو کر میں نے چند ساعت سوچا اور تیزی سے غار سے باہر نکل آیا اور پھر

غار سے دور پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن دفعتاً مجھے ایک عجیب سی کھڑکھاہٹ محسوس ہوئی۔ بڑی عجیب سی آواز تھی اور اس کے بعد ایک آواز پہاڑوں میں گونجنے لگی۔ میرے قدم رک گئے تھے۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔

”ترلوکا بول رہا ہوں راجہ نواز اصغر“ اور میں حیرت سے اچھل پڑا۔ یہ آوازیں چاروں طرف سے آ رہی تھیں اور ان کی گونج بے حد پر اسرار تھی۔ میں ہک گیا۔ ”کیا حال ہے تمہارا؟“

”خوش ہوں ترلوکا“

”تم نے ان دونوں وحشیوں کو ہلاک کر دیا؟“

”نہیں۔ وہ صرف زخمی ہیں۔“

”قابل تحسین بات ہے۔ تم واقعی عجیب چیز ہو لیکن ضدی اور ناعاقبت اندیش وقت سے فائدہ نہ اٹھانے والے۔“

”ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

”میں اب بھی تمہاری طرف سے ناامید نہیں ہوں۔“

”ناامیدی بری بات ہے۔“

”کیا تم اب بھی اپنے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں کرو گے؟“

”کیوں اب کیا خاص بات ہو گئی؟“

”گویا تم ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔“

”ترلوکا تم جاہل معلوم ہوتے ہو۔ تمہاری معلومات کچھ نہیں ہیں۔ اگر تمہیں معلومات ہوتیں تو تم ضرور سوچتے کہ فرعون اور نمود تم سے کہیں زیادہ طاقتور تھے۔ لیکن بالآخر وہ فنا ہو گئے۔“

”دیوانے نہ میں فرعون ہوں اور نہ نمود۔ میرے مشن میں تو ایک جذبہ پوشیدہ ہے۔“

”لیکن میں جذبے کو شیطانی قرار دیتا ہوں۔“

”کیا تمہارے ہمارے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں ہے؟“

”ہے“ میں نے جواب دیا۔

”تب میں تم سے بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”سامنے آؤ“ میں نے کہا اور ترلوکا ہنسنے لگا۔

”تم اپنے بائیں سمت دیکھو گردن گھماؤ“ اس نے کہا اور میری گردن بے اختیار گھوم گئی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ ترلوکا میری حرکات و سکنات پر بھی نگاہ رکھتا تھا۔ ہر حال بائیں سمت کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔

”وہ دھواں دیکھ رہے ہو جو ایک پہاڑی کی چوٹی سے اٹھ رہا ہے؟“

”لوہ ہاں۔“

”اس کے نزدیک آ جاؤ۔ میں وہاں موجود ہوں“ ترلوکا نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں۔“

”تو پھر آ جاؤ۔ باقی باتیں ہمیں پہنچ کر ہوں گی“ ترلوکا نے کہا اور کھڑکھاہٹیں پھر ابھریں اور پھر اس کی آواز بند ہو گئی۔ کوئی ایسا سسٹم جس پر وہ لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اپنی آواز نشر کر رہا ہے۔ یہ اسپیکر چٹانوں میں پوشیدہ ہوں گے۔ بد بخت نے نہ جانے خود کو کیا بنانے کی کوشش کی تھی۔

ہر حال فاصلہ کافی تھا۔ لیکن اب میرے بدن میں توانائی تھی کیونکہ کھانے کو مل گیا تھا۔ چنانچہ مجھے یہاں تک پہنچنے میں دقت نہیں ہوئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں اس ٹیلے پر پہنچ گیا جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

یہ دھواں زمین کے اندر کسی غار سے بلند ہو رہا تھا اور اس کے قرب و جوار کا حصہ کافی گرم تھا۔ مجھے وہ آتش فشاں یاد آ گئے جن کے بارے میں میں نے پڑھا تھا اور پھر ترلوکا ایک چٹان کے پیچھے سے نکل آیا۔ وہی انداز۔ اس کا بدن برہنہ تھا۔ چوٹی جھول رہی تھی اور چہرے پر نری تھی۔ بڑے ہی کھنور ہو نواز اصغر! تمہاری ایک ایک اوجھ پیاری ہے سوائے اس کے کہ تم بے پناہ ضدی ہو۔

”اوہو۔ میرا خیال ہے تمہارے الفاظ میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے ترلوکا؟“

”ہرگز نہیں میرے دوست بات دراصل یہ ہے کہ تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

”تم مجھے سمجھانا کیا چاہتے ہو ترلوکا؟“ میں نے سوال کیا۔

”راجہ نواز اصغر میں جس جذبے کو اپنے دل میں رکھتا ہوں ایک ایشیائی ہونے کی حیثیت سے تمہارے دل میں بھی اتنا ہی درد ہونا چاہیے بلکہ میری تو یہ طلب تھی کہ تم میری توقع سے زیادہ میرے معلوم ثابت ہوتے لیکن تم نجانے تہذیب اور مذہب کی کون سی لکیروں کو پیٹ رہے ہو۔ بات میری بھی ٹھوس ہے۔ بس میں اس مذہب کو نہیں مانتا جسے رائج ہوئے زمانے ہو گئے اور وہ انسان کے ذہن میں کوئی نمایاں نقش نہ چھوڑ سکا۔“

”بات وہیں پہنچ جاتی ہے ترلوکا کہ مذہب نے تو بہت ساری تعلیمات دی ہیں۔ اب کچھ لوگ انہیں مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے۔ کچھ ان سے پہلو تھی کرتے ہیں کچھ ان کی پیروی کرتے ہیں۔ جو پیروی کرتے ہیں وہ اچھے انسان کہلاتے ہیں اور جو اس سے پہلو تھی کرتے ہیں وہ ہر صورت دنیا میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔ ان حالات میں مذہب تو برے نہ ہوئے اور مذہب کو لانے والے ہر صورت عظیم تھے اور عظیم رہیں گے۔“

”خیر کچھ بھی ہو“ میرا ایک دوسرا مشن بھی ہے۔ اگر تم صرف اسے نگاہ میں رکھ کر میرا ساتھ دو تو کوئی حرج ہے“ میرا خیال ہے اس مشن کے سلسلے میں تم اتنے وہمی بھی نہ ہو گے۔“

”تم بدستور لکیر پینٹے جا رہے ہو ترلوکا۔ ہاں میں تمہیں ایک پیکش کرتا ہوں۔“

”ہاں ہاں میں یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے کوئی پیشکش کرو اور بلاخر میں تمہیں اپنا ہم نوا بنالوں۔“
”میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں ترلوکا کہ اس سارے کارخانے کو ختم کر دو اور اپنے آپ کو اسی دنیا کا ایک انسان بناؤ!“

”اور میری تحریک کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
”فرسودہ لچر بے ہودہ“ میں نے جواب دیا۔
”حالانکہ تم اعتراف کر چکے ہو۔“

”کس بات کا؟“
”یہی کہ اس طویل سفر میں تم نے بے شمار انسانوں کو میرا ہمنوا اور عقیدت مند پایا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ تحریک فٹا ہو سکتی ہے؟“
”ہاں ترلوکا۔ تاریخ گواہ ہے بہت کچھ ہوا ہے لیکن کچھ باقی نہیں رہا ہے۔“
”لیکن میں باقی رہوں گا۔“

”نہیں ترلوکا تم بھی باقی نہیں رہو گے۔ تم نے اپنی ذات کی قوت سے یہ سب کچھ نہیں کیا ہے، پہاڑوں میں لاؤڈ اسپیکر پوشیدہ ہیں۔ تم نے جدید ترین بنیادوں پر طلسمی جال پھیلایا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے تم جن چیزوں کی افادیت کو خود تسلیم کرتے ہو انہیں سے اجتناب بھی کرتے ہو۔“
”میں بتا چکا ہوں کہ زہر کو زہر سے مارا جاتا ہے۔“

”بہر حال مجھ سے اب اور کیا چاہتے ہو؟“
”فیصلہ کرنا چاہتا ہوں“ ترلوکا نے گہری سانس لے کر کہا۔
”کیسا فیصلہ؟“

”تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟“ اس نے کہا اور میں بغور ترلوکا کو دیکھنے لگا۔ اور اچانک میرے بدن میں سرسولٹ ابھر آئیں۔ خیال میرے ذہن میں طوفان بن گیا تھا۔ میری آنکھوں سے آگ ابل پڑی تھی۔
”اگر میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔؟“
”ایک لمحے کے لیے میری حالت غیر ہو گئی۔ میں کانپ سا گیا۔ ترلوکا شاید مجھ پر غور کر رہا تھا۔ اس کے چہرے میں بھی کوئی تبدیلی ہوئی۔“

”کیا ہوا تمہیں کیا بات ہے؟“
”تم۔ تم شاید مجھ پر اپنی ذہنی قوتیں آزار رہے ہو ترلوکا۔ تم اپنے پٹانزم کی قوت سے میرے ذہن کو متاثر کر رہے ہو۔ میں نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ میں بے پناہ نروس کا اظہار کر کے اپنے اس جوش اور اضطراب کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا جو ایک تصور سے میرے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔“
ترلوکا بے خیالی میں اس غار کے دہانے کے بالکل قریب کھڑا ہوا تھا اور جس سے دھوئیں کے غٹ

کے غٹ ابل رہے تھے۔ اگر میری ایک بھرپور کوشش اسے غار کے دہانے میں گرا دے تو۔۔۔۔۔ تو اور اس خیال نے مجھے بے پناہ اضطراب کا شکار کر دیا تھا۔
”کیا محسوس کر رہے ہو نواز؟“

”لیکن میں تم سے تعاون نہیں کروں گا۔“ میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔
”اگر کوئی قوت تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنے کو ابھار رہی ہے نواز تو اس جذبے کو دہانے کی کوشش مت کرو۔“

”لیکن ترلوکا! میں مذہب کی توہین برداشت نہیں کر سکتا“ میں نے کمزور آواز میں کہا۔ میں بدستور بے چینی کا اظہار کر رہا تھا اور اس طور جائزہ لے رہا تھا کہ میری پہلی ہی کوشش کیسے کارگر ہو سکتی ہے۔
”نہ کرو ابھی۔ میں تمہیں ابھی اس جگہ نہیں لے جاؤں گا جہاں میں نے اپنے افکار کی تشکیل کی ہے لیکن آہستہ آہستہ تمہارا ذہن ان تمام چیزوں کا عادی ہو جائے گا۔ جو میرے افکار میں شامل ہیں اور اس وقت اگر تمہارا ذہن اس طرف راغب ہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ لیکن سنو، تم صرف ان لوگوں کو ان کے مذہب سے بھٹکاؤ گے جو تمہارے ہم مذہب نہ ہوں۔ اتنی آسانی میں تمہیں فراہم کر سکتا ہوں۔ کم از کم اس سے میرے مشن کا ایک حصہ ہی پورا ہوتا ہے۔“
”کیا تم مجھے غور کرنے کا موقع دو گے ترلوکا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں! یقیناً“ وہ بولا ”تمہاری بے پناہ صلاحیتیں میرے لیے اس قدر دلکش ہیں کہ میں اب تک تمہاری ہر قسم کی حرکتیں اور زیادتیاں برداشت کر رہا ہوں۔ اپنے مقصد کے انسان کی تلاش میں بجائے اس کے کہ میں کہیں اور بھٹکوں میں چاہتا ہوں کہ تم ہی میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جاؤ اگر تم میرا ساتھ دینے آمادہ ہو جاؤ تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اتنی خوبصورت زندگی دوں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”اور جو کچھ میں نے کیا اس کا تصور ترلوکا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اتنی بھرپور چھلانگ لگائی کہ ترلوکا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ غالباً ایک لمحے کے لیے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ میں کیوں اچھلا ہوں۔
میں میری دونوں ٹانگیں جب بھرپور قوت کے ساتھ اس کے گھٹنوں پر پڑیں تو وہ لڑکھڑا گیا۔ غالباً اسے بھی رازہ نہیں رہا تھا کہ غار کا دہانہ کتنی دور ہے۔ اس کے علاوہ وہ اس انداز میں کھڑا ہوا تھا کہ اس کی جسمانی قوت اس وقت کارگر نہیں تھیں۔ ورنہ اگر وہ ذرا بھی جم کر کھڑا ہو جاتا تو شاید میری یہ فلائنگ گگ اسے شش بھی نہ دے سکتی تھی۔ وہ اتنا ہی طاقتور آدمی تھا لیکن اول تو گھٹنوں کا جوڑا اور پھر ایسی قوت جسے میں صرف اپنی جسمانی قوت نہیں کہہ سکتا تھا اس کے گھٹنوں سے نکل رہی اور وہ لڑکھڑا گیا۔ دوسرے لمحے وہ اچھلا اور ڈھواں اگلے ہوئے غار میں جا پڑا۔ ترلوکا کی بھیانک چیخ کافی دور تک سنائی دی تھی اور غار کے اگلے ہوئے میں ایک لمحے کے لیے ہلکا سا اضافہ ہوا اور میں نے اس دھوئیں میں زرد زرد شعلے بھی شامل دیکھے

میرا پورا جسم مسرت اور خوشی سے لرزے لگا تھا۔ میں خوشی سے کانپ رہا تھا۔ اس کی موت اسے یہاں لائی تھی اور بلاشبہ ہر فرعون کا اختتام موجود ہے۔ چند ساعت تو میں گوگو کے عالم میں کھڑا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ترلو کا اپنی مخصوص مسکراہٹ اور نرم آواز کے ساتھ اس غار سے باہر آئے گا لیکن آتش فشاں کا دہانہ تھا جس کی تپش دور دور تک محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور میں نے دہانے میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن دھوئیں کے مرغولے میرے حلق اور ناک میں کھس گئے اور میں یکدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اب مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اس غار میں گرنے کے بعد زندگی کا تصور صرف ایک احمقانہ خیال ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جوش مسرت سے ان واویلوں میں قہقہے لگاتا پھروں لیکن میری ذہنی حالت قابو میں نہیں تھی۔ چنانچہ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ کہیں میری دیوانگی مجھے بھی ترلو کا کے پیچھے اس غار میں نہ لے جائے۔ میرے حواس قابو میں نہیں تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ پھر میری آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ میرے معبود! میرے معبود! میں سجدے میں گر پڑا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہتے رہے۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں سجدے میں پڑا رہا۔

میرے ذہن و دل کو جس سکون کا احساس ہو رہا تھا میں بیان نہیں کر سکتا۔ دریائے جہلم کی لہروں کا شور میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ سروسوں کے کھیتوں سے سروسوں کی خوشبو میرے ذہن کے گوشے گوشے میں سرایت کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری ماں نے مجھے معاف کر دیا ہو۔ اور گھنٹوں اسی طرح گزر گئے۔ مجھے تعجب تھا کہ مجھے شادی مرگ کیوں نہیں ہو گیا۔ میں اسی طرح سجدے کے عالم میں کیوں نہ مر گیا۔ میں مرجانا چاہتا تھا تاکہ دنیا میں جا کر اور گناہ نہ کروں۔ میرے معبود میرے معبود! پھر دل کو ڈھارس ہوئی۔ ایک آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور یہ آواز یہ آواز میرا ذالسننگ کی تھی۔ یہ آواز میری بیوی زیب النساء کی تھی جو یقیناً "نمازیں پڑھ کر میری کامیابی کی دعائیں مانگ رہی ہوگی۔"

ہاں مجھے مرنا نہیں چاہیے، میری بیوی میری خھر ہے۔ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں۔ میں ایک شریف انسان کی حیثیت سے زندگی بسر کروں گا۔ ایک ایسی زندگی جس میں میرا گھر ہوگا، میری بیوی ہوگی، میرے بچے ہوں گے۔

ترلو کا فنا ہو چکا ہے اور میں نے اس گھناؤنے انسان کو ختم کر دیا ہے جس سے پوری انسانیت کو خطرہ تھا۔

لیکن اب میرے احساسات جاگے۔ ترلو کا کی گمشدگی کو محسوس کر لیا جائے گا اور کہیں اس کے بیروؤں کو اس کی موت کا علم نہ ہو جائے۔ اس لیے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ لیکن ان پہاڑیوں کے درمیان سے نکلنے کا راستہ، قدرت میری راہنمائی کر رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا خدا مجھ سے خوش تھا۔ فوراً ہی میرے ذہن میں اس چٹان کا خیال آیا جس کے عقب سے ترلو

کل کر آیا تھا۔

اور میں دہانے کا لمبا چکر کاٹ کر اس چٹان کے پیچھے پہنچ گیا۔ زمین میں ایک سوراخ تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو چند سیڑھیاں نظر آئیں اور میں سوراخ میں اتر گیا۔ سیڑھیوں نے مجھے ایک سرنگ میں پہنچا دیا اور میں اس تاریک غار میں چلتا ہوا بالآخر ایک کشادہ غار میں پہنچ گیا۔

غار حسب معمول عمدہ چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ وہیں ایک طرف ایک بڑی مشین رکھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بڑا انٹری نظام تھا اور یقیناً "میں سے ترلو کا اپنی آواز نشر کرتا ہوگا۔ میں اس مشین کے سامنے بیٹھ گیا اور پھر میں نے اس کے بٹن آزمائے شروع کر دیے۔ مشین میں کئی چرخیاں گھومنے لگیں اور پھر بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

اس کا مطلب تھا کہ یہ ٹرانسمیٹر بھی ہے جو اپنی آواز نشر کرنے کے علاوہ دوسری طرف کی آوازیں سننے کے کام بھی آتا ہے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، میں نے مشین بند کر دی اور پورے غار کا جائزہ لینے لگا۔

بے شمار چیزیں تھیں لیکن سب کی سب الٹی سیدھی۔ میرے لیے بے مقصد اور بے کار۔ البتہ میں نے ایک سیاہ لہلوے کو دلچسپی سے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پہلی پٹی رکھی ہوئی تھی جس میں درمیان میں ایک ہیرا جگمگا رہا تھا۔

مجھے جینگو یاد آگیا اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب بھی آئی۔ میں نے وہ سیاہ لہلوہ پکڑ لیا۔ پہلی پٹی اپنے ماتھے پر باندھی اور پھر اس مشین کے پاس جا بیٹھا۔ پھر دھڑکتے دل سے میں نے مشین کے کچھ بٹن آن کیے اور ترلو کا کی آواز کو ذہن میں رکھ کر اس کے بولنے کے انداز کو پوری طرح قابو میں رکھ کر بولا۔

"ترلو کا کے ہمنو! میری آواز سنو۔ ہمارے درمیان ایک خوشخبری آئی ہے۔ میرا نائب جینگو موت کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن اب اس کی جگہ پر ہو گئی ہے۔ راجہ نواز اصغر میرا نیا جانشین ہے اس کی عزت کرو اور اس کی ہدایات پر عمل کرو۔ خبردار اس کے حکم سے سرتابی نہ کرو۔ وہ میرے مشن کی تکمیل کرے گا۔ میں اسے تمہارے درمیان بھیج رہا ہوں اور اس کے احکامات کی تعمیل تم پر فرض ہے، کیا تم سمجھ رہے ہو؟"

"عظیم ترلو کا مقدس ترلو کا" لاتعداد آوازیں ابھریں اور میں نے بٹن بند کر دیے۔ میرا دل ہلچل اچھل رہا تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، میری ذہانت پر مبنی نہیں تھا۔ ایک غیبی قوت میری قدم قدم پر رہنمائی کر رہی تھی۔

تب میں غار کے دوسرے سوراخ سے اندر داخل ہو گیا۔ اور یہ ایک ذریل سرنگ تھی۔ بے حد طویل لیکن اس کا اختتام بھی ترلو کا کی رہائش گاہ پر ہوا تھا۔ یہاں ترلو کا کے تین چار خلوں موجود تھے اور یہ لوگ بھی غالباً "انہی میں سے تھے جو میری آواز سن چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مودب ہو گئے۔

”راجہ نواز اصغر!“ ان میں سے ایک اٹھ کر آدھا جھک گیا اور میں نے اس کی جانب دیکھا۔ میرا حلیہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا اور ہر صورت کسی کی جرات نہیں تھی کہ مجھ سے ترلوکا کے بارے میں معلوم کرے کیونکہ ترلوکا کے اپنے بھی کچھ مشاغل ہوں گے کہ دوسرے لوگ ان کے بارے میں نہیں جانتے ہوں گے۔

”میں ترلوکا کے عظیم مشن پر جانے کی تیاریاں کرنا چاہتا ہوں۔ متعلقہ لوگوں کو میرے پاس بھیج دو“ میں نے بھاری لہجے میں کہا اور ایک چوڑی کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ ان میں سے دو آدمی باہر نکل گئے تھے۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور اس وقت تک خاموش بیٹھا رہا جب تک کہ تین افراد ان آدمیوں کے ساتھ میرے پاس نہ پہنچ گئے۔

ان میں ایک دراز قد تھا اور باقی دو اس کی نسبت خاصے پست قد تھے۔ دراز قامت شخص میرے سامنے جھکا اور اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا:

”میرا نام لائڈ ہے مسٹر نواز! کیا حکم ہے؟“
”عظیم ترلوکا کے مشن کے لیے ہمیں پہلے یہاں سے نیویارک اور اس کے بعد گرین لینڈ روانہ ہونا ہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ میں فوری طور پر گرین لینڈ روانہ ہو جاؤں۔“

”بہت بہتر۔ تو سب سے پہلے آپ کے نیویارک پہنچانے کا بندوبست کیا جائے“ لائڈ نے سوال کیا۔
”ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تیاریاں فوراً ہو جائیں تاکہ میں اپنے کام میں دیر نہ کروں“ میں نے کہا۔

”بہت بہتر جناب! آپ یہاں آرام کریں گے یا کسی اور رہائش گاہ پر؟“
”نہیں۔ مقدس ترلوکا نے مجھے یہیں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔“
”آپ کے ساتھ کتنے افراد جائیں گے مسٹر نواز؟“

”فی الوقت مجھے صرف آٹھ افراد کی ضرورت ہے، گرین لینڈ میں ہمارے شعبے کام کر رہے ہیں“ میں نے جواب دیا اور لائڈ نے گردن ہلا دی۔ پھر میں نے کہا ”ان آٹھ آدمیوں کا انتخاب کر لیا جائے گا لائڈ۔ تم ان کے لیے فکر مند نہ ہو بلکہ اپنا کام کر کے جلد از جلد مجھے اطلاع دو۔“

”بہت بہتر جناب“ لائڈ نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔
”ہمارے لیے کیا حکم ہے جناب؟“ اندر موجود لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔
”تم ترلوکا کے کسی نئے حکم کا انتظار کرو۔ مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں فی الحال دو سڑوں سے رابطہ قائم نہ کروں۔“

”بہت بہتر“ جواب ملا اور میں اس رہائش گاہ میں تیار رہا۔ وہی عجیب آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ایک خوشگوار مستقبل کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہوائیں میرے ذہن و دل کو معطر کر رہی

تھیں۔
اس کے علاوہ میں آئندہ پروگرام پر بھی غور کر رہا تھا۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ ترلوکا کے اس کارخانے کی نشاندہی ضروری تھی۔

لائڈ نے تیاریاں مکمل ہونے کی اطلاع تقریباً ”تین گھنٹے کے بعد دی تھی۔ ان تین گھنٹوں میں کوئی تامل ذکر واقعہ نہیں پیش آیا تھا۔ بہر حال لائڈ میرے پاس پہنچ گیا اور میں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

”تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں جناب!“
”ہمیں کس طرح سفر کرنا ہے؟“

”یہاں سے کار کے ذریعے بروٹینا جائیں گے۔ بروٹینا کے ہیلی پورٹ کو آمد کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ ہمیں ہیلی کاپٹر تیار ملے گا جو ہمیں الپاسو پہنچا دے گا اور پھر الپاسو سے براہ راست ہوائی سروس سے نیو یارک“

”نیویارک میں قیام کا بندوبست؟“
”بے شمار لوگ ہیں جناب لیکن ہم فورٹ ہل میں قیام کریں گے۔ وہی ہماری سب سے بڑی قیام گاہ ہے۔“

اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔
ساتھ لے جانے والوں میں، میں نے لائڈ کا انتخاب بھی کیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی۔

تین لینڈ رورز ہمیں لے کر بروٹینا چل پڑی تھیں۔ کیلی لاس کے علاقے سے بروٹینا کا سفر تقریباً سات گھنٹے کا تھا۔ اس میں زیادہ تر علاقہ ایسا تھا جو عام گزر گاہ نہیں تھی۔ لیکن میرا کام یہ بھی تھا کہ میں ان علاقوں کی پوری پوری تفصیل ذہن میں رکھوں۔ اسی تفصیل کے تحت مجھے ایک نقشہ ترتیب دینا تھا۔

بہر صورت سات گھنٹے کا یہ طویل سفر خاصا بے آرام کن ثابت ہوا۔ کافی دیر کے بعد ہم کی سڑک پر پہنچ گئے اور اس سڑک کی نشاندہی بھی میں نے اپنے ذہن میں کر لی تھی اور اس کے بعد بروٹینا کا سفر۔

وہ لوگ میری بے حد عزت کر رہے تھے۔ خاص طور سے لائڈ میرا بے حد ممنون تھا کیونکہ وہ ایک طویل عرصے سے کیلی لاس سے نہیں نکلا تھا اور یہاں کے ماحول سے بری طرح بور ہو چکا تھا۔ راستے میں اس نے مجھ سے بے پناہ باتیں کیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے بارے میں کافی کچھ جانتے ہیں۔

”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جناب جنہیں یہ عرفان حاصل ہو جائے۔ آپ ترلوکا کے مخالف کی حیثیت سے یہاں آئے تھے لیکن ترلوکا کی کیا بات ہے، اس کی آنکھوں کی کشش اس کی ایک آواز پہاڑوں کے سینے میں سوراخ کر دیتی ہے اور ان کے دل بھی پانی بن جاتے ہیں۔ انسانیت کا اس سے بڑا ہمدرد روئے زمین پر اور کوئی بھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں تو اس پر اندھا عقیدہ رکھتا ہوں۔ آپ یقین کریں جناب میں

دل انہیں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے آنکھوں پر پتھر رکھ لیے تھے اور انتہائی بے دردی سے انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔

میرا ڈالسنگ جو اب زیب بن چکی تھی، اور مذہبی نقطہ نگاہ سے میری بیوی تھی۔ عام عورتوں سے مختلف نہیں تھی۔ میں اس سے جسمانی رشتہ بھی قائم کر چکا تھا۔ خواہ بیوی کی حیثیت سے سہی لیکن میرے ذہن میں جو مقام اس نے حاصل کیا تھا وہ آج تک کسی عورت نے نہیں کیا تھا۔ لائیڈ کے چلے جانے کے بعد وہ اچانک میرے ذہن میں ابھر آئی۔ وہ نیویارک میں تھی۔ نجانے کس حال میں ہوگی۔ اور نجانے میرے لیے کیا سوچتی ہوگی۔ باقی رہا اس کے ذہن کا مسئلہ تو بے چاری لڑکی میری وجہ سے الجھنوں کا شکار ہوئی تھی یا نہیں لیکن ہر صورت کچھ بھی ہو، میرے دل میں اس کے لیے محبت تھی اور اب جبکہ میں نیویارک میں تھا تو میرا دل اس کے لیے دھڑک رہا تھا۔ میں اسے یاد کر رہا تھا۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جس پر جتنا بھی حیران ہوا جاتا، لیکن میری ذات میں تو بے شمار تبدیلیاں آچکی تھیں۔ میں تو اپنی فطرت ہی بدل چکا تھا اور اس بدلی ہوئی فطرت پر ہر حال مجھے مسرت تھی۔ میں میرا ڈالسنگ کو دل سے چاہنے لگا تھا۔ اور یہ چاہت اس وقت اور زیادہ بڑھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی جبکہ میں میرا ڈالسنگ کے شرم میں تھا۔ میں جلد از جلد اس سے مل لینا چاہتا تھا۔ اپنی فطرت کی یہ تبدیلی خود میرے لیے حیران کن تھی۔

یوں لگتا ہے کہ میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں اور اس نئی زندگی سے مجھے جو مسرت ملی تھی جو خواب ملے تھے، میں بیان نہیں کر سکتا۔

لیکن فی الحال جذباتی ہونا مناسب نہیں تھا۔ ابھی تو بہت سے کام کرنے تھے۔ چنانچہ فرصت ملنے ہی سب سے پہلے میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کھول لی۔ ڈائریکٹری میں مجھے اہم لوگوں کے نمبر تلاش کرنے تھے اور اس کے لیے بھی میں نے ذہانت سے کچھ فیصلے کیے تھے۔ میں اگر چاہتا تو انتظامیہ کے بڑے بڑے لوگوں سے رابطہ قائم کر سکتا تھا لیکن میں نے محکمہ پولیس کے ایک ایسے افسر کا انتخاب کیا جو بہت بڑے عہدے کا مالک نہیں تھا۔ اس کا نام جیم پاؤل تھا۔

”مسٹر پاؤل سے بات کرنا چاہتا ہوں“ ٹیلی فون پر ایک بھاری آواز سن کر میں نے کہا۔

”میں پاؤل ہی بول رہا ہوں۔“

”میرا تعلق ایشیا کے ایک ملک سے ہے مسٹر پاؤل اور میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

”کیا امریکی حکومت میں ایسی چک موجود ہے کہ کوئی شخص غیر قانونی طور پر پہاڑیوں میں اپنی حکومت قائم کرے؟ سائنسی ذرائع سے کام لے کر اسے آراستہ کرے اور ساری دنیا کے لوگوں کو وہاں جمع کر کے منشیات کا علوی بنائے اور اپنی تعلیمات کا پرچار کرے۔“

”ہرگز نہیں جناب۔ قانون امریکہ میں ایسی کوئی چک نہیں۔“

ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہوں لیکن ترلوکا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ہے اور آج بھی اگر میں اپنے عزیزوں سے ملنے کی کوشش کروں تو وہ لوگ مجھے کتے کی طرح دھتکار دیں گے لیکن وہ اس مشن کی عظمت سے ناواقف ہیں“ لائیڈ راستے بھر بکواس کرتا رہا لیکن میں نے اس کی بکواس کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ یہاں تک کہ بروٹینا پہنچ گئے۔

بروٹینا ایک حسین قصبہ تھا۔ جس کی آبادی نمک کی تجارت کرتی تھی۔ سالٹ لیک سے یہاں نمک آتا تھا۔ اور یہاں سے پورے امریکہ میں سپلائی ہوتا تھا۔ ایک مخصوص طور سے حسین مکانات پر مشتمل یہ قصبہ بہت خوبصورت تھا لیکن ہمیں یہاں ذرا سی دیر رکنے کا موقع ملا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا ہیلی کاپٹر آگیا جس سے ہمیں الپاسو تک کا سفر کرنا تھا۔

ہیلی کاپٹر کا سفر بھی قابل ذکر نہیں تھا۔ الپاسو کے ہوائی مستقر سے ایک دو پہل طیارہ ہمیں لے کر نیویارک چل پڑا۔ میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ میرا مشن پورا ہو چکا تھا اور اب۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔ اس سے آگے سوچتے ہوئے دل کی دھڑکن رکتی تھی۔ ساری عمر کی بے چینی سے نجات مل گئی تھی۔

بالآخر خوابوں کا شہر نیویارک آگیا۔ ایئر پورٹ پر ہمارے استقبال کے لیے بے شمار لوگ موجود تھے۔ ہمیں گاڑیوں کے ذریعے فورٹ ہل پہنچایا گیا اور یہی میری قیام گاہ تھی۔ پہاڑیوں کی بلندی پر بنی ہوئی ایک حسین عمارت۔

لائڈ نے قیام کرنے کے چھ گھنٹے بعد مجھ سے پوچھا۔ ”آپ پہلادرس کب دیں گے نواز صاحب؟“ ”میں اس کے لیے تیاریاں کروں گا۔ چند روز تک میری آمد کو خفیہ رکھا جائے۔“ ”جو لوگ آپ کی حیثیت سے واقف ہو چکے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ آپ کو دیکھیں، آپ سے کچھ سنیں۔“

”اس کے لیے انتظار کرنا ہو گا۔“

”تب میں ایک اجازت چاہتا ہوں۔“

”ہاں کہو۔“

”یہاں پر میرے عزیز دوست ہیں۔ اگر اجازت ہو تو دو ایک دن، ان کے ساتھ گزار لوں؟“ ”کوئی حرج نہیں ہے کہ دوسروں کو ہدایت کر دینا کہ جب تک میں ان کو طلب نہ کروں وہ مجھے پریشان نہ کریں۔“

”بہتر ہے۔ میں ہدایت کروں گا“ لائیڈ نے کہا اور پھر وہ چلا گیا۔ میرے ذہن میں زمیں ابھر آئی۔ اپنی سوچ کی اس تبدیلی پر میں خود حیران تھا۔ میں نے ساری زندگی عورتوں کو ایک مخصوص حیثیت دی تھی۔ حالانکہ ایک سے ایک مظلوم عورت میرے سامنے آئی تھی۔ ایسے ایسے واقعات سے پر کہ کوئی بھی صاحب

”کیا امریکی حکام بد اعمالیوں کا شکار ہیں؟“ کیا وہ کسی ایسے شخص کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟“

”براہ کرم آپ وضاحت کریں آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“

”ایک ایسا شخص کیلی لاس کی پہاڑیوں میں اپنی جنت قائم کیے ہوئے ہے۔ بے شمار لوگ اس کے زیر اثر ہیں۔ وہ پینٹاسٹ ہے۔ اور لوگوں کے ذہنوں پر قابو پا کر ان کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نے زیر زمین عمارتوں میں ایسی ایسی چیزیں بنا رکھی ہیں جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مسٹر پاول میں نہیں جانتا کہ امریکی حکام کی نگاہ میں اس شخصیت کی کیا حیثیت ہے۔ لیکن بہر حال اگر قانون میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے تو کوئی بھی شخص ہوا سے کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”یقیناً“ یقیناً“ پاول نے جواب دیا۔

”تو میں ایک ایسے ہی شخص کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس کے ہر کارے تقریباً“ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ حکومت امریکہ منشیات کو تباہ کرنے میں کروڑوں ڈالر خرچ کرتی ہے لیکن اگر اس کا منفع خود اس کے ملک میں ہو تو کیا وہ اسے ختم کرنا پسند نہیں کرے گا؟“

”بلاشبہ“ بلاشبہ“ پاول کی آواز لرز رہی تھی۔

”مسٹر پاول! کیا آپ نے ترلو کا نام کسی شخص کا نام سنا ہے؟“

”اوہ۔۔۔۔۔ ہاں! ہری کرشنا تحریک کا بانی ترلو کا۔۔۔۔۔“ پاول نے سوال کیا۔

”ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ کیلی لاس کی پہاڑیوں میں تو وہی شخص ہے اور اس نے چند آوارہ گردوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے بلاشبہ یہاں منشیات استعمال کی جاتی ہیں لیکن کئی بار یہاں چھاپے مار کر منشیات برآمد بھی کی گئی ہیں لیکن آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ تعجب خیز ہے۔ ہم آوارہ گردوں کو جیل میں بھر دیتے ہیں۔ وہ بے ضرر نشہ باز ہوتے ہیں اس کے علاوہ ان کا کوئی جرم نہیں ہوتا۔“

”کیا آپ یہ سب ختم کرنے کے خواہش مند ہیں؟“

”اگر اتنے بڑے پیمانے پر وہاں کوئی کوشش کی جا رہی ہے تو میرا خیال ہے امریکی حکام اس طرف توجہ دینا پسند کریں گے۔“

”کیا آپ کے وسائل ان اختیارات کو حاصل کر سکتے ہیں؟“

”ٹھوس بنیادوں پر اطلاعات فراہم کی جائیں تو ایک کانٹیل بھی اس سلسلہ میں پورے پورے

اختیار رکھتا ہے۔“

”تو پھر آپ کوشش کریں۔“

”آپ مجھے شادی مرگ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں مسٹر! میری آپ سے کیا دشمنی ہے؟“

”فورٹ ہل نامی عمارت میں چند افراد موجود ہیں۔ آپ اپنے اختیارات سے کام لے کر ان سب

رہنما کر لیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں، میں آپ کو سارے نقشے فراہم کر دوں گا۔ اور کیلی لاس تک آپ کی رہنمائی کروں گا۔“

”آپ کا نام کیا ہے جناب؟“

”راجہ نواز اصغر!“

”براہ کرم ایک بار پھر بتادیں۔ یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے؟“

”کوشش کر لیں۔ میرا خیال ہے آپ کو اس عمارت پر چھاپے مارنے کے بعد ہی پتہ چل جائے گا۔“

”تو آج رات کو نوبت ہے“ پاول نے کہا۔

”میں انتظار کروں گا“ میں نے فون بند کر دیا۔

”اور ٹھیک نوبت رات پولیس نے عمارت پر ریڈ کیا۔ پاول ایک پر رعب افسر تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ ہونق ہو رہا تھا۔ اس نے عمارت میں موجود تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا اور ایک ایک سے پوچھتا پھر تھا کہ کیا وہ نواز اصغر ہے؟“

”میری شکل دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔“ تم ایشیائی باشندے ہو؟“ اس نے کہا۔

”ہاں میرا نام ہی نواز اصغر ہے“ میں نے جواب دیا۔ پاول کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اس

عمارت میں موجود تمام لوگوں کو گرفتار کر کے قیدیوں کی گاڑی میں سوار کر لیا اور مجھے اپنے ساتھ پولیس کی گاڑی میں لے کر چل پڑا۔

”خدا کے واسطے مجھے اب بھی بتا دو یہ کوئی مذاق تو نہیں ہے۔“

”نہیں مسٹر پاول اگر یہ مذاق ہوتا تو میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش نہ کرتا۔“

”تب تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا اور تمہارے پاس اس سلسلہ میں کیا ثبوت ہے؟“

”میں آپ کو پوری تفصیل بتا دوں گا۔ لیکن چند شرائط پر!“

”کیا شرائط ہیں؟“

”میں خود اس گروہ کے جال میں پھنس جانے والا ایک شخص ہوں۔ بے وطن ہوں اور امریکہ کی

حکومت کا طالب ہوں۔ یہاں میری بیوی بھی ہے۔ میں اپنے اور اس کے لیے یہاں کی شہریت چاہتا ہوں۔“

”اگر تمہاری اطلاعات درست ہوں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں امریکہ کی شہریت دلا دوں گا۔“

”میں سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا تھا اور پھر اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر رات کو بجے تک ہم کافی پیتے رہے۔ اور میں اسے تفصیلات بتاتا رہا۔ پاول کی حالت قاتل دید تھی۔“

اور اس کی یہ کیفیت طویل عرصہ تک رہی۔ یہاں تک کہ ایک بڑی پولیس فورس جدید ترین اسلحے

سے لیس ہو کر کیلی لاس چل پڑی۔ میں ان کی رہنمائی کر رہا تھا اور وہ سب کچھ یہاں دستیاب ہو گیا جس کی

نشاندہی کی تھی سوائے ترلو کا کے اور وہ ملتا بھی کہاں؟

امریکہ کے اخبارات کے لیے ایک ہفتے تک سنسنی خیز سرخیاں مہیا ہو گئی تھیں۔ اور بلاشبہ مجھے مقامی حکام کی پوری توجہ حاصل ہو گئی تھی۔ تزلو کا کی تلاش ملک بھر کے چپے چپے میں ہو رہی تھی اور اس کے پیروؤں کو قید کر لیا گیا تھا۔ بہر حال یہ پولیس کا کام تھا۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا اور میں سرکاری مہمان تھا۔ پاؤل میرا بہترین دوست میرا ممنون تھا اسے جو شہرت اور ترقی ملی تھی وہ اسے میرے طفیل سمجھتا تھا۔ چنانچہ مجھے امریکی شہریت دلانے اور زمینی کو تلاش کرنے میں اس کی بھرپور کوشش شامل تھی۔

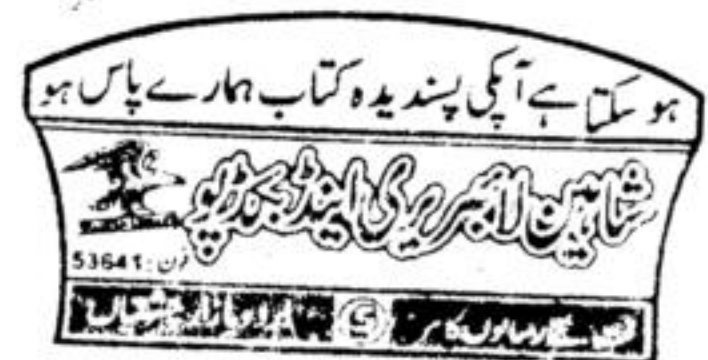
لیکن ہم امریکی حکومت کے لیے بوجھ نہ بنے۔ میری محبوب شوہر پرست بیوی زمینی نے زندگی کو ایک مخصوص مقام تک لانے کے لیے بے شمار منصوبے پیش کیے۔ اس نے ایک اسٹورز میں پانچ سال تک ملازمت کی۔ میں نے بھی دن رات ایک کر دیے اور میری ان کوششوں میں پاؤل میرا مددگار تھا۔ اس نے حکومت سے مجھے انعام دلوانے کی سفارش کی لیکن میں نے وہ انعام قبول نہیں کیا۔ البتہ نیویارک کے ایک چھوٹے سے علاقے میں ہم نے اس کی طرف سے ایک فلیٹ قبول کر لیا تھا اور پھر تقدیر نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہم نے پس انداز کی ہوئی رقم سے قالینوں کی چھوٹی سی تجارت شروع کر دی اور تجارت چل پڑی اور اب خدا کے فضل سے نیویارک کی اہم مارکیٹ میں ہماری فرم زمینی کارپٹ کے نام سے خوب چل پڑی ہے۔ ہمارا اپنا خوبصورت مکان ہے اور ہم سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میری اس کہانی کے چھپنے کے تقریباً ایک سال بعد کی بات ہے کہ ایک شام مجھے ایک ایسی خوشخبری ملی جو بیان سے باہر ہے۔ میری یہ مسرت سردار علی تھا جو اپنی بیوی اپنی سردار کے ساتھ میرے گھر پہنچ گیا اور مجھ سے لپٹ کر اس قدر رویا کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس نے شکایات کے دفتر کھول دیے اور میں نے بھی اسے خوب پیار کیا۔ سردار علی بفضل تعالیٰ ڈچ نیشنلٹی رکھتا ہے۔ ہاؤس آف ٹوائے کا کام اسی دن بند کر دیا گیا تھا جس دن اسے میرا خط ملا اور پھر وہ سالہا سال میری تلاش میں بھٹکتا پھرا۔ پھر اس نے ہاؤس آف ٹوائے کو کوچ بچ کھلونے بنانے والی ایک فرم بنا لیا۔ صرف اس امید پر کہ اگر میں کبھی واپس آؤں تو اسے تلاش کرنے میں وقت نہ ہو۔ وہ ہالینڈ کا ایک بڑا آدمی ہے اور اب سال میں ایک ماہ کے لیے اپنے بیوی اور بچوں سمیت میرے پاس آتا ہے۔ اپنی اس کی زندگی میں کیسے آئی یہ الگ داستان ہے۔ جسے اگر سردار علی ہی آپ کو سنائے تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔

زمینی اکثر ضد کرتی ہے کہ میں اسے پاکستان لے چلوں لیکن میں سوچ کر رہ جاتا ہوں کہ اپنے مقدس وطن جانے کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔

آپ کا

راجہ نواز اصغر



ایک ہیبت ناک پُر تجسس ناول
ایک نوجوان کی زندگی کا فسانہ عبرت ہے جس نے
اپنے بیگناہ والدین کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔
شمیم نوید کے ماجرہ پرور قلم سے

دھواں

ایک جلد میں مکمل
قیمت ۱۰۰ روپے

ایک مظلوم دو شیزہ کے سچے جذباتوں کی روداد
اُسے زندہ جلایا جانے والا تھا

دیکھ

قیمت ۱۰۰ روپے
ایک جلد میں مکمل

ماضی کے طلسم کدے سے حیرت انگیز تاریخی داستان
ایک اجہ کی پلنگ داسی کی کہتا جو
اس کی بیوی کے حمیز میں آئی تھی

فیصل خون

ایک جلد میں مکمل
قیمت ۱۰۰ روپے

ایک شمیم نوید کے قلم سے
عشرت کدہ

ایک جلد میں مکمل
قیمت ۱۰۰ روپے

یعقوب جمیل کے ہوش قلم سے

مشہور قلم کاروں کے ڈائجسٹوں میں چلنے والے دلچسپ سلسلے

کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں

ابوالہول دو حصے	شمیم نوید قیمت فی حصہ ۵۴ روپے	ایم اے راحت قیمت ۱۲۵ روپے	سویا ہوں سال مکمل
طارنوش دو حصے	شمیم نوید قیمت فی حصہ ۴۴ روپے	حاجی عدیل قیمت ۱۵۰ روپے	سانپ مکمل
پاکٹ مار دو حصے	ایم ایس قیمت فی حصہ ۱۵ روپے	شمیم نوید قیمت فی حصہ ۱۵۰ روپے	ہمزاد کی ولہی دو حصے

ڈاک خرچ فی حصہ ۲۴ روپے

اپنے قریبی بک شاپ یا کمرے طلب نامیں یا براہ راست ہم سے منگو اور اس پر پورے سال کریس

گن قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

۱۱ عمر روڈ اسلام پورہ - لاہور
فون: ۲۲۸۵۹۹-۲۲۸۹۶۲

خدا کی زمین پر رہنے والے ایک پراسرار شخص کی حقی کہانی اس کا کہنا تھا کہ وہ حضرت آدم سے نہیں سانپ کی اولاد میں سے ہے

رازدار ڈائجسٹ کا ”پراسرار“ سلسلہ پہلی بار کتابی شکل میں

سانپ

تحریر: حاجی عدیل

قیمت: 150/- روپے ڈاک خرچ 24/- روپے

- ☆ ایک ایسے پراسرار شخص کی سرگزشت جو ہزاروں سالوں پر محیط تاریخ کا چشم دید گواہ تھا۔
- ☆ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کن عجیب و غریب قوتوں کا مالک ہے۔
- ☆ اس کی زبان اچانک ہزاروں سال پرانے راز اگلنے لگتی تھی۔
- ☆ اسے دیوار کے پار اور زمین کے اندر دور تک دیکھنا آتا تھا۔
- ☆ ایک ایسا سانپ جس کی اجداد نے کئی سو برس پہلے چاندنی رات میں اپنی جون بدل لی تھی۔
- ☆ مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ اس شخص سے مل چکا ہے لیکن خوف فساد خلق سے اس سرگزشت میں کرداروں اور مقامات کے نام بدل دیئے گئے ہیں۔
- ☆ ایک جلد میں مکمل یہ خوفناک سلسلہ ناول کی صورت میں شائع ہو گیا ہے وہ خاص الخاص کہانی جس سے ایک وقت اتفاق و اختلاف کیا جاسکتا ہے

کتاب کی قیمت 150/- روپے ڈاک خرچ 24/- روپے

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

۱۔ عمر روڈ اسلام پورہ لاہور 7229762 7248599

ملنے کا پتہ



بعض لوگ جنوں بھوتوں اور ارواح خبیثہ کے علاوہ جادو اور سفلی عمل کے بھی قائل نہیں ہوتے لیکن قرآن مجید نے جنات کے وجود کی گواہی دی ہے۔

جناتی کہانی

گل قریش پبلی کیشنز کا نیا حیرت انگیز سلسلہ

- ☆ ایسے ہی حیرت انگیز اور مافوق الفطرت واقعات پر مشتمل ہے
- ☆ اگر آپ کو کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو یا آپ نے کسی سے سنا ہو تو لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ہم اسے نوک پلک سے سنوار کر گل قریش پبلی کیشنز کی جانب سے کتابی صورت میں کتاب کے صفحات کی زینت بنائیں گے۔ آج ہی ہم سے رابطہ کریں۔

خط و کتابت کا پتہ

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری

۱۔ عمر روڈ اسلام پورہ لاہور 7229762 7248599

ملنے کا پتہ

